رجسٹرڈ نمبر — ہو المستعان — اے ۴۶۸

الناظر

206

ایڈیٹر ـــــ ظفر الملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ [illegible]

قیمت فی پرچہ ۸ر

بسم اللہ

فہرست مضامین ماہ جنوری ۱۹۲۷ء

جلد ۳۲ — نمبر ۱

شکریہ ایک عزیز نے بڑا گاؤں ضلع بارہ بنکی سے پانچ روپے بھیج دیئے اور مسٹر ابراہیم گورا باوا نے رنگون سے ۲۷ء کے کل پرچے ارسال فرمادیئے جسکے لیے میں نہایت درجہ ممنون ہوں۔

فی الحال اس قرض سے کام نکل جائیگا مگر دفتر میں رکھنے کے لیے بھی ایک جلد درکار ہے ۔ کوئی صاحب جولائی تا دسمبر ۲۷ء کی پوری جلد علیحدہ کرنا چاہیں یا متفرق مہینوں کے پرچے بقیمت دیسکیں تو بڑی عنایت ہوگی ۔ ایڈیٹر

نئی کتابیں

نیکی کا پھل

(مولانا شرر مرحوم کا آخری فسانہ)

جو انکی زندگی ہی میں چھپ گیا تھا۔ صرف سرورق کی طباعت باقی تھی، جسکی تکمیل بعد کو ہوئی۔ قیمت عہ

خمخانۂ جاوید جلد چہارم ۔ لالہ سری رام دہلوی کے مشہور تذکرۃ الشعرا کی تین جلدیں پہلے شائع ہوکر مقبول عام ہوچکی ہیں۔ تیسری جلد میں حرف "ز" تک کے شعرا کا تذکرہ تھا، اب چوتھی جلد شائع ہوئی ہے جسمیں "س" "ش" "ع" کے شعرا کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ حجم تقریباً ۴۰ جزو، تقطیع کلاں، طباعت دیدہ زیب۔ قیمت فی جلد مجلد صہ

نور اللغات جلد دوم ۔ نور اللغات کی پہلی جلد صرف "ب" پر ختم ہوئی تھی، دوسری جلد میں "پ" سے "خ" تک کے الفاظ ہیں۔ اردو کے اس جامع لغت کی خوبی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انجمن اردو لکھنؤ کی ادبی نمائش نے ۲۴ء کی مطبوعات جدیدہ میں اسکو بہترین قرار دیکر طلائی تمغہ دیا اور گورنمنٹ صوبہ متحدہ نے تین سال کے لیے دو ہزار سالانہ کی امداد منظور کی۔ قیمت جلد اول عـہ، جلد دوم سے

غذائے روح

ہندوؤں کی مشہور مذہبی کتاب بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ از پنڈت رگھو دیال صاحب عاشق لکھنوی مترجم سگیدوت وغیرہ۔ کتاب کے حسن ظاہری کو عکسی تصویروں نے دوبالا کردیا ہے۔ عہ

ادب العرب حصہ اول یعنی عرب کی تاریخ ادب۔ جس میں عرب کے مختصر جغرافیہ اور سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ ابتدا سے لیکر عہد بنی امیہ تک عربوں کے ذہنی ادبی اور علمی کارناموں کے ارتقائی حالات اور انکی خصوصیات و اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ مرتبہ مولوی زبید احمد ایم اے معلم عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی۔ قیمت ے

الدر المنظم فی مناقب غوث الاعظم (جلد دوم) اسکی پہلی جلد کا اعلان فروری سنہ ۲۴ کے انتخاب میں کیا گیا تھا۔ دوسری جلد میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مفصل حالات زندگی ولادت سے وفات تک۔ آپ کے بعض اساتذہ و تلامذہ، آپ کا طریقۂ تعلیم، آپ کی کرامات، آپ کی ازدواج و اولاد، آپ کے خلفا کے حالات اور بہت سے دوسرے امور درج ہیں۔ حجم ۶۰۶ صفحے تقطیع کلاں۔ قیمت للعہ

نفسیات ترغیب ۔ عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن کے لائق پروفیسر سید وہاج الدین احمد کستوری نے علم النفس کے ایک اہم شعبہ پر یہ قابل قدر کتاب لکھی ہے جسمیں عمل ترغیب کی ماہیت، جذبات و عقل کا اس سے تعلق، ترغیب کیونکر ہوتی ہے، موانع ترغیب، ترغیب کے صحیح مواقع استعمال، غلط رجحانات و باطل ترغیبات سے تحفظ کی تدابیر وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ اردو زبان میں اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ شروع میں مولوی عبد الماجد صاحب کا دیباچہ ہے۔ قیمت عـلـہ

[illegible] مکتبہ [illegible] سے طلب کیجیے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۱ جلد ۳۲ جنوری سنہ ۱۹۲۷ء

اُردو اور لکھنؤ

جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی جنوری میں دو ہفتے کے لیے لکھنؤ تشریف لائے تھے اور اس دوران میں یہاں اُنکے متعدد لکچر انگریزی اور اُردو میں ہوے۔ منجملہ اُنکے جو لکچر انجمن اُردو کے اہتمام سے ریڈ ہال کرسچین کالج میں ۱۰- جنوری سنہ ۲۷ء کو زیر صدارت جناب سید وزیر حسن جج چیفکورٹ پڑھا گیا اُسے اہل ملک سے روشناس کرانے کی عزت ناظر کو حاصل ہوتی ہے۔

کیفی صاحب کے خیالات سے خواہ کلیۃً اتفاق نہ کیا جا سکے مگر جو مشورے اہل ملک کو اُنھوں نے دیئے ہیں وہ اس قابل ضرور ہیں کہ اُن پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے۔ خصوصاً قومی اخبارات کے کارکنوں کو جن خرابیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے امید ہے کہ وہ اُنکے انسداد کی سعی کرینگے۔

ایڈیٹر

چونکہ انسان بالطبع متمدن ہے اسکی معاشرت کے ہر شعبہ کی ترقی اور تبدیلی کے سلسلہ میں تمام نتائج و عواقب کو زیر نظر رکھنا ہر مصلح اور دُور اندیش فرد کا فرض ہے۔ جس طرح ہماری ضروریات روزمرہ آپس میں ایک دوسرے سے وابستگی رکھتی ہیں اسی طرح اخلاقیات اور حسیات معاشرت

کے مختلف شعبوں سے تاثر و تاثیر میں ملتفت ہیں۔

آج کا موضوع ہے اُردو اور لکھنؤ۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ موضوع دو حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں اُردو سے متعلق چند امور آپ کے غور و فکر کے لیے پیش کیے جائیں گے۔ اس مسئلہ پر پہلے لاہور کے ایک لکچر میں شرح و بسط کے ساتھ بحث ہو چکی ہے کہ زبان محض اظہارِ خیال کا آلہ ہی نہیں بلکہ ذہن کی تربیت اور خیال کی تدوین و تنظیم کا آلہ بھی ہے۔ کہی ہوئی باتوں کے دوہرانے میں کچھ مزا نہیں۔ یہاں یہ کہنا ہے کہ مہذب انسان کا کوئی فعل ایسا نہیں ہوتا جس کی ذمہ داری صرف اسی کی ذات تک محدود ہو اور جس کی اہمیت من حیث الجماعت کچھ نہ ہو۔ اِن حقائق کو جو علوم متعارفہ کا علم رکھتے ہیں جب ہم زبان اور ادب سے متعلق دیکھینگے تو ثابت ہوگا کہ زبان کی ترقی اور صلاحیت کے بارے میں ہماری ذمہ داری معشرت کے کسی اور شعبہ سے کم حزم و احتیاط اور سرگرمی کی مستحق نہیں۔

زبان اور ادب کا اثر معشرت اور اخلاق پر مسلّم ہے۔ علمِ نفسیات کے عالموں نے ثابت کیا ہے کہ جب کوئی شخص قوتِ حافظہ یا واہمہ کو عمل میں لا رہا ہو تو اُوس کے شعور کی کلّی حالت اگرچہ اوس حالت سے مختلف ہوتی ہے جب کہ وہ کسی خارجی شے کا مشاہدہ کر رہا ہو یا اوس چیز کی طرف متوجّہ ہو جو اسی کے نفسِ ناطقہ میں گزر رہی ہو لیکن خیالات اگرچہ وجودِ واقعی نہیں رکھتے اور نفس کے درمیان باہم مختلط نہیں ہوتے مگر احساسات کے بہت سے نقوش کے صُوَرِ ذہنیہ جو اصل میں علٰحدہ تھے جب یاد کیے جاتے ہیں یا دائرۂ وہم میں لائے جاتے ہیں تو ایک مجرّد حالتِ شعور کے ایسے حصّے معلوم ہوتے ہیں جو علٰحدہ نہیں ہو سکتے۔ یا اگر قطعی طور سے ناقابلِ علٰحدگی نہ ہوں تو بھی وہ تلازم یعنی ایک دوسرے کے بعد فی الفور واقع ہونے کا میلان رکھتے ہیں اور اس طرح وہ شعور کی تمام ماہیت کو اپنے رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوتِ متخیلہ و واہمہ کے صُوَرِ احساسات کے صُوَر پر اپنا رنگ جما کر عملیات اور اخلاق کی پرداز پیدا کرتے ہیں اور صورِ ذہنیہ میں یہاں تک منتقل ہو جاتے ہیں کہ دونوں میں تمیز نہیں ہو سکتی۔

اس بحث سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ متمدن جماعتوں میں یہ ہوتا ہے کہ مصنّف اور شاعر کا متخیلہ اور واہمہ احول یا عوارض کے تاثّرات سے عکس پذیر ہوتا ہے۔ یہ تاثرات اول افراد کے ذہن میں جداگانہ اپنا رنگ جماتے ہیں اور پھر تمام جماعت کو اسی رنگ میں

رنگ دیتے ہیں - چونکہ کائناتِ عالم میں ہر شے ایک بازگشتی خواص رکھتی ہے اس لیے وہ رنگ جو ایک خاص ماحول سے پرتوگیر اور نشو و نما پذیر ہوا تھا ایسا ماحول پیدا کرتا رہتا ہے کہ ذہنیت اور نفس ناطقہ پر مسلط ہو جاتا ہے - صاف الفاظ میں یوں کہیے کہ ایک جماعت کے شعرا اور مصنف جب اپنے کلام کو ابتذال - رکاکت اور سخافت سے آلودہ کریں تو سمجھنا چاہیے کہ من حیث الجماعت اُن کا نشو و نما اور تربیت اوس ماحول میں ہوئے ہیں جہاں اخلاق اور معشرت تہذیب کے نہایت ادنے طبقوں میں پائمال تھے - اس لیے وہ معذور ہیں اور اون کا فعل چشم پوشی کا مستحق + لیکن چونکہ وہ صورِ ذہنیہ جو مختلف حواس کے ذریعہ پیدا ہوتے ہوں انسان کے شعور اور نفس ناطقہ پر شدید اثر ڈالتے ہیں اس وجہ سے اون شعرا اور مصنفین کے کلام کے طرز - اسلوب اور اندازِ بیاں میں اصلاح تجویز کی جاتی ہے + نفسیات کی روسے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ غلط نگاری عریاں نویسی اور فاحش معاملہ بندی کے اکثر سنتے رہنے سے اور کلام میں اون کی مزاولت سے انسان کی قوتِ متخیلہ اور اوس سے اخلاق متاثر ہوتے ہیں اور وہ شاعر او مصنف تعریض میں کہوں گا تعذیر کے مستوجب ہیں جو افہام و تفہیم کے باوجود بھی اصلاح پذیر نہ ہوں + یہ کہنا تو معمولی بات ہے کہ پُرانی چال کا اچھا غزل گو اُس بے تکلفی اور کیف پاشی سے داخلی موضوع پر دلچسپ نظم نہیں لکھ سکتا جیسے کہ وہ غزل کہتا ہے - اسی طرح ایک نئے طرز میں کہنے والا عاشقانہ غزل لکھنے میں قاصر ہے + وجہ یہ کہ ذہن کی تربیت مزاولت شغل سے پختگی پا گئی اور عادت فطرتِ ثانی بنکر ذہنیت کی مالک بن بیٹھی + مختصر یہ صورِ ذہنیہ جو مختلف حواس کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں انسان کے نفس ناطقہ اور شعور پر شدید اثر ڈالتے ہیں - ان تاثرات کی تمثیل میں اُردو کے دو بڑے اساتذہ کے نام لینے پڑینگے تاکہ اُن تاثرات کی اہمیت اچھی طرح ذہن نشیں ہو جائے + ہماری شاعری کی تاریخ میں یہ دونوں نہایت معزز ناموں میں ہیں - میرا مطلب ہے شیخ قلندر بخش جرأت اور خواجہ حیدر علی آتش سے + جرأت کا نشو و نما جس آب و ہوا میں ہوا اسکا ذکر تذکرہ خاص کر انھیں کے ہموطن کی تصنیف آبِ حیات سے معلوم کیجئے - جو صورِ ذہنیہ وہاں پیدا ہوئے تھے اون کی شاعری میں ارتقا پذیر ہوئے - معاملہ بندی کے نام سے گولر کے شکم کا وہ عمل جراحی کیا گیا کہ ثقاہت اور اخلاقی وجاہت منہ پھیر کر مشاعرہ سے رخصت ہو گئیں - جرأت مرحوم جیسے کچھ بھی تھے کاش شعر نہ کہتے - نتیجہ یہ ہوا کہ اس عریاں نویسی نے معاصرین اور متعاقبین کے شعور کو اُسی ادبی و اخلاقی سمیت سے متاثر کر دیا - جسکا تواریخی ثبوت سید انشا - منشی جوہر اور

مرزا داغ کے کلام کا بڑا حصہ ہے - عریاں نویسی اور خارجی سقائم کے جراثیم جو جرأت مرحوم کے نفس نفیس سے پیدا ہوئے تھے اِن بزرگوں کے شعور اور نفس ناطقہ میں حلول کر گئے اور اب ایک نئے رنگ روپ میں باصرہ آزمائی کر رہے ہیں +

اگر شیخ موصوف کے صورِ ذہنیہ در باتوں اور انفار کی صحبت میں نمو پذیر ہوئے تھے تو خواجہ موصوف کے صورِ ذہنیہ بانکوں ملنگوں اور مبنواؤں کی صحبت میں نمو پذیر ہوئے - نتیجہ یہ ہوا کہ ابتذال اور تفحش کے احساس سے اون کا نفس ناطقہ معصوم ہو گیا اور وہ جہاں بہت سے ایسے شعر کہتے ہیں جو اُردو نظم کے انمول رتن ہیں ایسے شعر بھی کہہ جاتے ہیں جو واسوخت امانت کے بعض بندوں کی طرح ایک مجمع میں نہیں پڑھے جا سکتے - صورِ ذہنیہ نے شعور کو اس بارے میں قطعاً بطی الحس بنا دیا اور سخافت و ظرافت - تفحش و تمسخر میں امتیاز زایل ہو گیا - پھر ان لوگوں نے وہ ماحول پیدا کیا جس کے ذکر سے تذکرے بھرے پڑے ہیں +

چونکہ کلام کا اثر براہِ راست اخلاق اور شعار پر ہوتا ہے ہمارے قدیم علما اسکی طرف سے کبھی غافل نہ ہوئے - مُلّا جلال الدین دوانی نے فرمایا :-

"والفاظ غریبہ وکنایاتِ بعیدہ استعمال نہ کند واز فحش وشتم احتراز نماید - و اگر احتیاج بہ تعبیر از امرے فاحش افتد بہ تعریض وکنایت اکتفا کند" ؎۱

جب گفتگو کی نسبت یہ ہدایت اور تاکید ہے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ شاعرانہ کلام سے متعلق اس ہدایت اور تاکید کی اہمیت کس قدر شدید اور اکید ہونی چاہیے - کیونکہ شاعر اور مصنف کا کلام عامّہ خلائق کے کانوں تک پہونچتا ہے اور بیشمار ذہنوں میں اُتر جاتا ہے + انھیں امور پر نظر رکھکر ادیبوں اور عالموں نے قواعد و ضوابط مُدوّن کیے - زبان کی تنظیم کی - انشا کے اصول اور ضابطے قرار دیے تاکہ ادھر تو زبان نہ بگڑنے پائے اور اُدھر خراب کلام قوم کی ذہنیت اور اخلاق کی تخریب نہ کر سکے + نفسیات کے اس نظریہ کو ثقات نے عمل کا جامہ پہنایا تھا شدید جذبات سے معمول ہونے کے موقع پر بھی اُن کی زبان سے کثیف کیا سخت الفاظ بھی نہ نکلنے پاتے تھے جب کسی کی بدترین سلوک کی شکایت ہوتی تو کہتے :-

"دیکھیے اُنھوں نے ہمارے ساتھ کیا مہربانی کی - اُنسے ایسی توقع ہرگز نہ تھی کہ وقت پر یوں آنکھیں بدل لیں گے" +

نہایت نافہم کو خوش فہم - نہایت بدنصیب کو بختاور - زانی کو عیاش کہا کرتے تھے - جب دیکھا

؎۱ اخلاق جلالی لامع دوم لمعہ چہارم

کہ اہلخانہ کے بھائی کے لیے رشتہ کا جو معروف نام ہے اُسے فاحش حیثیت حاصل ہوگئی ہے تو وہ اسکی جگہ برادرِ نسبتی کہنے لگے۔ قس علیٰ ہذا۔ لیکن نہایت افسوس کے ساتھ دیکھنے میں آتا ہے کہ آجکل اُن قاعدوں اور ضابطوں کو ردی کی ٹوکری میں جگہ دی جاتی ہے۔ ذمہ داری کا احساس عموماً مفقود ہے۔ جو جس کے جی میں آتا ہے لکھ دیتا ہے۔ جو جسکے منہ پر آتا ہے کہہ ڈالتا ہے۔ میعادی لٹریچر جسے آپ نئی اُردو میں مُوقّت الشیوع جرائد و مجلات کہتے ہیں اس بدعنوانی اور بے اعتدالی کے گویا گرمو فون ہیں جو گھر گھر اس بدزبانی اور بداخلاقی کے گنشت کا ین کے ناشر ہیں + اس موقع پر میں زبان کی صرف اُس ادبی تخریب پر نظر ڈالونگا جس کی نظیریں ہم کو ہر کہیں نظر آتی ہیں۔ یہ بیان قدرے تفصیل طلب ہے۔ اسکے ساتھ ہی چند اور سقائم و ذمائم کا بھی ذکر کرونگا جو ہماری زبان اور ادب کے چہرے پر بدنما داغ بنتے جاتے ہیں۔

بلند آہنگی اور غریب نگاری آجکل عام پسند چیزیں ہیں۔ لوگ انکا مفہوم غلط سمجھے ہوے ہیں جس سے طرح طرح کے سقم کلام میں پیدا ہو جاتے ہیں اور بے شمار سبک۔ مبتذل الفاظ اور ترکیبیں زبان کے مالک بن بیٹھے ہیں + بلند آہنگی کو بلاغت اور غریب نگاری کو معنی آفرینی کا مرادف ٹھہرانا التباسِ عمدؔ کی حد سے بڑھکر ہے۔ ابتذال ذہن پر حاوی ہو جاتا ہے تو عریاں نویسی کا مولد ہوتا ہے۔ اگر غور سے کام لیا جائے تو عریاں نویسی ذم کے پہلو سے زیادہ قبیح عیب ثابت ہوگی کیونکہ اسکی مزاولت اور مطالعہ کا اثر براہ راست عامل اور معمول یعنی انشا پرداز اور قاری دونوں پر برابر پڑتا ہے۔ اسکی مزاولت تمیز کو اسقدر مغلوب کر لیتی ہے کہ انسان اُسکی اثر پذیری سے مجبور ہو جاتا ہے اور ذہن ایک غیر ارادی یا اضطراری حالت میں مبتلا ہو جاتا ہے جو اختلال دماغی کے درجہ تک پہونچ جاتی ہے + یہ عیب اُن جماعتوں میں اکثر و بیشتر پایا جاتا ہے جن میں مرد و عورت کی زندگی جدا جدا بسر ہوتی ہے اور چونکہ ہم سب ہندو ہوں یا مسلمان، پردہ کی رسم کے خواہ کسی قدر پابند ہوں یا نہ ہوں ہمارے ہاں سوشل میل جول کے اعتبار سے مرد اور عورت الگ الگ رہتے ہیں اسلیے ناگزیر تھا کہ صنفِ ذکور خلیع العذار ہو جائے۔ ہمارا مزاج اور مطائبات کیا، شعر و سخن اور گفتگو کا مذاق بہت پست اور سوفیانہ ہوگیا۔ معصوم تفنن اور مضحکات سے ہم بالطبع ناآشنا ہو گئے جب تک ہماری تحریر و تقریر ہماری صنفِ لطیف تک نہیں پہونچتی تھی اُسوقت

تک یہ عیب معہ اپنے اخلاقی نتایج و عواقب کے ہماری ذات خاص تک محدود تھا لیکن چونکہ اب اُن میں تعلیم پھیلتی جاتی ہے قلم اُٹھانے سے پیشتر ہمیں کم سے کم یہ ضرور سوچ لینا چاہیے کہ اس غزل یا مضمون کو پڑھ کر ہماری ماں اور بہن، بہو اور بیٹی کے ذہن میں کیا احساسات پیدا ہوں گے + یہ مضمون بہت نازک ہے اس لیے میں زیادہ نہیں کہوں گا اور نیز اس وجہ سے کہ پہلے بہت کچھ کہہ اور لکھ چکا ہوں +

ایک اور نقص جو ہماری انشا سے خصوصی وابستگی رکھتا ہے غرابت ہے۔ غرابت کی تعریف علم معانی میں یہ آئی ہے کہ کلمۂ غیر مانوس الاستعمال کلام میں واقع ہو۔ یہاں استعمال سے ہند کے زبان دانوں کا استعمال مراد ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ نظم ہو یا نثر جدت آفرینی اور نو آئینی کے ساتھ زبان بھی نیا جامہ پہنتی ہے۔ علم الالسنہ کے علما اسے بمنزلۂ بدیہی حقیقت کے قرار دیتے ہیں کہ نئے خیالات کے ساتھ نئے نئے الفاظ اور نئی نئی ترکیبیں لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن اسکے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ایک خیال کے لیے ایک لغت کے موجود ہوتے ہوئے ہم اُسے چھوڑ کر ایک نیا اور نامانوس الاستعمال لفظ یا ترکیب استعمال کریں + اُردو میں غرابت پسندی کی ابتدا اُن اصحاب کی ذات سے ہوئی بھرے جلسہ میں جنکا نام لیتے جی ہچکچاتا ہے۔ لیکن چونکہ مقلد موجدوں سے منزلوں آگے بڑھ گئے ہیں اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میری یہ جسارت قابل درگزر ٹھہریگی + یہ اصحاب وہ ہیں جنکی اور خدمات سے قطع نظر کرکے ماننا پڑیگا کہ ادبی خدمات فراخدلی سے اعتراف کی مستحق ہیں۔ اس سلسلہ میں صرف ایک نام لیا جائے گا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا نام کون اُردو داں نہیں جانتا۔ مولانا آزاد نے یہ کیا کہ تمام مصری جرائد کی ادبی بدعتیں بیچاری اُردو میں لاکر ٹھونس دیں + لیکن بڑے مزے کی بات ہے کہ مرشد تو سنبھل گئے اور انھوں نے وہ ڈھرا چھوڑ دیا مگر مُرید اون سے اتنے آگے بڑھ گئے تھے کہ اب ردِّ عمل اُنکے لیے ناممکن معلوم ہوتا ہے + آپ میں سے جن صاحبوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کا آل انڈیا خلافت کانفرنس کانپور کے سالانہ اجلاس منعقدۂ دسمبر ۱۹۲۵ء کا خطبۂ صدارت سُنا یا پڑھا ہے وہ صدق دل سے اس بات کی شہادت دیں گے کہ اس فاضل اور بےمثل خطیب نے ایسی زبان اور اسلوب میں نہایت اہم موضوع بیان فرمائے ہیں جو اُنکے ابتدائی عہد کی تمام ادبی بدعتوں کا کافی کفّارہ ہے +

طوالت کے خوف سے صرف ایک اور لفظ کا ذکر کیا جائے گا جسکو نئے اور خاص معنی میں

استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ لفظ موآد ہے۔ اُس وقت تک کیا اُردو کے اہل زبان اور کیا زباندان سب اس لفظ کو مادّہ کی سقیم صورت سے جو پھوڑے پھنسی یا زخم سے خارج ہوتا ہے تعبیر کرتے تھے لیکن آجکل اسکے معنی کو اوس ضروری معنوی سامان کا مفہوم دیا جاتا ہے جسکا فراہم کرنا تصنیف وتالیف کے لیے ضروری ہوتا ہے + ناواقف لوگ اس لفظ کے اس مفہوم کی بدعت کو مولانا شبلی مرحوم کے نام سے منسوب کرتے ہیں لیکن یہ اُنکی غلطی ہے۔ جہاں تک میرے مطالعہ کی وسعت ہے یہ لفظ اول اول اُس سپاسنامہ میں استعمال ہوا جو انجمن تہذیب لکھنؤ کی طرف سے مسٹر رابرٹ ہنری ڈیوس چیف کمشنر اودھ کی خدمت میں ۱۶- ستمبر ۱۸۶۹ء کو پیش کیا گیا۔ یہ معلوم کرنا غیر ممکن تھا کہ یہ سپاسنامہ کس کی تصنیف تھا لیکن یہ امر اوسی کی عبارت سے ظاہر ہے کہ وہ ترجمہ نہ تھا بلکہ اُردو میں لکھا گیا اور اُردو ہی میں صاحب موصوف کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا + وہ فقرے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں جہاں یہ لفظ اس نئے معنی میں استعمال ہوا ہے:-

"اس انجمن کے پاس کسی قدر مواد علمی جمع ہوتے جاتے ہیں اور آیندہ جس اصول سے اس کتبخانہ کی کارروائی ہوتی ہے۔" [5]

"اون کی (منشی نول کشور مالک مطبع اودھ اخبار کی) توجہ خاص سے اکثر سامان ومواد ترقی انجمن مہیا ہوئے ہیں" [6]

"انجمن اپنے مواد اور سامان اور مبادی اور اسباب ترقی میں سے اس امر کو نہایت عمدہ تصور کرتی ہے" [7]

میں اپنی زبان سے اس لفظ کے استعمال کی نسبت کچھ نہ کہونگا۔ صرف امیر مینائی مرحوم کے ارشاد کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرونگا۔ آپ اس لفظ کے اس مفہوم میں استعمال کی نسبت جو رائے رکھتے تھے اُسکا اظہار آپ نے ایک مکتوب میں بالکنایہ کیا ہے۔ مولوی نورالحسن صاحب (مولف نوراللغات) کو لکھتے ہیں:-

"مسالا، معلوم ہوتا ہے مصالح کا ہند ہے جو عربی میں مصلحت کی جمع ہے اور فارسی والے

---

[5] مطبوعہ سپاسنامہ مطبوعہ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ۔ صفحہ ۱۱ +

[6] " صفحہ ۱۸ +

[7] " صفحہ ۲۲ +

ہر چیز کی تیاری کے لوازم و ضروریات کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور یہی استعمال ہندی کے یہاں بھی ہے۔ عمارت کے لیے چونا۔ سرخی وغیرہ۔ تالیف کے لیے وہ کتابیں وغیرہ جن سے اس تالیف میں مدد مل سکے"+

اس باب میں اور کیا کہہ سکتا ہوں+

دوسرا نقص جو آجکل نہایت عام ہے مخالفت قیاس لغوی ہے۔ اس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ فارسی یا ہندی کے ضابطہ کے خلاف کوئی لفظ کلام میں وارد کیا جائے۔ حسب ذیل مقامات مخالفت قیاس لغوی کے تحت میں آتے ہیں (۱) زیادت (۲) کلمہ کو بموقع استعمال کرنا (۳) ترکیب اضافی یا توصیفی میں ہندی الفاظ کو آپس میں یا فارسی الفاظ کے ساتھ صفت موصوف یا مضاف مضاف الیہ بنانا یا واو عاطفہ کے ربط سے معطوف معطوف علیہ بنانا (۴) ہندی یا فارسی الفاظ کو عربی الفاظ کے طور پر بنانا چنانچہ ملبب بمعنی لبالب اور مذیب بمعنی زیبا (۵) کسی لفظ کے اصلی اور معروف معنوں سے انحراف کرکے اور معنوں میں استعمال کرنا جیسے مادہ کے بدلہ مواد (۶) مقام مدح میں ایسا لفظ استعمال کرنا جس سے مدح و ذم دونوں پائے جائیں جیسے مرزا غالب کے اس شعر میں

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوز غمہائے نہانی اور ہے

غم نہانی یعنی معشوق کی محبت نے غم کے سوز کا دوزخ کی آگ سے موازنہ کرنا عشق اور معشوق دونوں کی مذمت ہی ٹھہرتا ہے نہ کہ مدح + حسد یا بغض کی آنچ کا اگر دوزخ سے مقابلہ کریں تو ٹھیک ہو سکتا ہے لیکن عاشق کے غم نہانی کے سوز یا ماں کی ممتا کی آنچ کا آتش دوزخ سے موازنہ کریں تو یہ کوئی تفضیل نہیں بلکہ تذلیل ہے

یا خواجہ آتش کا یہ شعر

کشتہ اک عالم ہے چشم نعمت خود کام کا
استخوانوں میں مزا پاتے ہیں سگ بادام کا

چشم کی مدح منظور ہے لیکن اس میں مذمت کا پہلو نکل آتا ہے یعنی کشتگان چشم کی ہڈیوں میں معشوق کی چشم کے بادام نے ایسا اثر پیدا کر دیا ہے کہ جب انھیں کتے چباتے ہیں تو ان میں بادام کا مزا پاتے ہیں یعنی کتے معشوق کی آنکھیں چباتے ہیں

مخالفت قیاس لغوی کے تحت میں اور سقایم بھی داخل ہیں لیکن طوالت کے خوف سے انکا ذکر رہنے دوں گا اور صرف چند نظیروں پر اکتفا کروں گا

سنہ ۱۹۲۴ء کے موسم بہار میں یہیں لکھنؤ میں ایک نہایت دلچسپ بحث چھڑی۔ ان صوبجات کے چار مشہور اور بڑے اخباروں نے اس میں حصہ لیا اس مباحثہ کا ایک نمبر ۹ - مارچ سنہ ۱۹۲۴ء کے اودھ اخبار میں ملاحظہ فرمائیے۔ معاملہ ذاتیات کی حد تک پہونچ جائیگا جو مجھے منظور نہیں اس لیے اخبار مذکور کی مندرجہ مختلف تحریروں میں سے چند فقرے اُٹھا کر پیش کرتا ہوں، جو مخالفت قیاس لغوی کی ذیل میں آتے ہیں :-

(۱) "اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے —"

(۲) "جن میں آپ نے بہ حیثیتِ ایڈیٹرِ ———" (آگے اخبارِ متعلق کا نام ہے)

(۳) "ایک آزاد نگار جرنلسٹ ہیں"

(۴) "اخبارات سے ادارتی تعلق رہا ہے"

ان دونوں جملوں کو ساتھ پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ لکھنے والا ادارات اور مدیر لغات جانتا تھا جو اُردو میں تازہ وارد سہی لیکن اضافت سے وابستگی کی اہلیت رکھتے ہیں۔ پھر جرنلسٹ لکھنا کیا ضرور تھا -

(۵) "اگر لکھنؤ میں اڈیٹران کی کوئی ایسوسی ایشن ہوتی تو وہ اس واقعہ پر سخت نوٹس لیتی" + اس جملہ میں تین غلطیاں ہیں-(۱) انگریزی لفظ کی جمع فارسی قاعدے سے بنائی گئی یعنی اڈیٹران (۲) ایک انگریزی لفظ کا بلا ضرورت استعمال کیا گیا یعنی ایسوسی ایشن، حالانکہ اسکے مرادف اُردو لفظ موجود تھے (۳) اگر یہ مان بھی لیں کہ نوٹس عدالت کی اصطلاحی حیثیت کے سوا اس معنی میں بھی اُردو میں رواج پا چکا ہے - اسکا استعمال انگریزی زبان کے قاعدے کے خلاف کیا گیا ہے - انگریزی میں کہتے ہیں کسی چیز کا نوٹس لینا نہ کہ کسی چیز پر نوٹس لینا + جب ہم ایک غیر زبان کا محاورہ اپنی زبان میں استعمال کریں تو سب سے پہلے اسکی ضرورت ثابت ہونی چاہیے اور پھر اسکی اصل ہیئت میں ترجمہ سے تصرف کرنے کا ہم کو حق نہیں +

(۶) "ایسے جان گسل مناظرِ تظلّم و استبداد پیش کر رہا تھا"- یہاں تظلّم ظلم کرنا کے معنی میں استعمال ہوا ہے حالانکہ اسکے معنی ظلم کرنا نہیں بلکہ فریاد کرنا ہیں +

اب میں اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں + کتابوں سے اقتباس نہیں پیش کیے جائینگے

کیونکہ زبان کے بگاڑنے یا سُدھارنے میں پہلے اخبار اور پھر رسالے اون کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور عالمگیر اثر رکھتے ہیں + اخباروں کے پڑھنے والے کتابوں کے پڑھنے والوں سے تعداد میں کثیر ہیں - جسکو کتاب پڑھنے کی فرصت نہیں وہ بھی اخبار ضرور پڑھتا ہے - جسکی تعلیم کی کمی کتاب پڑھنے کی رغبت نہیں دلاتی وہ بھی اخبار کا مطالعہ ضرور کرتا ہے - غرضکہ ہر کتاب پڑھنے والا اخبار ضرور پڑھتا ہے لیکن ہر اخبار پڑھنے والا کتاب نہیں پڑھتا +

شاید کسی کو یہ خیال ہوا ہو کہ یہ پھر پھر کر دہی دلّی - لکھنؤ کا بکھیڑا اُٹھایا گیا ہے میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ زبان کی گڑبڑ کے بارے میں کیا ٹکسال اور کیا "گھر مسال" سب برابر حصہ لے رہے ہیں - اس میں دلّی - لکھنؤ یا کہیں کی کوئی خصوصیت نہیں - خیر - آپ دلّی کی اخباری زبان کی نسبت کچھ سننا چاہتے ہیں؟ لیجیے + ۲۹ - اور ۳۰ - مئی ۱۹۲۶ء کے دلّی کے اخبار تیج میں آپ کو یہ الفاظ اور فقرے نظر آئیں گے

(۱) "چرچا ہو رہی ہے"

(۲) "بے ضابطہ کانفرنس"

(۳) "حالات مندوہی - سنسنی خیز حالات" +

اب سنیے ہندی یا کہیں کی زنانی بولی میں چرچا مؤنث ہو گا اُردو میں تو مذکر ہی بولا جاتا ہے + بے ضابطہ کانفرنس کے یہ معنی ہیں کہ ایک انجمن کے جلسوں کے متعلق جو ضابطہ قرار دیا گیا ہے یہ کانفرنس اسکی خلاف ورزی میں ہوئی - لکھنے والے کے عندیہ میں انگریزی کا ایک لفظ انفارمل تھا ایسے مجمعے شرکاء کے آپس کے سمجھوتے کی غرض سے ہوتے ہیں + کہہ سکتے ہیں کہ جو کانفرنس آئین دستوری کے خلاف منعقد ہوئی ہو اُسکے لیے ہمارے پاس ایک اور لفظ "خلاف ضابطہ" ہے لیکن اسکا کیا علاج کہ سامع کا ذہن بے کے اُسی معنی کی طرف منتقل ہوتا ہے جو بے وقوف، بے ایمان، بے محل، بے وفا اور بے معنی کی ترکیبوں سے نکلتے ہیں - اس التباس و اغلاق سے بچنے کے لیے بہتر تھا کہ نجی کانفرنس لکھ دیتے - نجی دفتری زبان کی ایک اصطلاح بھی ہے + تیسرے فقرے میں سنسنی خیز کی ترکیب آتی ہے جسکو دلّی اور لکھنؤ ابھی تک [illegible] ہی قرار دئے ہوئے ہیں + اسکی نسبت آگے کچھ تذکرہ آئے گا +

اب [illegible] مئی ۱۹۲۶ء کا ہمدرد اُٹھائے لکھتے ہیں

(۱) "[illegible] صاحب کے اس مقولہ کی صداقت میں ....." دلّی اور لکھنؤ قرار

دے چکے ہیں کہ متوفی شاعر کے تخلص کے ساتھ صاحب کا تعظیمی کلمہ استعمال کرنا غیر فصیح ہے +

(۲) "ہماری پہلے بھی یہی رائے تھی اور اب بھی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی جو اسے تبدیل کر دیں"۔ یہاں جو کی جگہ کہ بہتر لفظ ہے۔

۲- جون سنہ ۱۹۲۶ء کے ہمدرد میں ایک غزل میں جب یہ شعر چھپا ہے :-

"میں ہوں کسی کی یاد میں اور کنجِ عافیت
پوچھے ہے کون حال غریب الدیار کا"

اسے دیکھ کر خیال گذرا کہ یہ شاعر صاحب شاید متقدمین یا متوسطین میں سے ہوں اور ممکن ہے کہ اسوقت جنت میں آرام کر رہے ہوں۔ کیونکہ یہ گمان کرنے پر جی نہ ٹھکتا تھا کہ اُس اخبار میں جو دلی سے نکلتا ہو اور مولانا محمد علی صاحب جوہر جسکے صیغۂ ادارت کے صدر ہوں یہ "آئے ہے"۔ "جائے ہے" کا وزن اس بیسویں صدی میں جگہ پائے۔ چنانچہ اخبار کے دفتر سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شاعر صاحب بفضلہ بقید حیات ہیں اور خیر سے دلی کے ایک کالج میں پروفیسر ہیں + شاید یہ کہا جائے کہ "اڈیٹر نامہ نگاروں کی رائے کا ذمہ دار نہیں" + یہ مانا لیکن اڈیٹر اپنے اخبار کی زبان کا ضرور ذمہ دار ہے + یہ غزل بالکل رسمی اور مجازی ہے۔ ہمدرد کے عملۂ ادارت کا فرض تھا کہ "شعر و سخن" کے عنوان کے تحت میں شایع کرنے کو اگر نواب سایل یا سید بیخود کی کوئی غزل اُسوقت موجود نہ تھی تو اس غزل میں سے یہ شعر تو قلمزد کر دیتے +

اخباری لٹریچر کی زبان دیکھ کر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ ایک اخبار کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ وہ پبلک کا روپیہ لیکر اسکے ادبی مذاق اور زبان کو بگاڑے۔ یہ کہنا کہ "روزانہ اتنے صفحہ کا اخبار نکالنا دل لگی نہیں۔ کوئی آکر ذرا دیکھے تو ایسی عجلت ہوتی ہے کہ کالم کی چٹ ابھی ختم نہیں ہونے پائی کہ کاتب صاحب سر پر موجود۔ جو کچھ لکھا جاتا ہے رواروی میں" + ایسی معذرتوں کو عذرِ لنگ سے زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی + آپ میں سے جو اصحاب انگریزی جانتے ہیں اُنھوں نے دیکھا ہوگا کہ محاورے اور انشا کی کتابوں میں صحیح استعمال اور اسلوب کی درستی کی مثالوں میں اخباروں سے کتنے اقتباس سند میں پیش کیے جاتے ہیں بلکہ لغت کی کتابوں میں مستند مصنفین کی فہرست میں شامل کیے جاتے ہیں + اس ضمن میں اگر یہ کہا جائے کہ صاحب اس میں دلی۔ لکھنؤ کا کیا قصور۔ یہ اہل زبان نہیں بیرونی لوگ ہیں جو یہاں آکر

روپیہ کمانے کو اخبار نکال بیٹھتے ہیں" تو دو باتوں میں سے ایک کا تسلیم کرنا لازم آئیگا یعنے (۱) دلّی اور لکھنؤ اخبار کی ہستی سے ناآشنا تھے باہر کے آدمیوں کو انگریزی سے اسکا علم ہوا ۔ اسی کی تقلید میں وہ یہ اخبارات نکال بیٹھے۔ نہ وہ اہل زبان ہیں نہ زباندان" + دلّی کے بارے میں تو یہ استدلال سراسر بے بنیاد ہے کیونکہ اُردو زبان کا اولین اخبار دلّی سے نکلا تھا اور اسکے نکالنے والے مولانا آزاد مرحوم کے والد تھے + بلکہ دہلی یا مضافات دہلی کے لوگوں نے نہ صرف یہ کیا کہ اپنے ہاں اخبار نکالے بلکہ ملک کے دوسرے حصوں میں جاکر اسکی تعلیم دی۔ چنانچہ پنجاب کا پہلا اُردو اخبار اور چھاپہ خانہ منشی ہرسکھ رائے نے جاری کیا۔ اس کا نام کوہِ نُور تھا جو ۱۸۵۰ء میں لاہور سے جاری ہوا۔ آپ کے نامی گرامی مطبع کے مالک اور اُردو فارسی کے لافانی محسن منشی نولکشور مرحوم اس اخبار کے عملہ میں تھے۔ غور سے دیکھا جائے تو لکھنؤ کی طرف سے بھی یہ عذر نہیں چل سکتا۔ ایک اودھ اخبار ہی کو لیں تو معلوم ہوگا کہ وہ ۱۸۶۹ء میں جاری ہوا تھا۔ اور مولوی غلام احمد تپش تلمیذ مرزا غالب۔ حضرت سرشار لکھنوی اور منشی نوبت رائے نظر لکھنوی جیسے مستند ادیب اور اہل زبان اسکی کرسی ادارت کو زینت بخش چکے ہیں + دوسری بات یہ ہے کہ اگر بفرض محال آپ کے یہ اخبارات سب باہر والوں کے ساختہ پرداختہ ہیں تو کیا آپ کے لیے یہ کوئی طرّۂ امتیاز یا تمغائے افتخار ہوگا کہ آپ اپنی ادبی کم مائگی اور اپنے ہاں قحط الرجال کا اقبال کریں + غرضکہ ایسے اخبار اور رسالے لکھنؤ۔ دہلی اور پنجاب میں ضرور نظر آتے ہیں جو اور امور کے علاوہ زبان کی صحت اور انشا کی وجاہت کا بھی لحاظ رکھتے ہیں مگر وہ کم ہیں +

بات یہ ہے کہ آجکل ہر کسی کا مطمح نظر روپیہ کمانا ہے۔ زبان اور اُسکے ذریعہ قارئین کے قوائے ذہنیہ اور اخلاق پر ہماری اس موقت الشیوع تصنیفات کا کیا اثر پڑیگا اسکی کسی کو پروا نہیں جب تک ایک فریق کی اہانت اور دوسرے کی اعانت نہ کی جائے۔ جب تک دو جماعتوں میں جوتی نہ چلوا دی جائے۔ سمجھا جاتا ہے کہ اخبار سرسبز نہیں ہو سکتا۔ شاید انھیں فاضل مدیروں اور اون کے قارئین کرام کی شان میں پیشگوئی تھی جسکا حامل جناب صبا مرحوم کا یہ مطلع ہے :—

تفرقہ اختلاف میں کیونکر بڑھے نہیں
ہندو پڑھے نہیں کہ مسلماں پڑھے نہیں

صاحب شعر الہند ایک نامور معاصر کے چند شعر لکھ کر اُن کے بعض الفاظ پر نشان کرتے ہیں

اور فرماتے ہیں :-

"ان الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اِس دَور کی غزل گوئی اخبارات اور رسائل اور عام ملکی لٹریچر سے کس قدر متاثر ہوئی ہے" [۵]

جن الفاظ پر اُنگلی رکھی گئی ہے وہ قابلِ گرفت ہیں بھی یا نہیں اس سے بحث کرنا غلط مبحث میں ڈال دیگا - یہاں صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ لٹریچر اور شاعری پر صحافت حاضرہ کا تاثر مسلّم ہے اور یہ کہ ارباب صحافت کی ذمہ داری اُردو کی سچی خدمت کے اعتبار سے کسی سے کم نہیں -

ایک بات اور کہوں گا اس سے پہلے کہ مضمون کے اس حصہ کو ختم کروں - کچھ کم دو سال کا عرصہ گذرتا ہے میں ایک لکچر میں اس امر سے مفصل بحث کر چکا تھا اور صاف صاف کہدیا تھا کہ جس تحریر کے سمجھنے میں قاموس یا امر کوش کی ضرورت پڑے اُسے اُردو نہیں کہہ سکتے متعدد اقتباسات کے بعد سنسکرت اور عربی کے چند الفاظ بھی بتا دیے تھے جو اُردو کو ثقیل بنا رہے ہیں اور صاف کہدیا تھا کہ جنکے سر پر ادبی معاملات میں بھی شدھی اور تبلیغ کا شیخ سدّو سوار ہے وہ مہربانی سے عربی اور سنسکرت میں خامہ فرسائی کیا کریں اور اُردو کو اپنے قلم غرابت رقم کی منت پذیری سے معاف فرمائیں - یہ لکچر ایک رسالہ میں چھپ چکا ہے + اکتوبر ۱۹۲۵ء کے رسالہ اُردو میں متروکات پر جو میرا مضمون شایع ہوا تو اس میں اسکا ضمناً تذکرہ ایک جگہ آ گیا - ایک صاحب اسے پڑھ کر خواہ مخواہ بگڑ بیٹھے + اس کا تو کوئی علاج نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کے تینتیس کروڑ انسان دو اور دو کی میزان چار ہی بتائیں - اس وسیع آبادی میں ایسے خوش فہم بھی نکل آئیں گے جو پونے چار یا سوا پانچ بتائیں گے -

وہ عبارت یہ ہے :-

متروکات کی فہرست پر حسب غور کی نظر ڈالی جاتی ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ چھانٹ چھانٹ کر ٹھیٹھ اردو الفاظ جو زبان میں مدتوں سے رچے بچے تھے کان پکڑ کر اُردو کی سبھا سے باہر کیے جاتے ہیں اور اُردو کو عربی فارسی لغات سے گرانبار کیا جاتا ہے - میں اس ضمن میں اون کا ذکر نہیں کرونگا جو دوسری طرف سنسکرت لغات کی بھرمار کر رہے ہیں کیونکہ وہ تعداد اور اثر میں کم ہیں - اردو

---

[۵] شعر الہند حصہ ۲ صفحہ

کے کسی ہندو شاعر یا ادیب کو جسکی ادبی حیثیت مسلمہ ہو یہ الزام نہیں دیا گیا کہ وہ زبان میں اس طرح ثقالت پیدا کر رہا ہے۔ مختصر یہ کہ کیا ہندو اور کیا مسلمان اُردو کے لکھنے والے سب ہی ارادی یا غیر ارادی متروکات کے باب میں برابر ہیں" ۵۲

جن ہندو اصحاب کی ادبی حیثیت اردو نظم و نثر میں مسلمہ ہے اُن میں سے کوئی اِن چند اصحاب کے کلام کا تجزیہ کرکے بتائے کہ اُس میں اور اُنکے مسلمان معاصرین کے کلام میں زبان کا کیا فرق و امتیاز پایا جاتا ہے اور سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ کہاں استعمال ہوئے ہیں۔ پنڈت امرناتھ صاحب ساحر دہلوی۔ بابو مہاراج بہادر صاحب برق دہلوی۔ منشی پیارے لعل صاحب رونق دہلوی۔ اور لالہ سری رام صاحب مؤلف تذکرہ خمخانۂ جاوید لکھنؤ میں حضرت چکبست مرحوم منشی نوبت رائے صاحب نظر مرحوم۔ بابو جوالا پرشاد صاحب برق مرحوم۔ بابو جگت موہن لال صاحب رواں۔ سُرور جہان آبادی مرحوم اور بابو دیا نرائن صاحب نگم۔ زیادہ نام گنانا طولِ کلام ہے۔ اب آپ فرمائیے کہ ان اصحاب کی ادبی حیثیت کو اُردو دنیا تسلیم کرتی ہے یا نہیں۔ جواب نفی میں نہیں ہو سکتا + سوائے اسکے کہ ان اصحاب میں سے کسی نے کبھی کوئی نظم یا یا مضمون خاص ہندوانی موضوع پر لکھا ہو انکے کلام میں سنسکرت یا ہندی الفاظ کے استعمال کی وجہ سے غرابت کا نقص نہیں نکالا جا سکتا + یہ سیدھی سادی بات ایک خوش فہم ایسے بھی تھے جنکی سمجھ میں نہ آئی + میں انھی دنوں میں ایک اور لکچر میں واضح طور پر بتا چکا ہوں کہ اُردو نے ہندو مسلمانوں کی ذہنیت اور معاشری شعار میں باہمی اختلاط اور رواداری کا کیا رنگ پیدا کیا + اس لیے یہاں اُسکا ذکر تکرار کا مورد ہوگا +

میں پھر عرض کروں گا کہ ہم کو اُردو زبان کی ترقی کے لیے جس طرح کیلاس اور بنارس جانے کی ضرورت نہیں اسی طرح قاہرہ اور طہران جانے کی بھی حاجت نہیں۔ میں ایک عربی اور ایک فارسی لغت کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں گا جنکا اسوقت مصر اور ایران میں عام استعمال ہو رہا ہے جو انھیں لغات عام کے ہندستانی استعمال سے بالکل مختلف ہے۔ یہ عربی لغت دخول ہے۔ ہندوستان میں اسکے استعمال کے صرف دو محل قرار دئے گئے اول تو حج کی اصطلاح ہے جسکے معنی ہیں بیت اللہ میں داخل ہونا۔ اس کا علم صرف علماے دین کو ہے یا اونکو جنھیں حج کی سعادت

۵۲ رسالۂ اُردو۔ اورنگ آباد۔ بابت اکتوبر ۱۹۲۵ء۔ صفحہ ۶۵۳ +

حاصل ہو چکی ہے۔ عموماً یہ لفظ اس ملک میں دوسرے محل کے لیے مختص ہے اور سوائے اُس ایک محل کے اور کہیں اس کا صرف مذموم قرار دیا گیا ہے۔ لیکن مصر میں اکثر سرکاری محکموں اور دفتروں کے خاص خاص کمروں کے دروازوں پر لکھا جاتا ہے "ممنوع الدخول" + میں نہیں سمجھتا کہ آپ مصر کے اتباع کے اس قدر دلدادہ ہو جائیں کہ اسے استعمال کرنے لگیں۔ وہاں ڈاکخانہ کو پوستہ اور پوسٹ ماسٹر کو المامور کہتے ہیں اور جہاں ڈاک کے ٹکٹ بکتے ہیں اُس جگہ کو مع طوابع البوستہ + میں نہیں قیاس کر سکتا کہ ان مصری اصطلاحوں کا استعمال اُردو کے لیے مستحسن سمجھا جائے گا۔ ہمارے ہاں وہ ادارے ایک صدی سے زیادہ عمر رکھتے ہیں جتنے مصر وغیرہ ممالک جہاں عربی بولی جاتی ہے حال ہی میں آشنا ہوئے ہیں۔ اُنکی اصطلاحیں اور اُنکے متعلق الفاظ وغیرہ ہمارے ہاں کبھی کے مقرر ہو چکے ہیں جنکو سب جانتے اور سمجھتے ہیں +

فارسی لغت جسکی طرف اوپر اشارہ ہوا تھا دستگیر ہے + یہ لفظ کیا ایران اور کیا ہندوستان میں غرضکہ ہر جگہ جہاں فارسی کا رواج تھا مددگار کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ خواجہ حافظ فرماتے ہیں ؎

تو دستگیر شو اے خضر پے خجستہ کہ من
پیادہ می روم و ہمرہاں سوارانند"

لیکن اسکے معنی آجکل کے ایران کی زبان میں گرفتار کرنے کے ہیں مدد کے وقت بھی ہاتھ پکڑا جاتا ہے اور چور کے گرفتار کرنے کے وقت بھی۔ اگر کل ایران والے یہی لفظ دستگیر ایک نئے یعنی فرض کیجیے پونچی کے لئے استعمال کرنے لگے تو کون اُنکا ہاتھ پکڑے گا۔ ہم پر اُنکے استعمال کا اتباع لازم نہیں آتا۔ ہم وہ فارسی جانتے ہیں جسے وہ چھوڑ بیٹھے ہیں اور اسی پرانی کلاسکل فارسی سے ہماری اُردو بنی۔ انکے ہاں فارسی زندہ زبان ہے اس میں تبدیلیاں ہونگی اور ضرور ہونگی۔ ہماری فارسی مردہ زبان ہے لہذا جیسی تھی ویسی ہی رہیگی۔ ہاں علوم وغیرہ کی نئی اصطلاحیں وضع کرتے وقت ہم اُن سے یا دوسرے ملکوں سے استفادہ کر سکتے ہیں +

آج کے موضوع کے اس حصہ پر میں آپ کا اتنا وقت لینا نہ چاہتا تھا۔ اب میں اسکے دوسرے جزو کی طرف متوجہ ہوتا ہوں +

جوں ہی اُردو سے متعلق لکھنؤ کا نام زبان پر آیا کہ دہلی گھر کے پیر یا پروہت کی طرح سامنے آکھڑی ہوتی ہے اس لیے مناسب ہے کہ اس مذکور سے پہلے کہ لکھنؤ نے اُردو کی کیا خدمات

کہیں اُن پیر جی کو نہ بٹھا دیا جائے۔ کوئی زبان جب ہاتھ پاؤں نکالتی ہے اور اپنے مولد و منشا سے نکل کر ملک کے اطراف و جوانب میں سیر گشت کرنے لگتی ہے تو پھر وہ اپنے پرانے سرپرستوں اور محافظوں کے تدغن سے بہت کچھ آزاد ہو جاتی ہے۔ اُس پر اُنکی حکومت کا کوڑا صرف اس قدر رہ جاتا ہے کہ غیر معمولی اور اہم حوادث کے مواقع پر اُن سے استفتا کرے۔ آپ کا بچہ جب تک شیر خوار رہتا ہے ماں کی گود سے جدا نہیں ہوتا۔ آپ اُسے کبھی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ جب ذرا گھٹنیوں چلنے لگتا ہے تو اُسے اپنے کمرے میں معصوم ورزش کی اجازت ہو جاتی ہے اور صرف اتنی احتیاط رہتی ہے کہ باہر کے رُخ کوئی کھڑکی یا دروازہ ایسا نہ ہو جس کا کٹہرا کافی اونچا نہیں۔ اسکے بعد جب وہ صاف چلنے لگتا ہے تو آپ کی اُنگلی پکڑ کر گھر کے باہر ادھر اودھر چھوٹے چھوٹے سفر طے کرتا ہے۔ کچھ مدت بعد حسب ضرورت اُسے شہر سے باہر دور دراز مقامات میں بھیجا جاتا ہے تو اول اول گھر کا کوئی آدمی ساتھ جاتا ہے پھر وہ بھی حذف ہو جاتا ہے۔ قصہ مختصر آپ کی اور اُسکی زندگی میں ایک زمانہ ایسا بھی آتا ہے کہ آپ اُس سے بالکل بے فکر ہو جاتے ہیں اور اُسکی صورت دیکھنے کو مہینوں بلکہ کبھی برسوں گزر جاتے ہیں مگر آپ کو کسی قسم کی تشویش نہیں ہوتی اور صرف کبھی کبھی کا سندیسا طمانیتِ خاطر کو کافی ٹھہرتا ہے + یہ نہایت صحیح تمثیل ہے اُس تعلق کی جو اہل زبان یا زبان کے مرکز کو زبان کے ساتھ ہونا چاہیے + اس تمثیل کا اطلاق اُردو سے متعلق دلّی اور لکھنؤ کے ادبی تعلقات پر کیجیے تو ثابت ہوگا کہ دلّی میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ اُس نے بالغ اولاد کے ساتھ دوستانہ برتاؤ رکھنا مناسب سمجھا + شرور اور سخن کے جھگڑے جھمیلے کو جانے دیجیے اب اُن سے نہ کوئی لکھنؤ میں تسکین ہوتا ہے نہ دلّی میں۔ دلّی سمجھدار والدین کی طرح اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو پروان چڑھتا اور خود مختار دیکھ کر پھولی نہ سمائی۔ ہاں کبھی ایسا بھی ہوا کہ جب بچہ باپ کی گود میں بیٹھ کر اُس کی ڈاڑھی پر ہاتھ ڈالنے لگا تو ذرا چشم نمائی کر دی گئی +

اب میں آپ سے دو چار کھُلی کھُلی باتیں کرنا چاہتا ہوں + کہا گیا ہے کہ لکھنؤ نے اُردو میں بدعت اور طوائف الملوکی کا عَلم بلند کیا + خواجہ حالی مرحوم فرماتے ہیں :—

"ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب دلّی بگڑ چکی اور لکھنؤ سے زمانہ موافق ہوا اور دلّی کے اکثر شریف خاندان اور ایک آدھ کے سوا تمام شعرا لکھنؤ ہی میں جا رہے اور دولت و ثروت کے ساتھ علوم قدیمہ نے بھی ایک خاص حد تک ترقی کی تو

اس وقت نیچرل طور پر اہل لکھنؤ کو ضرور یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ جس طرح دولت اور منطق و فلسفہ وغیرہ میں ہم کو فوقیت حاصل ہے اسی طرح زبان میں فوقیت ثابت کرنے کے لیے ضرور تھا کہ دلی کی زبان میں کوئی امر ما بہ الامتیاز پیدا کرتے۔ خود بخود طبیعتیں اس بات کی مقتضی ہوئیں کہ بول چال میں ہندی الفاظ رفتہ رفتہ ترک اور اُنکی جگہ عربی الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے۔ اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم و نثر پر بھی غالب آگیا۔[۵۴]

یہ جو کچھ بھی ہوا یوں ہی ہونا تھا۔ میرے مکرم مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں :۔

”اب ایک سوال یہ باقی ہے کہ میر کی شاعری کا اثر اونکے (لکھنوی) ہمعصروں اور مابعد کے شاعروں پر کیا پڑا؟ اگرچہ میر صاحب کی خود اُنکے زمانہ میں بے انتہا قدر ہوئی اور اب تک لوگ اُنکی اُستادی کا لوہا مانتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ اُن کے آخر زمانہ نیز مابعد کی شاعری پر میر کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ لکھنؤ کی شاعری کا رنگ بالکل جدا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل لکھنؤ جس کلام کی اس قدر دل سے داد دیتے تھے اُس سے وہ مطلق متاثر نہ ہوے“ [۵۵]

یہ حیرت بجا ہے۔ لیکن اس حیرت انگیز معمہ کا حل دیوان غالب میں ڈھونڈنا چاہیے + مرزا کا ایک مقطع ہے :۔

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

جب مرزا صاحب میر کے اس صدق دل سے معتقد تھے تو اُنھوں نے اس عقیدہ کو عملی جامہ کیوں نہ پہنایا؟ وجہ یہ کہ اوّل اوّل اونکو اپنا ذاتی تشخص قائم کرنا تھا۔ وہ کر چکے تو پھر اپنے عقیدہ پر عمل شروع کیا۔ یہی طرز عمل شیخ ناسخ کا رہا + لیکن چونکہ مرزا صاحب دلی کے تھے اُنکی بے میری کھپ گئی۔ شیخ صاحب لکھنؤ کے تھے اونکی بے میری کسی کو ایک آنکھ نہ بھائی + یہ ایک آنکھ میں سُرمہ اور ایک میں کاجل آئین انصاف کے خلاف ہے۔ غالب کا ابتدائی کلام چھوڑ کر پچھلے زمانے کا کلام دیکھو — اب تو نسخہ حمیدیہ بھی موجود ہے — اور اُس کے ساتھ ہی ناسخ کا پہلا دیوان الگ رکھ کر دوسرا دیوان دیکھو تو دونوں ہم رنگ میری معلوم ہونگے۔ لیکن ناسخ کے

---

۵۴ دیوان حالی مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۴۸

۵۵ دیباچہ انتخاب کلام میر ص ۳۵

مقلد پیدا ہو گئے تھے۔ خود اُن کے شاگردوں کی جماعت ہی کثیر تھی۔ اُنکا ابتدائی رنگ چل نکلا اور رفتہ رفتہ گھٹا بنکر لکھنؤ کی ادبی فضا کے بڑے حصہ پر چھا گیا + وقت اور صورت حال کا مقتضا کچھ ایسا تھا کہ خود اُنکے معتقدوں اور مقلدوں نے انکے پچھلے زمانے کے کلام کی طرف توجہ نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ کی شاعری کا رنگ اور زبان کا اسلوب ایک مدت کے لیے دلی کے رنگ سے بالکل جداگانہ اور متمیز ہو گیا + کچھ صنائع جو پہلے سے اُردو شاعری میں موجود تھے اب بے تحاشا بڑھ گئے۔ صنائع بدائع یا مراعات النظیر اُردو میں پہلے سے موجود تو تھے مگر اب کلام کی خوبی کا حصر انھیں پر تھا۔ لیکن یہ سوال صرف افراط تفریط کا ہے۔ جس طرح زمانہ جاہلیت کی شاعری کے مقابلہ میں عرب کی ابتدائی اسلامی شاعری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُسنے حقائق وجذبات کو خیرباد کہکر لفظی رعایت کے التزام اور معانی کے اختراع کی بنیاد ڈالی تھی۔ خاص کر اختراعی معانی کو متنبی اور ابن الرومی نے فروغ دیا اسی طرح اس ضمن میں لکھنؤ کے کسی اُستاد کا نام وثوق کے ساتھ نہیں لے سکتے۔ اگرچہ سب ہی منہ کھول کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ لکھنؤ نے رعایتِ لفظی کی لے یہاں تک بڑھائی کہ شاعری کو ابتذال اور ضلع جگت کے پاس لا بٹھایا۔ اسے مان بھی لیں تو میں کہتا ہوں کہ اس شاعری میں جو اُسوقت کی تھی خود مختاری اور ذاتی تشخص قائم کرنے کے لیے کسی اور سبیل کی گنجایش ہی نہ تھی + دلی لکھنؤ کی جگہ ہوتی تو وہ بھی یہی رستہ اختیار کرتی جو لکھنؤ نے کیا + یہی حال خارجی مضامین یعنی گل و بلبل۔ کنگھی چوٹی اور انگیا کرتی کا ہے۔ اس میں بھی لکھنؤ الزام کا اتنا مستوجب نہیں جتنی دلی ہے + میں کہتا ہوں کہ اس کنگھی چوٹی اور انگیا کرتی ـــــ کہیے ابتذال اور عریاں نویسی ـــــ کی شاعری کی محرک ریختی ہوئی۔ اور ریختی کی ایجاد میں لکھنؤ قطعاً معصوم ہے + ریختی رنگین یا انشا کی ذات سے اُٹھی۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر لکھنؤ کی اخلاقی اور معاشری آب ہوا ایسی نہ ہوتی تو انھیں ریختی کے ایجاد کا خیال بھی نہ آتا کیونکہ دلی میں اور بھی ریختی گو شاعر ہوئے ہیں۔ ایک محشر ہی تھے جو غالباً میر صاحب کے اخیری زمانہ میں یا اُسکے کچھ بعد اپنی ریختیوں کا جزدان بغل میں مارکر دلی سے لکھنؤ پہنچے + بات یہ ہے کہ آصف الدولہ کا فیض آباد سے لکھنؤ آنا تھا کہ بُرے بھلے۔ چھوٹے بڑے ہر قسم کے آدمی تمام شمالی و مغربی ہند سے کھچکر لکھنؤ پر چڑھائی کرکے آگئے اور بیچارے لکھنؤ کہاں تک الملتا نہ لیکر وہ کھوٹے کھرے۔ اچھے برے کی تمیز کر سکتا۔ جو پہلے جسکے ہتے چڑھ گیا وہی اسکے دل و دماغ پر چھا گیا + خیر اس داستان کو طول دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ لکھنؤ اب اس مرکز پر واپس آ گیا ہے جس سے انحراف کا اُسے ملزم ٹھہرایا جاتا تھا۔

شیخ ناسخ پہلے فرمایا کرتے تھے :۔

آگے مجھ کامل کے ناقص ہے کمالِ مدعی　　　درمیاں ہے فرق استدراج اور اعجاز کا

کسی محبوب کو کیا ہے مرے محبوب سے نسبت　　　کہ رشکِ خالِ مشکیں ہے جو اسکی زلف کی جوں ہے

پھر فرمانے لگے :۔

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں　　　ہائے میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟
لالۂ و گل کا جوش ہے بلبلوں کا خروش ہے　　　فصلِ وداعِ ہوش ہے موسمِ ہائے و نوش ہے
ناسخ قول ہے بجا حضرتِ میر درد کا　　　حسن بلائے چشم ہے نغمہ وبالِ گوش ہے

اور خواجہ صاحب نے تو کہنا چاہیے کہ اپنا شاعری کا نظریہ اور دستور العمل ہی بدل ڈالا + پہلے آپ کا قول تھا :

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

بعد میں یہ مرصع سازی چھوڑ کر سادہ کاری کی جانب مائل ہوگئے اور فرمایا :۔

ملا دیں دل نہ کیونکر شعر آتش　　　صفا بندش معانی خوبصورت

ممکن ہے کہ یہ شاعرانہ تخیل کی محض تنوع پردازی کا انداز ہو اس لیے دیکھنا چاہیے کہ وہ نقاد جو رائے دینے کی اہلیت رکھتے ہیں اور مقامی وابستگی کے پابند نہیں لائحہ عمل میں اس تغیر کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں + جناب شوق نیموی اپنے پرازمعلومات رسالۂ اصلاح میں جو آپ کے قومی پریس سے ۱۸۹۶ء میں شایع ہوا تھا لکھتے ہیں :۔

"ہاں کہ ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است - اور بلند پروازی وجدت ایک عمدہ چیز ہے - مگر مزے کے ساتھ ہو - غزل میں عشقیہ مضامین - درد انگیز معانی - پاکیزہ خیالات - سلجھی ہوئی ترکیبیں - نکھری ہوئی بندشیں - دلکش الفاظ - چلبلے جملے - مربوط مصرعے - پھڑکتے ہوئے شعر ہونا چاہئیں - سابق زمانے سے اسکو دلی کا رنگ کہتے ہیں - میر و درد کا کلیات - نسیم دہلوی کا دیوان - داغ کا کلام دیکھو کہ کس قدر تقاضائے طبیعی اثر رکھتا ہے - لکھنؤ کے اگلے شعراء میں سے صبا کی شیریں زبانی اور سحر کی سحر بیانی دلی والوں سے ملتی جلتی ہے - اور اب تو اکثر لکھنؤ والوں نے

اپنی طرز کو چھوڑ کر وہی رنگ اختیار کیا ہے۔"[۵۹]

مولانا عبدالسلام ندوی اپنی کتاب شعر الہند میں لکھتے ہیں:-

"آج تو دلی کے رنگ کی مقبولیت نے ان دونوں (شیخ ناسخ اور خواجہ آتش) کے رنگ کو پھیکا کر دیا۔"[۶۰]

مولانا معاف فرمائیں بیان کی یہ ادا تذکرہ نویسی کی سلیقہ مندی کی منافی ہے۔ یہی بات اس طرح کہی جا سکتی تھی:-

آج تو لکھنؤ اوس اصلی رنگ کی طرف عود کر رہا ہے جس کا وہ اصل میں دلدادہ تھا۔ اور اب دلی اور لکھنؤ میں کوئی چیز مابہ الامتیاز باقی نہیں رہی۔ میر و غالب کا تتبع دونوں جگہ حاوی ہے۔

وہ بس ایک آندھی تھی کہ آئی اور نکل گئی۔ دیکھیے خواجہ صاحب اور شیخ صاحب دہلی اور اساتذۂ دہلی کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں:-

آتش

اک تختہ ہفت کشور دہلی کا ہے ہماری ۔۔۔۔ نو آسماں ہیں اپنے اکبر کے نورتن میں

ناسخ

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب ۔۔۔۔ ہاں تتبع کہتے ہیں ناسخ ہم اس مغفور کا

شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں ۔۔۔۔ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

صاحب شعر الہند نے ان الفاظ کے ساتھ اس بحث کو ختم کیا ہے:-

"منشی امیر احمد صاحب مرحوم نے اپنی قدیم روش کو چھوڑ کر داغ کا رنگ اختیار کرنا چاہا۔ اور گوہر انتخاب اور جوہر انتخاب میں میر و درد کے رنگ میں بھی کہنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ مراۃ الغیب اور صنم خانہ کا رنگ بالکل مختلف ہے۔"[۶۱]

شاعری کے رنگ کو یہاں چھوڑ کر اب میں زبان کے اختلاف سے بالاجمال بحث کرونگا۔ اور یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ جو اختلافات لکھنؤ کی فرد قرارداد جرم میں درج کیے جاتے ہیں وہ

---

۵۹ اصلاح معائب ناسخ۔ مولفۂ مولانا سید محمد ظہیر احسن شوق نیموی۔ مطبوعہ اردو پریس۔ علی گڑھ۔ صفحہ ۸۰۔

۶۰ شعر الہند۔ حصہ اول۔ صفحہ ۲۱۶۔

۶۱ شعر الہند۔ حصہ اول۔ صفحہ ۲۸۹۔

اوّل تو ہیں ہی جزوی اور اسکے علاوہ وہ خاص الخاص اساتذۂ دہلی کے اتباع میں ہیں + یہ بات شاید پہلے کبھی آپ کے کانوں تک نہیں پہونچی - اب سُنیئے اور غور سے سُنیئے + یہ اختلافات جن میں بعض اس وقت تک موجود ہیں اکثر و بیشتر چند اسموں کی تذکیر و تانیث سے تعلق رکھتے ہیں جن کی وجہ سے افعال کی تذکیر و تانیث متاثر ہوتی ہے - اسکے سوا جو اختلاف نظر آتے ہیں وہ زیادہ تر لب و لہجہ اور جغرافی لواحق سے تعلق رکھتے ہیں - انکو صوبیت یا مقامی خصوصیات سمجھ لیجیے + باقی یاران سرِ پل کی دل لگی ہے + ایسے چند اختلافات کا جو ذکر کیا جاتا ہے غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہو +

(۱) کہا جاتا ہے کہ مرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی اور لکھنؤ کے ایک رئیس سے کیچڑ کے متعلق بحث ہوئی - رئیس نے کہا کہ دلّی والوں کو رلے تقفیہ کے استعمال میں کراہیت کا احساس ذرا نہیں ہوتا اور بے تکلف کیچڑ بول جاتے ہیں - لیکن لکھنؤ والے کیچ کہتے ہیں - مرزا صاحب نے جواب میں ستم ظریفی سے جو کچھ فرمایا اسکے نقل کرنے کی ضرورت نہیں - اُسکا جواب لکھنوی صاحب کو نہ آیا + اگر اوس لکھنوی رئیس نے تحقیق زبان کی نظر سے اساتذۂ دہلی کا کلام پڑھا ہوتا تو کیچ کی حمایت میں دلّی کی سند بلا تکلف پیش کی جا سکتی تھی + میر تقی مرحوم لکھ گئے ہیں - یہاں اور نیز آگے چل کر دوسرے اختلافات سے متعلق میر صاحب ہی کے کلام سے سند لائی جائے گی جنھیں تمام اُردو دنیا آج تک مان رہی ہے -

ہاں - میر صاحب لکھ گئے ہیں :-

پڑے وادیِ سوختہ بیچ میں
کہیں آب میں تھے کہیں کیچ میں
(مثنوی شکار)

(۲) دلّی میں کہتے ہیں "اس کام میں بہت کوشش کرنی پڑیگی" لکھنؤ میں "اس کام میں بہت کوشش کرنا پڑیگی" + میر صاحب فرماتے ہیں :-

کئی گام یوں راہ چلنا پڑے
پھر اوس دام گہ سے نکلنا پڑے
(مثنوی شکار)

چار و نا چار اُس کنے جانا پڑے
کوڑیاں دے جوتی گٹھوانا پڑے
(تنبیہ الجہال)

(۳) خواہ اسے "آنے ہے" کے مابعد المتروکات کا لقبیہ کہیے یا کچھ لکھنؤ میں چاہیے

کے ساتھ ہے بڑھا دیتے ہیں۔ دلّی میں نہیں بڑھاتے + میر صاحب فرماتے ہیں :۔

پتھر کی چھاتی چاہیے ہے میر عشق میں
جی دیتا ہے اُسکا جو کوئی وفا کرے

(۴) آجکل تو نہیں لیکن ناسخ مرحوم کے زمانے میں لکھنؤ کے شعرا مدتوں اور برسوں کی جگہ سالہا بہت لکھا کرتے تھے۔ دلّی والوں نے یہ فارسی ترکیب اس مجرد صورت میں استعمال نہیں کی۔ اسکے بدلے سالہاسال کہتے تھے۔ مگر میر صاحب کے کلیات میں ہے :۔

بے لطف یار ہم کو کچھ آسرا نہیں ہے
سو کوئی دن جو ہے تو پھر سالہا نہیں ہے

(۵) لکھنؤ میں کہتے ہیں: "کتنے خط لکھے۔ آدمی بھیجے مگر آپ خبر نہ ہوے" + دلّی میں اس موقع پر کہتے ہیں "آپ کو خبر تک نہ ہوئی" یا آپ نے خبر نہ لی میر صاحب فرماتے ہیں :۔

نہ اس حال سے اہل دفتر خبر توجہ نہ عمدوں کی کچھ ہے ادھر

زیادہ نظائر پیش کرنا طول کلام ہے۔ مشتے نمونہ از خروارکافی ہے + آپ نے دیکھا کہ جو خصوصی اختلافات زبان سے متعلق دلّی اور لکھنؤ کے بتائے جاتے ہیں اور ہیں بھی اُن میں لکھنؤ دلّی کے اُستاد کا اتباع کرتا ہے + یہ ہے دوسری بات کہ دلّی نے جہاں اور اساتذہ اور خود میر صاحب کے بعض الفاظ اور ترکیبیں ترک کردیں اور میر صاحب کی ان ترکیبوں کو بھی متروک قرار دیا تو لکھنؤ نے ایسا کیوں نہ کیا؟ اسکے جواب میں کہ سکتے ہیں کہ لکھنؤ میر صاحب کا اسقدر دلدادہ تھا کہ ان کی جوانی اور بڑھاپے میں زبان کی تمیز کرنا اسکے لیے ناممکن تھا۔ ہاں اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت یہ الفاظ اور ترکیبیں لکھنؤ میں رہنے سے میر صاحب کی زبان پر چڑھ گئیں اور وہ انکے استعمال کے عادی ہوکر انھیں اشعار میں باندھ گئے۔ تو میں اس شخص کی ذہنیت سے عبرت کا سبق لونگا اور دعا کرونگا کہ اللہ تعالی جو شافی برحق ہے اسکے نفس ناطقہ پر رحم فرمائے! آپ دلائل طلب کریں گے۔ سُنیے۔ میر صاحب جب لکھنؤ تشریف لائے اسوقت اُن کا سن شریف ساٹھ سال تھا۔ اس عمر کو پہنچکر اور اتنا کچھ لکھکر میر صاحب کا لکھنؤ کی زبان سیکھ جانا اور اُسے اشعار میں استعمال کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ اور پھر کون میر صاحب۔ وہ کہ جنھوں نے دلّی سے لکھنؤ تک کا سفر منہ میں گھنگنیاں اور کانوں میں انگلیاں دے کر طے کیا۔ یہ اس واسطے کہ اپنی ہملی کے ترکیب سے۔ جو اگر دلّی نہیں تو اسکی پڑوس کا رہنے والا ضرور تھا۔ گفت وشنید کا موقع اُنھیں گوارا

نہ تھا۔ جو شخص ایسا استوار اور راسخ ادبی شعار و مذاق رکھتا ہو اور جسکے ہر مین حفظان فصاحت کا خیال جنون کے درجے تک پہونچ گیا ہو اُسکی نسبت یہ گمان بھی کرنا کہ اُس نے لکھنؤ اور پھر اُسوقت کے لکھنؤ کی پیروی کی ایسی بات ہے جسکا جواب میرے پاس نہیں۔

زبان کے اختلافات کی بحث میں اسموں کی تذکیر و تانیث کا ذکر آیا ہے چونکہ اس اختلاف کا تعلق متعدد غیر ذی روح اسماے اُردو سے ہے اسلیے اس بارے میں چند امور قابل گزارش ہیں۔ ممکن ہے میں غلطی پر ہوں مگر اسکی عمومی حیثیت پر نظر رکھتے ہوے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دہلی نے رواج مرتسمہ میں کوئی وجہ تبدیلی کی نہیں دیکھی لیکن لکھنؤ میں جب اوس سے اختلاف کیا گیا تو کوئی معقول نظریہ پیش نظر نہ تھا۔ وقت کی قلت مانع ہے ورنہ اس مسئلہ کے متعلق میں اپنا نظریہ پیش کرتا۔ سردست تذکیر و تانیث غیر حقیقی کے بارے میں شاید یہ کہنا کافی ہو کہ جہاں ایسے اسموں کے اصلی مخرج کے قاعدے کا اتباع لازم نہیں آتا ایسی صورت میں یہ ہونا چاہیے کہ ان ہماے غیر ذی روح کو جنمیں جمالی شان پائی جائے صیغۂ تانیث میں رکھا جائے اور بخلاف انکے جن میں شانِ جلالی پائی جائے اُنکو صیغۂ تذکیر میں۔ یہ بات بظاہر تو معمولی اور خفیف سی معلوم ہوتی ہے لیکن اس ایک اختلاف سے آگے جو اور اختلاف رونما ہوتے ہیں وہ زبان کے حق میں مفید ہرگز نہیں۔ سانس کی نسبت جو داغ مرحوم سے پوچھا گیا تو اُنھوں نے جواب دیا کہ عورت کی سانس اور مرد کا سانس کہنے میں کیا عیب ہے۔ یہ تو تھی ایک ہنسی کی بات۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں ہمارے ہاں بہت گڑبڑ ہے۔ دیکھیے خود لکھنؤ میں مختلف فیہ صورتیں موجود ہیں۔ ایک لغت مالا ہی کو لیجیے جو شیخ مرحوم کے زمانہ سے لکھنؤ میں عموماً مذکر بولا جاتا ہے۔ لیکن اسی لکھنؤ میں ایسے اُستاد بھی گزرے ہیں جنھوں نے اس اجتہاد کو نہ مانا جناب امیر مرحوم کے اُستاد اسیر مبرور نے فرمایا:—

سلسلہ اشک کا توڑے جو مرا دیدۂ تر
موتیوں کی نہ کرو تم ابھی مالا ٹھنڈی

ایک اور بدعنوانی یہ پیدا ہو گئی کہ مجتہد اپنے اجتہاد کو بھول کر ایک ہی لفظ کو کبھی مذکر کہہ گئے اور کبھی مونث۔ خواجہ صاحب اور شیخ صاحب کے دو دو اشعار پر اکتفا کیا جائے گا جن میں اُنھوں نے بلبل کو مذکر اور مونث دونوں جنسیتیں دی ہیں خواجہ صاحب فرماتے ہیں:—

بلبل گلوں سے دیکھ کے تجھکو بگڑ گیا (۱) قمری کا طوق سرو کی گردن میں پڑ گیا

چمن میں جا کے میں دلخستہ بھولے سے کراہا تھا (۲) کیا کی گُل سے بلبل حیلۂ دردِ گلو برسوں

ناسخ مرحوم فرماتے ہیں :-

(۱)

سیرِ ہر کنج چمن کرتے ہو تم غیر کے ساتھ
بلبلِ دل مجھے اے جان خبر دیتا ہے

(۲)

بُلبلیں سہچہے کرتی ہیں چمن میں ساقی
طوطیِ شیشۂ مے زمزمہ پرداز نہیں

ان اشعار میں قرینہ سے یہ تو نہیں پایا جاتا کہ ایک جگہ نر جانور سے مطلب تھا اور دوسری جگہ مادہ سے + کوئی ماننے تو مانے میں یہ مان لینے کو تیار نہیں کہ شیخ ناسخ اور خواجہ آتش ایسے بے بضاعت شاعر تھے کہ ضرورتِ شعری سے عاجز ہو گئے اور بحر و قافیہ سے مجبور ہو کر جو بن پڑا کہدیا - ایک اور خرابی یہ پیدا ہو گئی کہ اساتذہ کے اس تذبذب نے ان میں اور تلامذہ میں اختلافِ عمل پیدا کر دیا - ناسخ نے نشو و نما کو مذکر باندھا ہے :-

خط کو روے یار پر نشو و نما ہوتا نہیں
سبزۂ بیگانہ گُل سے آشنا ہوتا نہیں

لیکن شیخ صاحب کے ارشد تلامذہ خواجہ وزیر مونث لکھتے ہیں :-

آنسو بہا تو رشتہ بہ پا مرغ دل ہوا
دانہ سنے کی جو نشو و نما دام ہو گیا

اسی ایک لغت نشو و نما کے استعمال کی تاریخ پر نظر غائر ڈالیں تو ظاہر ہوگا نہ صرف یہ کہ اس لغت کو کوئی مذکر لکھتا ہے اور کوئی مونث - بلکہ اختلاف کی نہایت قبیح صورت ایک یہ پیدا ہو گئی ہے کہ بلبل کی طرح یہ لغت بھی ایک ہی شخص کی ایک ہی تصنیف میں کہیں مذکر آتا ہے اور کہیں مونث + نظم و نظم نثر بھی اس اجتماع ضدین کا شکار ہوے بغیر نہ رہی + آپ دیکھیں گے کہ تذکرۂ گل رعنا کے صفحہ ۳۹ - سطر ۱۰ میں یہی لفظ نشو و نما صیغۂ تانیث میں آیا ہے اور اُسی ورق پر یعنی صفحہ ۴۰ کی سطر ۲ میں مذکر لکھا گیا ہے + اسی طرح صفحہ ۹۴ - سطر ۴ میں مونث اور صفحہ ۲۷۸ - سطر ۱۲ میں مذکر آیا ہے - کوئی اسے مولانا عبد الحی کی لاعلمی یا تسامح نہیں کہہ سکتا + ایک نشو و نما پر کیا موقوف ہے بیسوں لفظ ہیں جو ناسخ و آتش کی بلبل اور داغ کے - اس کی طرح دھوبی کے کتے اور خرنا شخص کی تمثال مجہول الجنس ہیں - نہ ادھر کے نہ اُدھر کے + اُردو دنیا کی اس طرف توجہ ہونی چاہیے +

غیر ذی روح اسموں کی تذکیر و تانیث انکی قیاسی یا سماعی حیثیت سے حقیقی و غیر حقیقی ہوتی ہے۔ کیا اُس کا کوئی قاعدہ کلیہ قائم کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس بحث کو کسی معقول نظریہ کے تحت لا سکتے ہیں؟ کیا چند مستثنیات کو چھوڑ کر کوئی قطعی اصول اس بارے میں قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ ایسے سوال ہیں جنسے اس جگہ بحث نہیں ہو سکتی اور نہ یہ ایسا کام ہے کہ ایک یا دو آدمی اسکا کوئی آئین وضع کر سکیں اگر ہم کو اپنی زبان کی بہتری اور ترقی منظور ہے تو سب کو ایک جگہ مل کر اردو کے متعلق جملہ امور زیر بحث کا تصفیہ کرنا چاہیے + مختصر یہاں صرف یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ تذکیر و تانیث کے بارے میں جو اختلاف دلی اور لکھنؤ کا ہے وہ کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ لکھنؤ خود بالاتفاق کلی طور پر ایک استعمال پر مستقیم نہیں پایا جاتا۔ لہذا یہ اختلاف ہے بھی تو قابلِ لحاظ نہیں نہ اتنا اہم ہے جتنا اسے بتایا جاتا ہے +

زبان اور شاعری کا قصہ تو طے ہوا۔ اب میں چند باتیں ادھر اُدھر کی کہکر آپ سے رخصت ہوں گا۔ اصحاب نقد و نظر ڈنکے کی چوٹ کہہ رہے ہیں کہ اُردو لکھنؤ پہونچکر بگڑ گئی کامل غور اور مطالعہ کے بعد میری رائے اسکے خلاف ہے + یہ امر ذرا تفصیل طلب ہے۔ اُردو بنجارے کے ٹٹو پر لد کر یا ڈاک کے پارسل میں بند ہو کر لکھنؤ نہیں پہنچی تھی۔ بلکہ اسے دلی والے اپنے ہاتھوں یہاں لائے۔ سب ہی سکتے ہیں کہ چند ایک کے سوا دلی کے تمام اچھے شاعر لکھنؤ چلے آئے۔ اس ہجرت کی مکمل فہرست پیش نہیں کی جا سکتی کیونکہ زبان یا لٹریچر کی تاریخ نویسی کا فن اُسوقت موجود نہ تھا۔ بہر حال معتبر تذکروں کی چھان بین سے پتا چلتا ہے کہ حسب ذیل شعرا ان میں سے ہیں جو لکھنؤ آئے اور وہیں کے ہو رہے:- میر۔ سودا۔ مرزا قتیل۔ مصحفی۔ میر تقی ہوس۔ سوز۔ رنگین۔ طالب علی خاں عیشی۔ جرأت۔ میر حسن۔ میر خلیق۔ جرکین۔ جعفر زٹلی۔ عرش۔ عاشور۔ میر تقی ترقی چشتی۔ محتشم۔ جعفر علی فصیح مرثیہ گو۔ شاہ یقین۔ شاہ مظلوم۔ مرزا تقی خاں ہوش۔ محشر ریختی گو۔ عیسی خاں تنہا۔ میر ریشتہ۔ غیور۔ حیران۔ بقا۔ شیخ الٰہی بخش معروف۔ فغاں۔ غلام مصطفیٰ یکرنگ۔ میر فرزند علی موزوں۔ میر حیدر علی حیراں۔ شمس الدین فقیر۔ وغیرہم۔ انکے علاوہ بہت سے اصحاب پہلے سے فیض آباد پہنچے ہوے تھے۔ جیسے علامہ سراج الدین علیخاں آرزو۔ میر غلام حسین ضاحک۔ میر ضاحک کے بیٹے وغیرہ وغیرہ + مختصر یہ کہ صرف اُردو ہی دلی سے لکھنؤ نہیں آئی بلکہ اسکے استاد بھی اسکے ساتھ آئے + ان حالات میں لکھنؤ میں اُردو کا بگاڑنے والا کون تھا۔ یہ اگر ہونگے تو وہی جو دلی سے اُردو لائے تھے یا انکی علمی اور ادبی اولاد + ایک مصحفی ہی کو لیں تو تسلیم کرنا پڑیگا کہ

اسوقت بھی کم سے کم آدھا لکھنؤ اس مرحوم کے چشمۂ شاعری اور سلسلۂ تلمذ سے فیضیاب ہے۔ متاخرین میں سے مشاہیر لکھنؤ مثل امیر و جلال مرحوم کی نسبت ثابت کیا جاتا ہے کہ وہ دلّی کے طرز اور رنگ کے متبع تھے۔ عہد حاضر کے مشاہیر شعرائے لکھنؤ اور اُنکے زیر اثر طبقے کے کلام پر نظر استیعاب ڈالی جائے تو ظاہر ہوگا کہ اُن میں سے کوئی بھی دلّی کی شاعری کے مسلک سے ہٹ کر نہیں چلتا۔ حضرات حفیظ۔ وفا۔ حسرت۔ فانی۔ سرور۔ چکبست۔ نظم۔ محشر۔ ثاقب۔ صفی اور عزیز وغیرہم کا کلام آپ سنے دیکھا ہے اور روز دیکھتے ہیں۔ حضرت عزیز کے تذکرہ میں لکھا گیا ہے کہ:-

"بالآخر لکھنؤ بھی اس رنگ سے متاثر ہوا۔ اور وہاں کے شعرا میں چند لوگوں نے اس رنگ میں سخن گستری شروع کی۔ چنانچہ عزیز لکھنوی جو اس گروہ کے پیشرو ہیں کہتے ہیں:-

کہتے ہیں ریختہ کو جو اس طرز میں عزیزؔ
کچھ اور لوگ شہر میں اک ہمیں نہیں

(غالباً ثاقب۔ صفی اور محشر کی طرف اشارہ ہے) لیکن ان لوگوں میں عام طور پر عزیز لکھنوی سب سے زیادہ مشہور ہیں اور اُن کا کلام اول سے آخر تک دلّی کے رنگ کا ایک عمدہ نمونہ ہے" [۱۲]

حضرت آرزو کے تذکرے میں لکھا گیا ہے کہ:-

"جلال کے مشہور تلامذہ میں اسوقت سید انور حسین آرزو لکھنوی نہایت شہرت حاصل کر رہے ہیں بلکہ دلّی کے جس رنگ کو انکے اُستاد نے رامپور میں اختیار کیا تھا اسکو اس قدر ترقی دی ہے کہ اب اُنکا شمار دَورِ جدید کے شعرا میں کیا جاتا ہے" [۱۳]

جو رائیں ابھی اقتباس کی گئی ہیں اُن سے بہت ممکن ہے کہ ہر شخص کو کلی اتفاق نہ ہو لیکن اس امر واقعہ سے تو کسی کو انکار نہ ہوگا کہ زبان اور شاعری سے متعلق دلّی اور لکھنؤ کے باہمی اختلافات بہت سے دُور ہوگئے ہیں اور باقیماندہ سُرعت سے رخصت ہو رہے ہیں + اِن حالات میں امید ہے آپ بھی ہمنوا ہونگے کہ جو لوگ دلّی سے لکھنؤ کو الگ دیکھتے ہیں اُنکی نظر کا قصور ہے۔ اور جو جان بوجھ کر علٰحدگی کا اعلان کرتے ہیں وہ نہ لکھنؤ کے خیرسگال ہیں نہ اُردو کے بہی خواہ + یہ اپنی اپنی ڈفلی اور

---

۱۲ شعرالہند۔ حصہ اول صفحہ ۳۰۴

۱۳ " " " ۳۲۸

اپنے اپنے راگ کا موقع نہیں۔ واقعات کے استبداد اور زمانہ کی رفتار کی شدت کا کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا + اُردو جب لال قلعہ اور شاہجہان آباد کی شہر پناہ سے نکلی تب ہی اس نے اپنا پروگرام بنا لیا تھا - اب آپ یا میں یا کوئی یہ شان نہیں رکھتا کہ اس میں تخرجہ تقسیمیہ کر سکے - اُردو ہم سب کی زبان ہے - ہم پہلے ہندوستانی ہیں اور پھر دہلوی یا لکھنوی + ہمارا فرض ہے کہ اُردو کے نئے مقبوضات اور نو آبادیوں کا ٹھنڈے دل سے کیا صدق دل سے خیر مقدم کریں اور اقصائے ملک کے کسی گوشہ میں بھی اُردو کی ترویج و ترقی کو اپنی ترقی تصور کریں - حقیقت میں دلی اور لکھنؤ ایک چنے کی دو دالیں ہیں اب اس میں باڑہ کے چاول بھی آ ملے ہیں - یہ قبولی دلی اور لکھنؤ کو قبول کرنی پڑیگی + اس ضمن میں آج آپ سے ایک بات کہنے والا ہوں جو خوف ہے کہ مبادا بعض طبائع کو ناگوار گزرے - "الحق مرّ" بزرگ کہہ گئے ہیں - کوئی صاحب یہ نہ خیال فرمائیں کہ میری مبادرت بھی عجیب و غریب ہے کہ لکھنؤ کی سرزمین پر کھڑا ہو کر لکھنؤ سے گھار لڑنے کو آمادہ ہوں ——— وہ بات ہے پنجاب کے متعلق + میں اپنی جیب میں پنجاب کا وکالت نامہ نہیں رکھتا - نہ یہاں آج اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کے نازک اور حساس قلوب کو ناگوار تاثر کا نشانہ بناؤں - لیکن اُردو کی محبت مجبور کرتی ہے کہ آپ سے آپ کے طرز تنقید اور لائحہ عمل کی ترمیم کی سفارش کروں + یہ ایک بے نقاب واقعہ ہے کہ لکھنؤ اور متبعین لکھنؤ کا سلوک پنجاب کے شعرا اور مصنفین کے ساتھ ایسا نہیں جیسا کہ ہونا چاہیے - میں صرف اتنا کہوں گا کہ صاحب شعر الہند کے ہاں بھی جہاں بھولے سے پنجاب کے کسی شاعر کا نام قلم سے نکل جاتا ہے تو وہ تذکرہ تشنہ رہ جاتا ہے + معاف فرمائیے یہ ادا مین کچھ مستحسن نہیں - نہ اس سے اُردو کی خدمت ہوگی نہ پنجاب کی زبان کی اصلاح - آپ پہلے دہلی اور لکھنؤ کی اُردو پر نظر ڈالیں اسکے بعد پنجاب کی زبان پر قلم اُٹھانے کا عزم فرمائیں - آپ نے اگلے زمانہ میں زبان اور شاعری کے ساتھ کیا شوخیاں تھیں کہ نہ کیں اور اِسوقت آپ کیا کر رہے ہیں اور کہاں سے بول رہے ہیں + اسی طرح پنجاب کا حال سمجھیے + اگر پنجاب میں بدعنوانیاں اور بے اعتدالیاں ہیں تو اپنی نظیر سے انکی نفی کیجیے + آپ ایک خط کو چھوٹا کرنے کے لیے اسے مٹانا چاہتے ہیں - میں کہتا ہوں اسکے برابر ایک خط اور اس سے بڑا کھینچ دیجیے وہ خود ہی چھوٹا ہو جائیگا - ظرافتاً جرائد اور تحریروں کو جانے دیجیے جناب منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی جیسا ادیب بھی پنجاب پر دست شفقت بڑھائے بغیر نہ رہ سکا - یہ مانا کہ غصہ اُنکو اصل میں نواب حیدر یار جنگ پر تھا برس پڑے بیچارے پنجاب پر - فرمایا ہے :—

"میرے خیال میں یہ بات آئی ہے کہ حضرت طباطبائی کو حیدرآباد کے طویل قیام نے
لکھنؤ کی بول چال سے کچھ بیگانہ کر دیا ہے .... سنسنی خیز اور رہائش وغیرہ
سے بحث فضول ہے۔ یہ جہلا کے تراشے ہوئے ہیں۔ فصحا انکا استعمال نہیں کرتے
اس قسم کے لچر الفاظ کا ایجاد اکثر پنجاب سے ہوا ہے جہاں کی اُردو بہت خام ہے"[۱]

اکثر اصحاب یہاں ایسے ہونگے جو اس رسالے کے اوس حصہ میں جس کا تعلق پنجاب سے ہے منشی صاحب کے ہمنوا ہوں + وہ کوئی صاحب ہوں میں پوچھتا ہوں کہ اگر سنسنی خیز (رہائش کا ذکر بعد میں آئے گا) لچر لفظ ہے اور جہلا کا تراشا ہوا ہے تو اون سیکڑوں الفاظ کی نسبت کیا ارشاد ہے جو یہی یا ایسی ہی صرفی حیثیت رکھتے ہیں؟ انکے تراشنے والے کون تھے؟ وہ کتنی مدت تک لچر اور جاہلانہ ایجاد سمجھے جاتے رہے اور کب فصحائے اودھ نے فصاحت کی سلطانی مُہر ثبت فرمائی؟ جلال مرحوم کے سرمایۂ زبان اُردو اور مولوی سید محمد مغفور کے فرہنگ آصفیہ کو ایک دوسرے کے برابر رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ سیکڑوں اسی وضع اور اشتقاقی حیثیت کے لغات اُردو میں داخل ہیں جیسا سنسنی خیز ہے۔ یہ لمبی فہرست پیش کرنا طول امل ہے۔ گاڑی بان اور رتھ بان کو آپ بھول گئے ہونگے کیونکہ اب تانگہ اور فٹن - ریل اور موٹر کا زمانہ ہے لیکن پتلون اور کوٹ کی آشنائی کے باوجود بھی چوڑیدار پاجامہ اور فوق البھڑک دھاریدار اچکن پر اب بھی کبھی کبھی آپ کی نظر عنایت ہوجاتی ہے سمجھدار آدمی سے زیادہ کہنا دیوانہ پن ہے + ہاں نہ شوق مرحوم کہہ سکتے تھے اور نہ حضرت طباطبائی کہہ سکتے ہیں کہ دہلی اور لکھنؤ اس لفظ کی لچریت اور جاہلیت سے مبرا ہیں۔ میں جانتا ہوں آپ شہادت طلب کیے بغیر نہ رہیں گے۔ رسالوں اور اخباروں کا نام لینا اور پھر ایسے سلسلہ میں آپ جانتے ہیں جان جوکھوں نہیں تو جان جوکھوں کا کام ضرور ہے۔ مگر آپ کی آسانی کی خاطر میں یہ بھی گوارا کرنے کو تیار رہوں۔ ملاحظہ کیجیے + اودھ کے قدیم دار الخلافہ یعنی فیض آباد کا اخبار پیغام اس لغت کی نسبت کیا رائے رکھتا ہے۔ ۱۶- نومبر ۱۹۲۶ء کی اشاعت کے صفحہ ۴ کالم ۱ میں ایک جلی عنوان ہے "ایک سنسنی خیز مقدمہ" "بیوی کی عصمت شوہر نے فروخت کی"۔ پھر اس مقدمہ کے کوائف اس طرح درج ہیں:-

"گرگام پولس نے مسٹر ڈی - این - ڈی کھنڈالا والا چہارم پریسیڈنسی مجسٹریٹ
(بمبئی) کی عدالت کے سامنے ۲۹- اکتوبر کو ایک عجیب و غریب دردناک اور

---

[۱] رسالہ صبح امید - لکھنؤ - بابت دسمبر ۱۹۱۹ء صفحہ ۳۰ - ۳۱ +

سنسنی خیز مقدمہ کا انکشاف کیا" (مترجمہ از ہندوستان ٹائمس)

اخبار مذکور نے اس خبر کے ماخذ کا پتا بھی دیدیا ہے یعنی اس خبر کو دہلی کے اخبار ہندوستان ٹائمس سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ لہذا پنجاب کے کسی اردو اخبار سے نقل نہیں کیا گیا۔ یہ بھی ذہن نشیں رہے کہ دہلی کے اخبار کی طرح جس کا اقتباس پہلے آچکا ہے یہ لچر ترکیب صرف عنوان میں نہیں آئی بلکہ یہاں متن عبارت میں بھی واقع ہوئی ہے۔ اب اپنی دوسری طرف نظر ڈالیے۔ کانپور کے اخبار آزاد مورخہ ۱۸۔ نومبر ۱۹۲۶ء میں لکھا ہے :-

"جہاز تملیا میں سنسنی خیز قتل"

زمانہ اور آزاد کے اڈیٹر بابو دیا نرائن صاحب نگم کی ادبی حیثیت کسی ثبوت یا شہادت کی محتاج نہیں۔ پیام کے اڈیٹر قاضی محمد حامد صاحب حسرت سے مجھے تعارف کا اعزاز حاصل نہیں ممکن ہے کوئی صاحب یہ کہہ نکلیں کہ یہ سب لوگ بیرونی ہیں۔ شہری نہیں۔ کل کی بات ہے منشی سجاد حسین صاحب مغفور کو کاکوروی اور مولانا عبد الحلیم شرر صاحب مرحوم کو گرسوی کہہ کر انکی زبان اور تنقید زبان کو غیر مستند قرار دیا گیا تھا اسی طرح ممکن ہے ان اصحاب کی زبان کو بھی ویسا ہی بتایا جائے۔ لیکن ایک لشکر کا قلب کیونکر مستحکم رہ سکتا ہے جب اسکے یمین و یسار متزلزل ہوں۔

رہائش کی نسبت یہ گزارش ہے کہ جناب مولوی محمد بدر الدین صاحب وکیل ہائیکورٹ مراد آباد نے ایک سال کے قریب گزرا ایک کتاب شائع کی ہے جسکا نام ہے مرقع کالج۔ یہ کتاب مراد آباد کے نیر اعظم کے دفتر سے مل سکتی ہے۔ اسکے صفحہ ۹ پر مولوی صاحب موصوف لکھتے ہیں :-

"یحیی پارک (ذیلی پارک) امیر ہو یا غریب لیکن رہائش میں بے پرواہ ہو"

اب فرمائیے یہ لفظ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ثقہ آدمی کی زبان پر کہاں سے آیا۔ سیوہارہ کے سوموسے جو مولوی صاحب کا مولد و منشا ہے یا علی گڑھ کے کالج سے جہاں ہندوستان کے ہر حصہ کے نوجوان تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں۔

اب ذرا علی گڑھ کے نوطلوع سہیل کی طرف نظر دوڑائیے۔ تو "سنسنی خیزی" کا "مزید مواد" تیار ملے گا۔ جلد ۱۔ شمارہ ۳۔ ستمبر ۱۹۲۶ء کے رسالہ میں بائیکاٹ کے سرنامہ اس صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"طرز رہائش میں سادگی اور ارزانی کی خصوصیات نمایاں تھیں" [۵]

آگے چل کر لکھتے ہیں :-

---

[۵] رسالہ سہیل۔ علی گڑھ بابت ستمبر ۱۹۲۶ء۔ صفحہ ۲ کالم ۲ سطر ۱۴۔

"یہ خطہ اہل ہنود کے دیوتا مہادیوجی کا مقام رہائش کہا جاتا ہے"[۱۶]

کوئی یہ کہے تو کہے کہ جناب مولانا رشید احمد صدیقی صاحب کا فرض نہ تھا کہ جہاں اُنھوں نے بابو صاحب کے بعض خیالات سے اختلاف رائے کا اظہار کیا تھا اُنکی زبان بھی صحیح کر دیتے۔ لیکن قرینہ یہ بتاتا ہے کہ مولانا زبان کی توسیع کے حامی ہیں کیونکہ "ارباب میگزین" اور "سمجھ دایان" جیسی ترکیبیں وہ خود لکھ جاتے ہیں[۱۷] اور اس امر میں وہ مولانا عبدالسلام صاحب کے ہم مشرب معلوم ہوتے ہیں جنھوں نے لکھا ہے :۔

"اُردو زبان کے شعرا میں اگرچہ مختلف اساتذہ میں ڈراما نویسی کی اعلیٰ قابلیت موجود تھی"[۱۸]

اب میں اس بحث کو ختم کرتا ہوں یہ کہہ کر کہ رہائش کا لفظ حیات النذیر میں بھی آیا ہے + آپ نے پنجاب کی لچر اور جاہلانہ تراش کا معجزہ ملاحظہ فرمایا + میں یہ نہیں کہتا کہ ہر اہل زبان کا فرض ہے ان الفاظ کا استعمال کرنا بلکہ میرا قول یہ ہے کہ جب ہم انکے مقابلہ میں بہتر اور افصح الفاظ اس نفس معنی کے حامل پیش نہیں کر سکتے تو چپ رہیں۔ اگر ان میں کچھ جان ہے تو یہ خود ہی اپنی ہستی ہم سے منوا کر رہیں گے ورنہ اپنے اور سیکڑوں بھنسوں اور خواجہ تاشوں کے ساتھ جو دلی اور لکھنؤ کے گورغریباں میں دبے پڑے ہیں یہ بھی سپرد زمیں ہو جائینگے لیکن انکی وجہ سے پنجاب کو جہالت۔ لچریت اور خامی کے تمغے عنایت کرنا معقولیت کی حد سے خارج اور نازیبا ہے +

اب میں صرف چند الفاظ طرز تنقید سے متعلق عرض کروں گا + تنقید اگر نیک نیتی اور ہمدردی سے محرک ہوا اور اسکی غرض و غایت زبان اور ادب کی خدمت ہو تو شاید اس کا درجہ اصلاح سے بڑھ چڑھ کر ہے + انگریزی شاعری کی تاریخ سے میں ایک بات بتاتا ہوں جو نہایت سبق آموز ہے۔ لکھا ہے کہ جب لارڈ ٹینی سن کی نظموں کا پہلا مجموعہ نکلا تو ایک نقاد لاکھارٹ نے کوارٹرلی ریویو مطبوعہ اپریل ۱۸۳۳ء میں اُسپر نظر انتقاد ڈالی + یہ تبصرہ اگرچہ کہیں کہیں ذرا تیز اور سخت تھا لیکن اس سے ٹینی سن جو بعد میں انگلستان کا ملک الشعرا بنایا گیا نہایت مستفید ہوا۔ دس برس تک اُس نے اپنا ایک شعر بھی مطبع میں نہیں بھیجا اور لوگ یہ سمجھے کہ اُسکی شاعری لاکھارٹ کی تنقید

---

۱۶ رسالہ سہیل۔ علی گڑھ۔ بابت دسمبر ۱۹۲۶ء۔ صفحہ ۹۰۔ سطر ۱۶ (حاشیہ)

۱۷ دیکھو رسالہ مذکور کے شذرات۔ صفحہ ۱۰ ۔ ۱۲ +

۱۸ شعر الہند، حصہ ۲۔ صفحہ ۱۸۴۔ سطر ۱۵ +

کی نذر ہو چکی۔ لیکن یہ ہونہار شاعر اچھے شعرا کے کلام اور فن کی کتابوں کے مطالعہ میں مصروف تھا اس طرح اپنی تمام خامیاں دور کر کے دس برس بعد جب وہ ملک کے سامنے اپنی نئی نظم لیکر آیا تو اسی کو اوڑلی ریویو نے اس پر صاد کیا۔ میں پھر کہوں گا کہ تنقید و تبصرہ شفیق استاد کی اصلاح سے کم فیض رساں نہیں۔ لیکن اسکی محرک مصنف سے ہمدردی اور ادب کی خدمت ہونا چاہیے نہ کہ مصنف کی تضحیک اور اسکی شہرت کی پامالی۔ خلاصہ یہ کہ یہ مان کر کہ نقد و نظر کے بغیر کوئی زبان کوئی لٹریچر پختہ نہیں ہو سکتا اور ترقی نہیں کر سکتا مجھے یہ کہنے کے لیے معاف فرمایا جائے کہ اس بارے میں آپ کا طرز عمل کچھ ایسا ہو چلا ہے جس سے لوگوں کو شک ہونے لگا ہے کہ آپ شہر لکھنؤ سے باہر (دلّی کا اس بحث سے کوئی واسطہ نہیں) کسی کے کلام کو مقبول اور سرسبز ہوتا دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے۔ یہ امر واقعہ ہے یا نہیں اس سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے لیکن میں نہایت خلوص دلی سے عرض کروں گا کہ اس یقین یا شک کا عام ہو جانا اور ان لوگوں کے دلوں میں جنھیں استحقار سے بیرونی کہا جاتا ہے اس کا جاگزیں ہو جانا نہ آپ کی شان کے شایاں ہے نہ اردو کے حق میں مفید۔ اس میں کیا خوبی نکلی کہ جہاں آپ کا نام آیا اور ہر شخص کی زبان پر یہ شعر جاری ہو گیا

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

لکھنؤ نے اردو کی کیا خدمات کیں، یہ نہایت اہم مسئلہ ہے۔ اس پر ابھی تک پورا غور نہیں ہوا۔ اور نہ فراخدلی سے بحث کی گئی ہے۔ دلّی کی شاعری شاہ نصیر کے اخیری زمانہ سے جبکہ وہ سنگلاخ زمینوں کی بھول بھلیاں میں پڑ گئے فرسودہ اور پژمردہ ہونے لگی تھی۔ اگرچہ درد اور اثر کا عنصر اس میں کم نہیں ہوا تھا لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے شاعری کی غرض و غایت اگر گُل و بلبل اور رنگیا چوٹی نہیں تو محض رونا دھونا بھی تو نہیں۔ اس درد کے پھیر میں وہ مجسم درد بنگئی تھی بقول خواجہ میر درد۔ ع

"ہوں میں لفظ درد جس پہلو سے الٹو درد ہے"

اگرچہ دلّی کے اساتذہ ثلاثہ یعنی مومن۔ ذوق اور غالب دلّی کے نام اور شان کو سنبھالے رہے۔ بقول کیہ ہاتھی لٹے گا بھی تو لاکھ تک؟ لیکن لٹنا شروع ہو گیا تھا۔ زبان میں عوامیت اور شاعری میں افسردگی آنے لگی تھی کہ لکھنؤ کی جدت طرازیوں اور شاہیات نے اس میں نئے سرے تازگی کی روح پھونکی۔ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ تا سخ کے رنگ سے غالب اور مومن نسبتاً

کم اور فوق زیادہ متاثر ہوئے بلکہ یہ کہنا شاید درست ہو کہ اس تاثر سے متاخرین میں شاید ہی کوئی بچا ہو جس نے دلی کی شاعری کی زبان اور اسلوب میں تغیر عظیم پیدا کر دیا۔ یہ تغیر خواہ خود زبان کا ایک ترکیبی فعل تھا یا اسکی علت مستقیم لکھنؤ سے تقابل تھا۔ یہ کچھ بھی ہو لیکن اسکو تسلیم کر کے بھی کہ یہ تاثر پالے جو چاہو کہو محض عارضی نہ تھا ماننا پڑیگا کہ اپنا رنگ جمائے بغیر نہ رہا۔ حسیات اور فصاحت جو اب تک دلی کی شاعری کے در و بست مالک تھے انھوں نے جذبات اور بلاغت کے لیے جگہ نکالی۔ داخلی مضامین کی فہرست از سر نو ترمیم کی گئی۔ اور مومن۔ شیفتہ۔ غالب۔ مرزا نسیم۔ انور۔ ذکی وغیرہم نے وہ نیا رنگ پیدا کیا جو اردو کے منہ پر خوب کھلا اور آخر کل ہندوستان پر چھا گیا۔ یہ سب لکھنؤ کی بدولت ہوا۔ تفصیلات کا ذکر محض طوالت ہے لیکن میں یہاں قریب کے گذشتہ عہد کے چند اصحاب کے نام گناؤں گا جن کی خدمات کے احسان سے اردو زبان اور انشا سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ میں آگے کہہ آیا ہوں کہ جس جماعت میں مرد اور عورت الگ الگ رہتے ہیں اس میں ثقہ ظرافت کا وجود دشوار ہے۔ منشی سجاد حسین مرحوم نے اودھ پنچ نکالکر اردو دنیا کو سکھایا کہ مستحسن ظرافت بھی تہذیب معاشرت کا ایک جزو عظیم ہے اور اسکا نباہ اس طرح ہو سکتا ہے۔ یوں تو جو ہونا ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے لیکن سرسری طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اگر اودھ پنچ کا جنم نہ ہوتا تو اکبر اور سرشار کے لیے دنیا کو نہ معلوم کتنی مدت تک انتظار کرنا پڑتا۔ ان دونوں بزرگوں کے دم سے جو تازگی اور روحانیت اردو نے پائی اسکا اندازہ مشکل ہے۔ انگریزی شاعری کے ایجاد کا سہرا آزاد مرحوم کے سر ہے تو نئی فسانہ نویسی کا طغرائے امتیاز سرشار مغفور کا حصہ ہے۔ فسانہ آزاد اردو نثر میں ایک نیا عہد قائم کرتا ہے جسکا اعتراف ہر ادبی مورخ کا ایمان ہے۔ افسانچہ نویسی کا اختراع بھی لکھنؤ ہی کی طرف سے ہوا۔ جسکے سلسلہ میں منشی پریم چند کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا۔ نئی شاعری یعنی نیچرل شاعری جو عنفوان شباب ہی میں اپنا نیچری لباس اتار کر ملی جامہ پہن چکی تھی۔ شوق قدوائی۔ برق لکھنوی۔ سرور جہان آبادی۔ چکبست لکھنوی اور نادر کاکوروی کے وطنی اخلاقی اور فطری جذبات سے متاثر ہو کر وطنیت اور جمالیات یا لطافت پسندی کا راگ گانے لگی جس طرح اردو افسانہ نویسی یا ناول کے اختراع کا سہرا لکھنؤ کے سر ہے اسی طرح ناٹک کے ایجاد کا طرۂ امتیاز بھی لکھنؤ کا حصہ ہے۔ نواز نامی ایک محمد شاہی شاعر نے شکنتلا اردو میں کہی تھی لیکن امتداد زمانہ اور دلی کے مسلسل سیاسی مصائب نے اسکا نام تو بھی باقی نہ چھوڑا۔ ان صورتوں میں کیا یہ کم فخر کی بات ہے کہ اردو کا پہلا ناٹک جو اسوقت دستیاب ہے لکھنؤ سے

عرصۂ شہود میں آیا۔ امانت مرحوم کی اندر سبھا کو "ڈرامیت" اور اُسوقت کے قواعدِ فن کے اعتبار سے میں اُردو کے بہترین ناٹکوں میں سمجھتا ہوں + دَورِ حاضرہ میں ناٹک اگرچہ اُردو ادب کا ایک مستقل شعبہ تسلیم کرلیا گیا ہے لیکن اس فنِ لطیف کے متعلق کوئی کتاب ناٹک ساگر کے سوا اردو میں لکھی نہیں گئی جو حال کی تصنیف ہے۔ اسکے باوجود بھی نقشِ اول کے ساتھ نقشِ ثانی کا امتیاز بھی لکھنؤ ہی کے حصہ میں آیا + شکسپیر پر اگر کہیں ترقی ہوئی تو لکھنؤ میں۔ جناب سید مہدی حسن صاحب احسن لکھنوی کے ناٹکوں پر تبصرہ کرتے ہوئے گلنار و فیروز عرف بزمِ فانی کے ایکٹ ۳۔ سین ۵ کا شکسپیر کے رومیو جولیٹ کے ایکٹ ۳ سین ۵ کے موازنہ میں مجھے یہ مشاہدہ ہوا کہ حضرت احسن نے شکسپیر پر یقینی ترقی کی ہے۔ ڈرامیت کی نفس مذاقی کا وہ نکتہ اُنکو سوجھا جو شکسپیر کے ہمہ گیر دماغ میں نہ آسکا[۱۹]۔ ان تمام کوائف سے بڑھ چڑھ کر اعتراف کا مستحق وہ نہایت مستحسن اختراع ہے جسکا ظہور لکھنؤ میں مرثیہ کی شکل میں ہوا۔ اُن بزرگوں نے نہ صرف یہ کیا کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو" کے مقولہ اور اسکے اعتقاد کے کفر کو توڑا بلکہ مرثیہ کو کلام کی ایک نہایت اعلیٰ اور اہم صنفِ شعر کی حیثیت دیکر اسکے صدقہ میں اُردو شاعری کو اُس معراج پر پہنچا دیا کہ اور اصناف پر رشک وحسد کا سیاہ بادل چھا گیا۔ اگر میں اس بیان کو یہیں ختم کردوں تو لکھنؤ کی یہ خدمات اُردو کے حق میں کیا کم مہتم بالشان ہیں۔ یقیناً اُنکی گرانمائگی مدح وثنا سے مستغنی ہے۔

آخر میں یہ عرض کروں گا کہ طُرّۂ امتیاز تو اُسی کی دستار کی زینت ہوگا جسنے ماں کی گود میں پہلا لفظ جو سُنا وہ اُردو تھا اور پہلا لفظ جو وہ بولا اُردو تھا لیکن یہ طُرّۂ امتیاز وہیں تک ضوفشانی کرسکتا ہے جہاں تک روزمرہ۔ بول چال۔ چند مقامی رسمیات۔ خصوصی اصطلاحات اور محاورے کا تعلق ہے۔ تصنیف وتالیف کے کُھلے میدان اور حقایق وجذبات کی وسیع دنیا میں اُسکا چراغ جلنا اتنا آسان نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔ اگر ہم نے بالغ نظری اور فراخدلی سے کام نہ لیا اور اسکے ساتھ ہی کچھ کرکے نہ دکھایا تو ہماری وقعت صرف آثارِ قدیمہ کے دفتر کی گوں رہ جائے گی۔ دلّی اور لکھنؤ کی بڑائی اسی میں ہے کہ بڑے بنکر رہیں۔ بڑے کام کرکے دکھائیں اور چھوٹوں کے بڑھنے میں مدد فرمائیں +

برجموہن دتاتریہ کیفی

[۱۹] تفصیل کے لیے دکھیو رسالہ تحریک۔ لاہور بابت اپریل ۱۹۲۳ء

پانچ ناول نگار

(سلسلۂ الناظر ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء)

موازنہ اس مبادی مگر اصولی تفصیل کے سلسلہ میں غالباً اب میں اس قابل ہوگیا کہ اصل موازنہ کی جانب متوجہ ہو جاؤں۔ یعنی الناظر (لکھنؤ) نے چند شرائط پر جو مطالبہ کیا ہے کہ شمس العلماء نذیر احمد ایل۔ ایل۔ ڈی۔ حکیم محمد علیخاں۔ پنڈت سرشار۔ مولوی عبد الحلیم شرر۔ مولوی محمد ہادی رسوا بی اے کے افسانوں (ناولوں) کا مقابلہ کرکے دکھایا جائے کہ ان میں بہترین ناول نویس کون ہے؟ اور اسکی کونسی بہترین تصنیف ہے۔ اسکی مقدور بھر تکمیل آپ کے سامنے پیش کر دوں۔

یہ اطلاع کوئی مہینہ ہوتا ہے کہ "ہزار داستان" کی زبانی مجھے ملی تھی۔ موازنہ میں جس طرح مضمون کو پھیلا کر سمیٹنا چاہیے ظاہر ہے، اس لیے پیٹ کے دھندوں یعنی سرکاری نوکری سے جتنا وقت مل سکا اُس میں حضرات موصوف کے شہ پاروں کو جنھیں مدت ہوئی کہ پہلے کبھی پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا، بہت کچھ تنقیدی نظر سے دیکھنا پڑا۔ فسانۂ آزاد۔ جعفر و عباسہ۔ اُمراؤ جان ادا۔ ملک العزیز ورجنا۔ فتح اندلس۔ منصور موہنا۔ مرأة العروس۔ رویائے صادقہ۔ توبۃ النصوح میرے پیش نظر ہیں۔ میں ان تصانیف کو پڑھ کر ہر سہ اصول مذکورۂ بالا کے لحاظ سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں اُسے ہر مصنف کے احوال کے تحت صرف اصولی حیثیت سے بیان کرتا جاؤں گا۔ اور معاف کیجیے گا، بلا ضرورت تمثیلات کی بھرمار سے بھی اس مضمون کو "داستانِ امیر حمزہ" نہیں بنانی چاہتا! اچھا، آئیے، سب سے پہلے جناب سرشار کو لے لیں، کہ آپ ہی اردو ادب میں فسانہ نگاری کی طرزِ جدید کے مُعرّف سمجھے جاتے ہیں:—

سرشار آپ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی میں خاصی لیاقت رکھتے تھے۔ شاعر تھے اور انگریزی بھی جانتے تھے۔ کچھ دن اودھ اخبار کے اڈیٹر رہے۔ وہاں سے علیحدہ ہوکر اپنا ایک خاص رسالہ تخلصہٗ سرشار نکالا۔ بتقریب حیدرآباد دکن چلے گئے تھے، وہیں انتقال ہوا۔ سیر کہسار، جام سرشار اور فسانۂ آزاد آپ کی معروف تصانیف ہیں۔ ان سب میں سے بہترین فسانۂ آزاد ہے۔

فسانۂ آزاد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگاری کی طرز جدید کے لحاظ سے واقعی یہ پہلی کوشش ہے۔ جس میں بہت کچھ مکالمہ ہے، اور جو بڑی حد تک موجودہ اُردو ناول کے تصور کے لگ بھگ نظر آتی ہے۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے، جو کچھ تو نظم اور کچھ نثر میں لکھی گئی۔ اور اول اول اودھ اخبار میں باقساط سلسلہ سے شایع ہوتی رہی۔ اسٹائل میں لکھنوی لوچ اور اُس زمانہ کا لحاظ کرتے صاف ستھرا ہے۔ لیکن کتاب کو ختم کرنے کے بعد آپ جس چیز کو زیادہ محسوس کریں گے وہ یہ ہے کہ بحالت موجودہ اور اس لحاظ سے بھی کہ آجکل ناول کا صحیح تصور کیا شے ہے اور کیا معنی رکھتا ہے، آپ ایک دم سے اسے ناول کے زمرہ سے خارج کردیں۔ کیوں؟ کہ ناول نگاری کے جو اساسی اصول ہونے چاہییں اور جنھیں بالتفصیل اوپر دکھا چکا ہوں یہ اُن سے بعید کوری ہے۔ مثلاً نہ تو اس میں پلاٹ کی یکسانیت (Unity of Plot) ہے اور نہ تخیلی پیکر ہی پورے پورے پیدا ہوئے ہیں۔ صرف زبان ہی زبان ہے۔ ہاں، اگلے زمانہ کے افسانوں میں ایک نئی چیز ہونے کی حیثیت سے بلاشبہ آگے بڑھی ہوئی اور اپنے رنگ کی پہلی چیز ہونے کی وجہ سے ضرور یادگار ہے، جس میں اُس زمانہ کی سوسائٹی کے مختلف واقعات کو جابجا بکمال تی زبان میں اُجاگر کیا گیا ہے۔

حکیم محمد علی خاں آپ کے توطن کا مجھے پورا پورا علم نہیں۔ دیگر ادبی شغف کا بھی افسوس اس سے زیادہ مجھے علم نہ ہو سکا کہ آپ نے چند ناول لکھے جن میں بہترین ناول "جعفر و عباسہ" خیال کیا جاتا ہے۔

"جعفر و عباسہ" کی بناء تاریخ قرار دی گئی ہے، مگر ہندوستان کی نہیں! یہاں سے کوسوں دور عراق کی۔ جہاں کے اس زمانہ کے پوست کندہ واقعات تو خیر! بڑی چیز ہیں، معمولی طور سے ہی زندہ ہو کر وہ ناول ختم کرنے کے بعد سامنے آجاتے! مجھے خوف ہے کہ باوجود تلاش بھی شروع سے اخیر تک اس قسم کا اہتمام ملنا مشکل ہے۔ حالانکہ اُس زمانہ کی عراقی حالت اور دیگر تمدنی اثرات کو اس طرح گُھل مل کر اُردو میں آنا ضروری تھا کہ اُن سے تاریخی بصیرت حاصل ہوتی۔ ویسے بھی اس تصنیف میں ناول کے جن خصائص کا اوپر ذکر آچکا ہے، صرف پلاٹ تو محبت کی سہانی کہانی کی حیثیت سے ذرا اچھی معلوم ہوتی ہے، ورنہ دوسری خصوصیتیں مثلاً کیرکٹر زیا قوتِ اظہار، دونوں اس قابل نہیں کہ "زندہ" چیز کہی جائیں۔ پھر میں نہیں سمجھ سکتا کیونکر اصلی معنوں میں اسے "ناول" کہا جا سکتا ہے۔ میں غلطی نہیں کرتا تو ایک سمجھدار شخص اسے ایک ایسی جذباتی کہانی کہ سکے گا، جس میں سوائے چند اضطراری "آہ" "واہ" کے کچھ یوں ہی سا اُردو کا چٹخارہ مل جاتا ہے!

مرزا رسوا آپ آجکل حیدرآباد میں تشریف رکھتے ہیں۔ دارالترجمہ سرکار عالی سے بعض تراجم علاقہ ہے: امراؤجان ادا - شریف زادہ - ذات شریف وغیرہ آپکی تصانیف ہیں۔ ان سب میں امراؤ جان ادا بہتر ہے۔

امراؤ جان ادا کے نام کے ساتھ ہی مجھے اناطول فرانس کے ادبی شہ پارہ یعنی "تھائس" کا خیال آ جاتا ہے۔ کثرت فواحش بالکل ادا کی طرح تھائس کو بھی سنجیدگی کی طرف کھینچ لاتی ہے تھائس اور ادا میں یوں دیکھنے کو تو تھوڑا سا فرق نظر آتا ہے، مگر واقع میں بڑا فرق ہے۔ کیوں کہ تھائس باوجودیکہ پرانی اور بدیسی چیز ہے، پھر بھی نہ معلوم کیوں ہمارے روبرو چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔ اسکی ادائیں خواہ مخواہ دل کو بھانے لگتی ہیں۔ برخلاف اسکے ادا دیسی ہے، لیکن جب کبھی سامنے آتی ہے تو بالکل تصویر کی طرح ساکت و صامت سامنے آتی ہے۔ نہیں نہیں، میں نے غلطی کی، بعض وقت اس میں بھی جان کی گرمی محسوس ہوتی ہے، اے دیکھو! وہ تصویر میں حرکت ہوئی! اگر ساتھ ہی جب شوق یہ چاہتا ہے کہ ذرا نظر گڑو دیئے، تو بجائے اسکے کہ ادا کی ادائیں نمایاں ہوں اور برقرار رہیں موہوم ہی ہوتی جاتی ہیں، اور بالآخر پھر وہی تصویر کی تصویر! پاک منش رسوا اور ادا کا یہ راز کچھ سمجھ میں نہیں آیا! رہی قوتِ اظہار، تو نیومن (Newman) کے "صحیح خیال کے لیے صحیح لفظ" والے مشورہ نے کچھ ایسا دماغ خراب کر دیا ہے، کہ جرأت معاف! ایسی ویسی چیز بھاویں ہی نہیں!

شرر آپ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ فارسی عربی کی تعلیم کئی اساتذۂ وقت سے حاصل کی۔ انگریزی اور فرانسیسی بھی جانتے ہیں۔

۱۸۸۰ء میں آپ اودھ اخبار کے اسسٹنٹ اڈیٹر مقرر ہوئے۔ اور اسی زمانہ میں محشر نام ایک ہفتہ وار رسالہ بھی آپ نے نکالا۔ اسکے بعد جنوری ۱۸۸۷ء سے آپ نے ایک ادبی پرچہ دلگداز نامی جاری کیا قیام حیدرآباد (دکن) کے زمانہ میں آپ نے تاریخ سندھ لکھی۔ اور اب اسی ریاست عالی کے ایما سے چار جلدوں میں تاریخ اسلام بھی لکھی ہے۔

آپ کثیر التصانیف ہیں۔ اور آپ کی تصانیف زیادہ تر تاریخی اور عشقیہ ناول ہیں۔ جنمیں سے اکثر سر والٹر اسکاٹ کے چربے اترے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جس طرح والٹر اسکاٹ نے اپنے ہاں کے "عہد کہن" والی سرگذشت کی جانب رجوع کیا اسی طرح مولانا نے بھی اسلامی تاریخ کو گفتگو لانے کے لیے موصوف کو ہندوستان سے باہر کوسوں دور اپنے اکثر ناولوں کی داغ بیل ڈالنی پڑی۔

چیز اچھی تھی اگر اچھی بنجاتی۔ لیکن یا تو اسے ہندوستانی مسلمانوں کی کم بختی کہیے یا ممکن ہے کوئی اور وجہ ہو۔ بہرحال آپ کے تاریخی ناول بھی باوجودیکہ "زندۂ جاوید" لوگوں کے تذکروں سے پُر ہیں، اور حالانکہ آپ نے مقامی رنگارنگی (Local Colours) سے بھی صفحے کے صفحے کالے کیے ہیں، صبح وشام کے بھی اُن میں سماں کھینچے ہیں، لیکن افسوس! زندہ نہیں۔

یہ میں بخوشی ماننے کے لیے تیار ہوں کہ مولانا کی نظر پہونچی دورِ اسلامی عظمت اور گذشتہ صولت کی یادِ ایام ہمارے خونی اثرات میں ہیجان پیدا کرکے ہمیں زندہ کرنیوالی چیز ہے لیکن ساتھ ہی میں یہ ماننے کے لیے بھی تیار نہیں کہ وہاں پہونچکر صرف باتوں باتوں میں ٹالا بھی جاسکتا ہے۔ آج جبکہ صدیوں زمانہ آگے بڑھ چکا تو آپ ہی فرمائیے ہمیں اگلوں سے مُعرِف کرانے کے لیے کیسے زبردست اور ہنرمند شخص کی ضرورت ہوگی۔ یعنی وہ صرف باتیں ہی نہ بنائے بلکہ ہماری روح کو ہٹا کر صدیوں پیچھے لیجائے اور وہاں کچھ اس طرح مصروفِ سیر رکھے کہ نہ تو جی گھبرائے اور نہ بجائے زندوں کے مُردوں سے واسطہ پڑے! اناطول فرانس نے اسی گُر کا تھائس میں عمل کرکے اپنے آپ کو غیر فانی بنایا ہے۔ مولانا بھی اگر اس بات کے شائق ہیں تو خدا کرے آیندہ وہ بھی اسی گُر کو کام میں لائیں اور جیتے رہیں۔

رہے مولانا کے دوسرے عشقیہ اور دیسی افسانے، تو وہ کتخدا نکلنے سے کچھ پہلے سے لیکر بیس بائیس برس تک مشقِ محبت کا کام دیتے ہیں، جہاں نشۂ شباب میں مردہ زندہ اور اچھے بُرے کی تمیز ہی نہیں ہوتی!

شمس العلما مولانا نذیر احمد

"آپ نواح نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ گو سِن تمیز کو پہونچنے کے بعد برابر دلّی ہی میں رہے۔ فارسی عربی کے علامہ تھے۔ انگریزی، سنسکرت اور تلنگی بھی بقدرِ ضرورت پڑھی تھی۔ کچھ دنوں سرکارِ انگریزی کی ملازمت میں رہے اور یہیں چند قانونی کتابوں کا ترجمہ کرکے یہ انعام پایا کہ ڈپٹی کلکٹر ہوگئے۔ پھر نواب محسن الملک بہادر اور نواب عماد الملک بہادر کی تحریک سے سرسالار جنگ اول نے انھیں حیدرآباد بلاکر جلیل القدر عہدہ پر فائز فرمایا۔ چنانچہ یہیں سے پنشن لی اور دلّی جاکر بعارضۂ فالج انتقال فرمایا۔

آپ نے بہت سی مفید کتابیں لکھی ہیں جو عام و خاص سب میں مشہور و معروف ہوئیں ان میں سے مرأۃ العروس شہ پارہ ہے، جسکا اب تک کئی زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

مرأۃ العروس کی غایت تصنیف اُن ذمہ دار ہستیوں سے دو دو باتیں ہیں جو آگے چل کر ملک و قوم کی مائیں بنتی ہیں۔ چنانچہ خود فاضل مصنف نے اس خیال کو دیباچہ میں ظاہر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:—

"ہم مردوں کی دیکھا دیکھی لڑکیوں کو بھی علم کی طرف ایک خاص رغبت ہے۔ لیکن اسکے ساتھ ہی مجھ کو یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ نرے مذہبی خیالات بچوں کے مناسب حالت نہیں۔ اور جو مضامین اُنکے پیش نظر رہتے ہیں، اُن سے اُنکے دلوں کو افسردگی، اُن کی طبیعتوں کو انقباض اور اُنکے ذہنوں کو کُندی ہوتی ہے۔ تب مجھکو ایسی کتاب کی تلاش ہوئی جو اخلاق و نصائح سے بھری ہوئی ہو اور اُن معاملات میں جو عورتوں کو زندگی میں پیش آتے ہیں۔ اور عورتیں اپنے توہمات اور جہالت اور کج رائی کی وجہ سے ہمیشہ مبتلائے رنج و مصیبت رہا کرتی ہیں، اُنکے خیالات کی اصلاح اور اُنکی عادات کی تہذیب کرے اور کسی دلچسپ پیرایہ میں ہو جس سے اُن کا دل نہ اُکتائے طبیعت نہ گھبرائے، مگر تمام کتبخانہ چھان مارا ایسی کتاب کا پتہ نہ ملا پر نہ ملا۔ تب میں نے اس قصہ کا منصوبہ باندھا——"

غرض یہی منصوبہ تھا جسے آپ قصہ کی داغ بیل (پلاٹ) تصور فرما لیجیے۔ اسکے بعد مولانا کو جس بات کا خیال ہوا اور جو اصغری اکبری جیسی ادبی بیبیوں کی درازی عمر کے لیے یقیناً ضروری ہے یہ تھا:

"جو کچھ وقت اس کتاب کی تصنیف میں صرف ہوا، اسکے علاوہ مدتوں یہ کتاب اس غرض سے پیش نظر رہی کہ بولی با محاورہ اور خیالات پاکیزہ اور کسی بات میں آورد اور بناوٹ کا دخل نہ ہو——"

زبان اور قصہ کی لطافت کے لیے اسکے علاوہ بھی اور بیسیوں ادبی سربرآوردہ حضرات کی رائیں موجود ہیں، لیکن رائوں ہی کی کیا ضرورت ہے جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنی بقا کا خود آپ ضامن ہے۔ اردو بولنے والی ادبی دنیا میں اگر آپ مبالغہ نہ سمجھیں اور ٹھنڈے دل سے سوچ کر فیصلہ فرمائیں تو میرا خیال ہے یہی اب تک ایک فاضل وادیب مصنف اس لائق ہیں کہ کم از کم بحیثیت زندہ ناول نگار ہی مدتوں زندہ رہیں گے۔

رہیں ناول کی ادبی ہستیاں، تو مولانا کو جہاں جس ہستی کی طینت اُبھار کر دکھانی مقصود تھی، مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پوری پوری کامیابی کے ساتھ وہ اُسے اُبھار کے دکھا سکے۔ پھر ہر ہستی اپنے رنگ میں جدا ہے۔ اور بلا تصنع اُس سے اچھا یا بُرا اثر دل میں پیدا ہوتا ہے۔

ناول کی ہیروئن اصغری ہی کو لے لیجیے۔ دلّی کے کسی شریف خاندان کی مدتوں زندہ رہنے والی ایک شریف نیک بخت معلوم دیتی ہے۔ کیرکٹر کے ضمن میں میں نے اس کا احوال جناب خاں صاحب کی زبانی آپ کو سنا دیا ہے۔ صاحب موصوف نے اس سے زیادہ بھی بہت کچھ کہا سنا ہے۔ آپ اکتا نہ گئے ہوں تو کچھ اور سناؤں؟ سچ یہ ہے جس سلیقہ اور خوبصورتی سے جناب خاں صاحب نے اصغری کا ذکر فرمایا ہے، بار بار اسے سننے کو جی چاہتا ہے۔ فرماتے ہیں:—

"ہم اپنے ہمجنسوں کو دَوران زندگی میں دیکھتے بھالتے ہیں۔ اُن میں اپنے گھر والے، رشتہ ناتہ والے، دوست احباب، ملنے جلنے والے بھی ہوتے ہیں، جن سے ہمیں زیادہ ملنے جلنے کا موقع ملتا ہے۔ اور ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جن سے سرسری شناسائی یا عارضی روشناسی ہو جاتی ہے۔ یہ جتنی صورتیں ہم دیکھتے ہیں اُن میں سے بعض واضح اور گہری، بعض موہوم اور سطحی ہمارے تخیل کے صفحات پر مرتسم ہو جاتی ہیں۔ موہوم سی صورتیں اگرچہ وہ گوشت پوست والے چلتے پھرتے انسانوں کی سی کیوں نہ ہوں، بسا اوقات ہمارے تخیل کے صفحہ پر سے اُڑ جاتی ہیں۔ اب اس قوت کو ملاحظہ کیجیے، کہ کسی شخص کا سرے سے گوشت پوست والا وجود ہی نہیں، مگر ایک خلّاق دماغ اپنے تخیل کے جادو سے اُس کی تصویر کھینچتا ہے۔ اور اصغری بالکل ایسی معلوم دیتی ہے کہ گویا کسی اپنے رشتہ کی دیکھی بھالی ہوئی کا نقشہ سامنے رکھا ہے۔"

اس بیان سے تخیل کی دو صورتیں ظاہر ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ آپ نے ایک اصلی انسان کو دیکھا اور اس طرح کافی غور سے دیکھا کہ جب اسکی صورت بھی سامنے نہ ہو، وہ موجود بھی نہ ہو تو اُسوقت بھی آپ کا تخیل دماغ میں اُسکی صورت پیش کر سکتا ہے۔ تخیل کی دوسری قوت یہ ہے کہ مولانا نذیر احمد نے ایک فرضی عورت کو تخیلی پیکر دیا اور اس طرح دیا کہ انکے الفاظ نے آپ کے تخیل کے پردہ پر بھی بن گوشت پوست والی ہستی کے باوجود بھی ایک ایسی تصویر کھینچ دی جیسی آپ نے کسی خاص عزیز قریب یا مخلص دوست کی صورت دیکھی ہو، جس سے آپ بے تکلف ملتے جلتے ہوں، جسکے دل کی باتیں آپ پر روشن ہوں، جسکے رجحان اور جذبات سے آپ بخوبی واقف ہوں اور آپ کے دماغ پر سے یہ تصویر ایک دفعہ کھینچنے کے بعد پھر کبھی محو نہیں ہو سکتی۔

خاتمہ

غرض مولانا کے سلسلۂ واقعات میں جو کچھ اوپر عرض کیا گیا یہ، اور دوسرے چاروں حضرات والے مطالب اگر ایک مرتبہ اور میری خاطر آپ دماغ میں مستحضر فرما لیں، تو میں سمجھوں گا، محنت ٹھکانے لگی۔ کیونکہ اُن سب مطالب کے پیش نظر کرتے ہی یہ اپنے آپ صاف ہوا جاتا ہے کہ میدانِ "ناول نگاری" اِن پانچوں میں اصولاً اور انصافاً کس کے ہاتھ رہنا چاہیے، اور کچھ عجب نہیں جو نتیجہ اخذ کرتے کرتے بساختہ آپ یہ کہہ اُٹھیں:

"اِتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا!"

اچھا تو آپ نے ان چاروں بزرگوں کے مذکورۂ بالا اہم واقعات کو سوچ لیا؟ یعنی یہی کہ اُنھوں نے ناول لکھے، بعض نے کثرت سے لکھے۔ جن کی اچھی اچھی داغ بیل تھی، زبان بھی پیاری پیاری تھی۔ ان میں تاریخی اور سماجی باتیں بھی تھیں۔ "بادۂ محبت" کا سرور بھی خاصا شامل تھا۔ اب یہ اور اسی قسم کی اور باتوں کو آپ مولانا نذیر احمد کی خصوصیات افسانہ سے تطبیق دیجیے۔ تطبیق دینے کے ساتھ ہی آپ کو نمایاں طور سے معلوم ہو جائے گا کہ مولانا کے ہاں سب سے جداگانہ ایک چیز "تخیلی پیکروں" کی چلت پھرت ہے۔ گویا اُنکی ادبی ہستیاں زندہ ہیں۔ جنکی "ہزاری" عمریں ہیں! باقی رہے اور چار حضرات، تو اُنکی تصانیف میں بھی آپ کو ادبی پتلے ملیں گے، لیکن مٹے مٹے، اور اکثر تو آپ یہ محسوس کریں گے کہ ناول ختم کرنے کے بعد گویا آپ نے نفس کی سلیٹ پر کچھ اس قسم کے لٹریچر کا پانی چھڑک دیا تھا کہ سانس کے جھونکے اُسے منٹوں میں ہوا کیے دیتے ہیں!

اب آپ ہی فرمائیے ناول نویسی کا سہرا کس کے سر سجا؟ کیونکہ پلاٹ اور زبان وغیرہ تو ناول میں اضافی چیزیں ہوتی ہیں، جن کی خوبی سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہے۔ ناول میں در اصل جو بڑی اور سب سے بڑی چیز ہے وہ پیکروں کا پیدا کرنا ہی ہے۔ اور پھر یہ جتنے نفسیاتی حیثیت سے گہرے ہوتے جائیں گے خود ایک اَن مٹ چیز بنکر اپنے خلاق دماغ کو غیر فانی بناتے جائیں گے۔ جب یہ چیز مولانا نذیر احمد میں کوٹ کوٹ کر بھری پڑی ہے: تو آئیے پھر یہ سہرا مولانا نذیر احمد ایل ایل ڈی ہی کے سر باندھ دیں! اور یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، اُسے اظہار واقعات کا صرف زور ہی زور نہ سمجھیے، آج شکسپیر بھی اپنے پلاٹ اور زبان کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف ادبی ہستیوں کی زندگی سے زندہ چلا آتا ہے!

میں نے موازنہ ختم کر دیا۔ ادبی بددیانتی ہو گی اگر میں مضمون کو بھی محترمی جناب

محمد عظمت اللہ خاں صاحب کا دلی شکریہ اور ایک روشن خیال "افادی الاقتصادی" جناب ایم مہدی حسن صاحب مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کیے بغیر ختم کر دوں۔ آپ حضرات سے جو قابل قدر مدد ملی وہ مضمون میں موجود ہے۔ جناب مہدی مرحوم نے تو مولانا کو مصنفین [illegible] صفِ اول میں جگہ دی تھی، جو یقیناً بہت صحیح خیال ہے۔ [illegible] بہت [illegible] کی ہے۔ "افادات مہدی" میں ایک جگہ فرماتے ہیں:—

"یہی بلاغت تھی جیسے کسی [illegible] حیدرآباد دکن کے سب فارک کو نذیر احمد کا شیدائی بنا رکھا تھا۔ "سر سالار جنگ" اول اسٹیٹ ڈنر میں طلائی تابوں کا زور عمل [illegible] چھری کانٹوں کی دھیمی دھیمی موسیقیت میں دفعتاً سرکاری ڈاک کے آسنے [illegible] ہوتی ہے [illegible] ہے "نذیر احمد کی کوئی مراسلت ہو تو [illegible] پیش کی جائے" ایک [illegible] شام کے ہاتھوں میں ایک کاغذ ہوتا ہے، برقی روشنی کی جگمگاہٹ میں شاہ [illegible] امرا کی نگاہ نقوش حرفی پر دوڑ رہی ہے اور چہرہ پر دہ دہ کر وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جیسے نسیم زیر لب کی ہلکی لہریں کیسے۔ نذیر احمد کے خوانِ ادب کا یہ وہ لقمہ تر تھا جس سے شاہی [illegible] ادب چاہتا ہے کہ [illegible] کمال انشا پردازی غیر ستائشی جنبش لب سے ہمیشہ بے نیاز رہے گا!"

سید وزیر حسن دہلوی

ہمارے حال پر اُن کو ہنسی معلوم ہوتی ہے
وہ کمسن ہیں محبت دل لگی معلوم ہوتی ہے

یہ وہ سن ہے کہ ہر صورت پری معلوم ہوتی ہے
جوانی میں بُری [illegible] معلوم ہوتی ہے

خداوندا محبت آگئی کس طرح انساں میں
[illegible] دشمنی معلوم ہوتی ہے

نہایت بے مزہ ہے اصل میں افسانۂ ہستی
محبت کی ہے جو کچھ چاشنی معلوم ہوتی ہے

چمک آجاتی ہے زلفِ سیہ میں شانہ کرنے سے
سوادِ شام میں بھی روشنی معلوم ہوتی ہے

نہیں معلوم دیوانے ترے کس [illegible] ہیں
کہ [illegible] اُن کو [illegible] معلوم ہوتی ہے

اگر ہنستی ہے دنیا مجھ پہ کچھ بیجا نہیں ہنستی
[illegible] حالت پہ ہنسی معلوم ہوتی ہے

صراحی مے کی ہے سمجھا ہے جسکو زاہد [illegible]
[illegible] گنگا [illegible] معلوم ہوتی ہے

منافق اور کسکو کہتے ہیں تو ہی بتا واعظ
تری ہر بات ہم کو دورُخی معلوم ہوتی ہے

اُتر جاتا ہے ایک ایک شعر نشتر کی طرح دل میں
رقم کی شاعری افسونگری معلوم ہوتی ہے

امیر علی رقم لکھنوی

بابر نامہ

حیدرآبادی نسخے کا ایک مشکوک حصہ

(از مسز بیورج)

بابرنامہ تاریخ مغلیہ کا ایک مستند اور نادر ماخذ ہے۔ کچھ عرصہ ہوا اسکے ایک حصہ کے نقلی ہونے پر بحث چھڑی تھی۔ مشہور مستشرق مسٹر بیورج کی زوجہ نے جو ترکی زبان میں بہت اچھی مہارت رکھتی ہیں اور تاریخی تنقید میں شاید اپنے شوہر سے پیچھے نہیں، جنرل رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی ایک گذشتہ اشاعت میں اس معاملہ پر مندرجۂ ذیل خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔ ہم اسے اُن ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں جو بابرنامہ کے حیدرآبادی نسخہ سے استفادہ کا خیال رکھتے ہوں۔

حیدرآبادی بابرنامہ کے ایک حصہ کی صحت میں مجھے شک ہے۔ کہر (Kehr) کے (Hasan) کسان (Hay) اور پٹر وگریڈ یونیورسٹی کے بابرناموں میں یہ حصہ موجود ہے اور الفنسٹن کے نسخہ اور اسکی اصل میں نہیں ہے۔ اب چونکہ یہ حصہ دونوں "واقعات بابری" میں نہیں، اس لیے بےخطر کہا جا سکتا ہے کہ یہ حصہ اصل نسخہ میں بھی اُسوقت نہیں تھا جبکہ یہ ترجمہ ہوے۔ الفنسٹن کے نسخہ اور اسکی اصل میں اسکی عدم موجودگی سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ بابر نے یہ حصہ چھوڑ دیا تھا، بلکہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الفنسٹن والے نسخہ کی نقل اور فارسی میں ترجمہ ہونے سے قبل یہ حصہ موجود نہ تھا۔ میرے نزدیک یہ معدومیت چند صفحوں کے ضایع ہو جانے کی وجہ سے تھی۔ چنانچہ نسخۂ الفنسٹن میں گم شدہ اوراق کے پیشتر کے جملہ میں فعل نہیں ہے۔ اس سے میری رائے کی تائید ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ سنہ ۹۰۸ھ کے خالی حصہ کو پُر کرنے اور سنہ ۹۱۴ھ کے خلا کو بدستور چھوڑ دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ بابر کی تحریروں کا ابتدائی حصہ بالکل مسلسل ہے۔ سنہ ۹۱۴ھ سے یہ سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے اور تقریباً گیارہ سال کا وقفہ پڑ جاتا ہے۔ اب جو سلسلہ

شروع ہوتا ہے وہ ڈائری کے طور پر ہے۔ لہذا یہ دوسرا وقفہ اتنا نہیں کھٹکتا جتنا کہ پہلا جو بابرنامہ کے مسلسل حصہ میں موجود ہے۔ اور اس تسلسل کا یکایک ایسے اہم موقع پر منقطع ہو جانا شارح کے دل میں اس وقفہ کو پُر کرنے کی خواہش پیدا کرتا ہے۔

قطعۂ زیر بحث کے نقلی نہ ہونے کے دو دلائل ہیں (۱) حیدرآبادی نسخہ میں اسکی موجودگی اور (۲) ڈاکٹر المنسکی اور ڈی کورٹ ول کا اس حصہ کو صحیح تسلیم کرنا۔ پہلی دلیل بہت وقیع ہے اس لیے کہ اس نسخہ میں اس قسم کی کوئی دوسری فروگذاشت نہیں ہے۔ دوسری دلیل کے متعلق میرا خیال ہے کہ ترکی زبان کے دونوں ماہروں نے بغیر جانچے ہوئے اس حصہ کو صحیح تسلیم کر لیا انکے پاس کہر والا نسخہ تھا۔ یہ نسخہ بہت غلط ہے (جسکی توجیہ صرف اسی طرح کی جا سکتی ہے کہ فارسی ترجمہ کا ترکی ترجمہ ہے)۔ کہر کی غلط عبارت کے مطالعہ کے بعد بابر کے اسلوب بیان اور طرز تحریر کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس غلط حصہ کو پڑھ کر اتنا فرق نہیں محسوس ہو سکتا جتنا اُس حالت میں ہوتا جبکہ اُنھوں نے صحیح بابرنامہ کا مطالعہ کیا ہوتا۔

المنسکی اور کورٹ ول کی معذرت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بابرنامہ کا دوسرا نسخہ انکو دستیاب نہیں ہو سکا۔ اسکے علاوہ جو اسناد اس حصہ کی تغلیط کے لیے میں پیش کرتی ہوں اُن میں سے اکثر اُنھیں معلوم نہیں تھیں۔ الفنسٹن اور حیدرآبادی نسخوں کی شہادت اور طفیل (Tufeil) کی تنقید انھیں میسر نہ تھیں، اور بہت سی مشرقی تواریخ اُسوقت ناممکن الحصول تھیں۔ میرے لیے تو یہ بھی بڑی آسانی ہے کہ میرے شوہر کے معلومات اور خیالات میری امداد کرتے ہیں۔ لہذا المنسکی اور کورٹ ول کا اس حصہ کو صحیح تسلیم کرنا اتنا ہی قدرتی ہے جتنا میرا غلط قرار دینا۔

تغلیط کے دلائل

(۱) عبارت مذکور کسی واقعات بابری میں نہیں ہے
(۲) اس میں جو خواب ہے وہ مافوق الفطرت اور ناقابل تسلیم ہے
(۳) خواجہ یحییٰ کے صاحبزادے یعقوب کا کہیں اور تذکرہ نہیں ہے
(۴) بابر کی جان بچانے والوں کا نام بابرنامہ میں نہیں ملتا
(۵) حضرات خاں اُسوقت اندجان میں نہیں تھے
(۶) بابر اندجان نہیں بلکہ خان کے پاس تند بادام گیا تھا
(۷) خان کے پاس چار ہی ماہ رہ کر وہ خراسان نہیں گیا، بلکہ سخ اور ہشیار میں سال بھر

آرام کرنے کے بعد خراسان کے لیے روانہ ہوا۔

(۸) تین سو سے زائد نہیں بلکہ ۲۰۰ سے زائد اور ۳۰۰ سے کم سپاہی بابر کے گرد جمع ہوئے

(۹) "تین دن" "ایک دن اور دو راتیں" اور پانچ دن کی راہ تقریباً ۰۰ میل تھی

(۱۰) یہ عبارت اٹھارہ مہینوں کے حالات کے لیے جبکہ بابر اور حضرات خاں کو اہم واقعات پیش آرہے تھے، ناکافی ہے۔

(۱۱) جہاں تک بابر کی خواہشات کا تعلق ہے خواجہ احرار کے وعدے بے نتیجہ نکلے اور یعقوب کی فوری فتح خوشخبری کے بعد شکست اور جلا وطنی نصیب ہوئی یہ عبارت کسی شارح کی معلوم ہوتی ہے جسنے فتح ہندوستان کے بعد لکھا ہے۔ بابر حقیقت سے واقف تھا۔

(۱۲) اصل نسخہ اور عبارت مشکوک کے اسالیب بیان میں وہی فرق ہے جو ایک استاد اور ایک مبتدی کی تحریر میں ہوتا ہے۔ اس مشکوک عبارت کا مصنف نہ ترکی میں سوچ سکتا تھا۔ نہ آسانی سے ترکی لکھ سکتا تھا۔ نہ اُسکے بابر کے سے خیالات ہیں نہ تفصیل واقعات کا انتخاب وہ ہے۔ اسکے علاوہ اختلافات طرز تحریر اور لغات کے بھی مختلف پہلو ہیں۔
ان مختلف وجوہات کی بنا پر ہم فیصلہ کرتے ہیں کہ عبارت مذکور بابر کی تحریر نہیں ہے

(ملخص)

"سید"

غزل فضا

جو رہ عشق میں ہستی کو مٹا دیتا ہے
خود کو وہ زندۂ جاوید بنا دیتا ہے

میری اور تیری نگاہوں کا تقاضا و ہم ہوتا
عشق کو حسن کی سرحد سے ملا دیتا ہے

[illegible]
عشق ایسوں کو بھی سولی پہ چڑھا دیتا ہے

عبرت [illegible]
[illegible] فنا دیتا ہے

لذت [illegible]
[illegible] وہ پیغام قضا دیتا ہے

[illegible] ہوئے ہمدم سارے
[illegible] فضا دیتا ہے

سید دل نہ فضا

[illegible]

سلاجقۂ عظمیٰ

جلال الدولہ جلال الدین ابو الفتح ملک شاہ

(۴۶۶ ——— ۴۸۵ ہجری ابتدا سن)

اُن جملہ مہذب اقوام عالم میں جنھوں نے وسیع ترین براعظموں کے طول و عرض میں فتح و ظفر نصرت و کامرانی مسرت و ابتہاج کے پرچم اُڑائے ہیں اور تاریخ عالم کے نہ مٹنے والے روشن اور زریں صفحات کو اپنے غیر فانی کارناموں سے مزین اور اپنی بیش بہا معلومات سے عالم امکان کو مالا مال کیا ہے اُن میں بلحاظ زمانہ مسلمان بہت نزدیک ہیں۔ موجودہ یورپ آج چودھویں صدی میں جو چشمہ بدور "بقعۂ نور" بنا ہوا ہے لیکن مسلمانوں ہی کی وراثت اور دماغی نشو و نما کی بدولت جو وہ اپنی آیندہ آنے والی نسلوں کے لیے ورثہ میں چھوڑ گئے تھے قائم اور برقرار ہے۔ لیکن قابل افسوس تو یہ امر ہے کہ اُنھیں کے حالات سے یورپ کے طبقۂ مخصوصین کے سوا کوئی کما حقہ باخبر نہیں اور ہمارے ہندوستان میں تو خیر سے انکی تاریخ بالکل ہی تاریکی میں ہے۔ "یاران میکدہ" کی اس شانِ استغنائی داستان پریشان کُن اور "نظام" کو جذبۂ شعریت کا "فسانۂ خواب رُبا" بیان کرنے سے ظاہرا فائدہ نہیں معلوم ہوتا۔ ضرورت جس بات کی ہے وہ یہ کہ مستند ارباب ذوق تاریخ کو موثر اور دلچسپ پیرائے میں "شاہانِ مالوہ" کی طرح نامور مشاہیر مسلمان سلاطین کی خانگی، معاشرتی، تمدنی ترقیاں روزمرہ اور دلچسپ ٹکسالی زبان میں لکھیں تاکہ ہماری قوم مرحوم کے فاتحہ خواں اُس سے مستفید ہوں ——— اور ان تعصبات و خیالات کو رفع کرنے میں ایک حد تک کامیابی ہو جو صدیوں کی جہالت کی خوں ریزیوں سے پیدا ہو گئے ہیں۔

(۱)

خلیفہ قائم عباسی کا انتقال ہو چکا ہے۔ بغداد اپنی گذشتہ شان و شوکت پر بجا فخر کرتا ہے [illegible] اپنی ناگفتہ بہ حالت اور مستقبل کی تباہی کے نقشہ کو دیکھ کر ارباب بصیرت کو خون کے آنسو [illegible] ہے عوام کی دلچسپی خلیفہ کے پاکیزہ دربار سے [illegible] جاتی ہے۔ [illegible] دور ظلمات

ہے۔ "خانقاہ عظمت اسلام" میں حنبلیوں اور اشعریوں (حنفیوں) میں مستقلاً جنگ قائم ہے۔ ہزارہا مسلمانوں کا خون ناحق ہو رہا ہے کہ عین اسی وقت مشرق سے آفتاب سلطنت ملک شاہ کی شکل میں طلوع ہو کر "مرکز ہزار تمنا" بنجاتا ہے ......

(۲)

ملک شاہ ذہین تھا اور بہادر۔ اپنے قابل عظمت باپ الپ ارسلاں کے عہد میں فتوحات اس قدر کافی کر چکا تھا جو اُسکے بقاے دوام کے لیے کافی سے زیادہ تھیں —— جب وہ تختِ حکومت پر فائز ہوا تو خود اُس کا بھائی ایک بغاوت کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ جب بغاوت فرو ہوتی ہے تو قلمدان وزارت "اتابک" کا خطاب مزید عطا کرکے "کشتۂ فطرت حسن بن صباح" کی تحویل میں بدستور رہتا ہے۔ بلکہ سیاہ و سپید کا بھی اختیار اُسی کو عطا کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں ایشیا میں نظام الملک طوسی، یحییٰ برمکی کے بعد نہایت مدبر و عقلمند وزیر گذرا ہے اور اُسکی غیر فانی کتاب سیاست نامہ مدت العمر تک اس کی یاد کو تازہ اور قائم رکھے گی۔ وسیع سلطنت میں جو چین کے حدود سے مغرب میں بحیرۂ روم تک اور شمال میں تاریخیا اور جنوب میں یمن تک پھیلی ہوئی تھی ہر طرف امن و امان کا چرچا تھا۔ ملک شاہ کا دورِ حکومت لحاظ شان و شوکت اور رعایا کی خوشحالی کے رومی یا عربی حکومت سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اُسکے عہد میں تجارت وصنعت کو فروغ ہوا۔ فنون لطیفہ وعلم نیرنجات کو ترقی دی گئی۔ قدیم تہی زبان کی ترقی کے مختلف ذرایع اختراع کیے گئے۔ شہروں میں کالجوں، شفاخانوں، مسجدوں اور خوبصورت محلوں سے آراستگی پیدا کی گئی۔ تمام سلطنت میں جا بجا سڑکیں بنوائی گئیں۔ اور نہروں کے اجراے سلطنت سرسبز و شاداب ہوگئی۔ ملک شاہ کی سلطنت کی جملہ عظمت حقیقتاً وزیر کبیر خواجہ بزرگ ابو علی حسن قوام الدین نظام الملک طوسی کی بدولت تھی!

(۳)

ملک شاہ کے دورِ خلافت میں روزانہ یوں تو اصلاحیں ہوا ہی کرتی تھیں لیکن جس سے مورخین کے نزدیک اُسوقت عوام الناس کو فائدہ پہونچا وہ "کلنڈر" یا جنتری کی اصلاح تھی۔ اس مقصد کے لیے ایک شاہی انجمن کا انعقاد بسرکردگی شاہی منجم فلسفی شاعر غیاث الدین ابو الفتح عمر بن ابراہیم خیامی ہوا۔ اس شاہی مجلس نے وقت کا حساب کرکے بیش بہا اصلاح کی، جو گبن کے خیال کے مطابق "جولین" سے زیادہ درست، اور گریگورین کے ہم پلہ تھی۔

سال نو کا آغاز آفتاب کے بُرج حمل میں داخل ہونے کے وقت سے شمار ہوتا تھا اور جب یہ حساب مکمل ہوگیا تو یہ جلالی کیلنڈر کے نام سے ملک شاہ کے نام پر موسوم ہوا۔

(۴)

نیشاپور کا مدرسہ ہے، اور تین ہم مکتب امام موافق کے حضور میں زانوے ادب تہ کرتے ہیں۔ ان "اصحابِ ثلاثہ" کا اتحادِ باہمی دارالعلوم میں ضرب المثل ہے۔ ایک دن وہ سب مزاحاً اُس زبردست وعدہ کی ایفائی قسم کھاتے ہیں جسکی تکمیل اس عہد زریں سے تعلق رکھتی ہے کہ

"ہم میں جو آیندہ سب سے زیادہ نمایاں ترقی کرے وہ بقیہ کی امداد کرنا فرض تصور کرلے ——"

اس معاہدہ پر قسمیں کھائی جاتی ہیں اور بات رفع دفع ہو جاتی ہے۔ آہ! انکو کیا معلوم تھا کہ انھیں اصحاب ثلاثہ میں آیندہ چل کر ایک شاعر بے ہمتا، دوسرا مشیر مملکت، اور تیسرا ایک خوفناک فرقے کے بانی کی حیثیت سے ہر فرد دنیا کے تاریخی صفحات کو ہمیشہ کے لیے اپنی مستقل یاد سے غیرفانی بنادے گا —— اور اس معاہدہ پر جب قسمیں کھائی جارہی تھیں اُسی وقت کارکنان قضا و قدر اُس عبرتناک انجام سے بھی باخبر تھے کہ انھیں ہم نوالہ و ہم پیالہ اور ہم سبق افراد میں کوئی فرد وہ بھی ہوگا جو اپنے عزیز بھائی کی پیاس کو اپنے خطرناک خنجر خوں آشام سے بجھالے گا۔ اور اُسکی ہیبت کا یہ عالم ہوگا کہ بڑے سے بڑے ہزبران عالم اُس کا تذکرہ کرتے کانپ جائیں گے اور اُسکے خنجر سے یکساں علماے مذہب، اوباے وقت، نقباے سلطنت، مجاہدین عظام، مشائخ کبار، سیاسیات سے باخبر امراء و سلاطین اور غربا بھی ایک ہی وار میں فنا کے گھاٹ اُتریں گے ——"

(۵)

زمانہ گزرا، روایتیں لپٹیں۔ سیکڑوں راتیں پیدا ہوئیں اور صبحیں ہو ہو کر فنا ہوگئیں، ہزارہا بار آفتاب ملک شاہ کی سلطنت پر چمکا اور غروب ہوگیا ماہتاب نہ معلوم کتنی بار اپنا جلوہ دکھا دکھا کر غائب ہوا کہ تاریخ میں ایک نئے باب کا شاندار اور وسیع افتتاح ہوا۔ یعنے وہی کمسن بچے جو کل نیشاپور کے دارالعلوم میں امام موافق کے حضور میں زانوے ادب تہ کرتے تھے آج فلک ادب کے شمس و قمر بن کر دنیاے ادب کو جلوہ طرازیوں سے مبہوت

بنا رہے تھے۔ ایک تو خاندان سلاجقہ کی پیشانی کا نور بنکر دنیا کو روشن کر رہا ہے۔ دوسرا فلسفی ہے اور شاعر، تیسرا مدبر ہے اور سیاست سے باخبر۔ اتفاق کہیے یا ہونے والی بات کہ اس جماعت میں سب سے قبل جو فلکِ شہرت پر طلوع ہوا وہ نظام الملک طوسی تھا۔ اور سلاجقۂ عظمےٰ کا وزیر باتدبیر۔ ایک دن اُسکو اپنے مکتب کا وعدہ یاد آتا ہے، ایفاے وعدہ کے لیے تلملاتا ہے۔ عمر خیام اور حسن بن صباح کی تلاش شروع ہوتی ہے۔ جب معلوم ہوتا ہے کہ عمر خیام مشہور یگانہ فلسفی و شاعر ہے اور منجم۔ اقلیدس و الجبرہ پر اُس کی مستقل تصنیفات موجود تھیں۔ اور حسن بن صباح بھی کوئی کم حیثیت دنیا میں نہ رکھتا تھا۔ جب "اتحادِ ثلاثہ" مکمل ہوگیا تو عمر خیام کو شاہی مجلس کا رکن اور حسن بن صباح کو شاہی حاجب مقرر کرکے اُس وعدہ کو جس کی بنیاد دنیا والوں کے نزدیک حباب سے زیادہ نہیں ہوتی پورا کرتا ہے

(۶)

عمر خیام نے علم نجوم کو دوبارہ زندہ کیا اور ادب نواز و علم پرور شہنشاہ کے زیر سایہ اس باکمال منجم نے شاہی رصدگاہ قائم کی اور ہیئت و نجوم کے ان شہ پاروں کو جو عرصہ دراز سے خاک کی نذر تھے دوبارہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ حسن بن صباح ان ایام حاجب شاہی کے عہدہ پر فائز تھا مگر ایک عرصہ کے بعد نظام الملک سے کسی بات پر ان بن ہو جاتی ہے اور وہ ابن عطاش کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوکر اصول دعوت کی تعلیم کے لیے مصر بھیجا جاتا ہے۔ وہ علم ہندسہ، حساب و نجوم میں عمر خیام کا ہم پلہ ہے اور خلیفہ فاطمی مستنصر سے مل کر قم میں مقرر کیا جاتا ہے تاکہ سیف و قلم کی متحدہ قوت سے اپنے محسن کی جماعت کا استیصال کرے اور یہیں سے وہ الموت کے تاریخی قلعہ پر قابض ہوکر اپنی سفاکیوں اور خوں ریزیوں سے اپنی خداداد قابلیت کو آلودہ کرکے فرقۂ اسمٰعیلیہ کا بانی بنتا ہے ـــــ جو آیندہ دور میں خلق اللہ کے لیے اس قدر مہلک تصور کیا جاتا ہے کہ تیرھویں صدی کے سنہ ۵۸ میں "برباد کنندۂ عظمتِ بغداد" اس تاسیس منحوس کو مستقلاً نیست و نابود کر دیتا ہے۔

(۷)

حسن بن صباح کو فرقۂ اسمٰعیلیہ کی نیابت و امامت پر فائز ہوے ایک عرصہ گذر گیا ہے، خلیفہ مقتدی کا دورِ حکومت شمع سحر سے زیادہ وقیع نہیں ہے۔ آفتاب اپنی روشنی سے اور ماہتاب انتہائی نذرِ حسن سے سلاجقہ کی سلطنت کو منور کر چکا ہے۔ جب قمر ایام بیض سے گذرتا ہے

تو محاق کی وادی سے بھی گذرنا اُسکے لیے ضروری ہے اور جب آفتاب خط نصف النہار سے گذرتا ہے تو زوال شروع ہوتا ہے۔ غرضکہ ہر ارتقا کے بعد انحطاط، ہر عروج کے بعد زوال، ہر طوفان کے بعد امن، ہر حرکت کے بعد سکون، ہر ظلمت کے بعد نور، ہر ظلم کے بعد انصاف اور ہر عیش و مسرت کے بعد فکر و غم لازمی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے لیکر آج تک اور آج سے لا متناہی زمانہ تک دنیا اسی عصر انقلاب اور اسی دور استبداد سے گذرتی رہیگی۔ چنانچہ اس کلیہ سے ملک شاہ بھی مستثنیٰ نہ تھا۔ اب نظام الملک طوسی کا اشہب اقبال اور ملک شاہ کا فرس حیات بھی آرام کا متلاشی نظر آنے لگا۔ اتفاق سے ملک شاہ نے طوسی کے معاملہ میں وہی غلطی کی جو ہارون رشید نے جعفر برمکی کے معاملہ میں کی تھی جس طرح ہارون کی شان و شوکت ایک بڑی حد تک جعفر کی رہین منت تھی اُسی طرح ملک شاہ کی سلطنت کا راز کسی حد تک نظام الملک طوسی کے حسن تدبیر میں مضمر تھا۔ حاشیہ نشینوں کے سمجھانے بجھانے سے اس مضمون کا ایک خط لکھا: "تم میرے ملک پر مسلط ہو گئے ہو، اور اُسکو اپنے اعزا و اقربا میں تقسیم کر رہے ہو۔ اب مجھکو اجازت دو کہ میں قلمدان وزارت تم سے لیکر کسی دوسرے شخص کو دوں اور اہل ملک کو تمھارے طویل دور حکومت سے نجات دلواؤں۔"

اس تحریر کا جو کچھ اثر ایک وفادار خیر خواہ وزیر پر پڑ سکتا تھا وہ تو ظاہر ہے، لیکن رعایا کو جو افسوس ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ اس نے حاملان شقۂ عالی سے کہا "شاہی قلمدان حاضر ہے، لیکن سلطان سے بصد ادب عرض کردینا کہ اسکے ساتھ اُسکا تاج بھی وابستہ ہے، اگر آج یہ میرے سامنے سے اُٹھ گیا تو کل تاج شاہی کی خیر نہیں ہے۔"

حاشیہ نشینوں نے خیر خواہ وزیر کا جواب کچھ اس طرح رنگ دیکر سُنایا کہ ملک شاہ کو مشیر مملکت کا جواب بار خاطر گذرا۔ نظام الملک کی گذشتہ وفاداریاں آڑے آئیں ورنہ یقیناً اُسکو نقصان پہنچ جاتا۔

(۸)

اس جواب سے نظام الملک کو خود ستائی منظور نہ تھی، بلکہ اپنے نوعمر بادشاہ کو خیر خواہانہ نصیحت تھی۔ اور وہ محض اس وجہ سے کہ حق نمک ادا کرنا چاہتا تھا جو الپ ارسلان کے عہد حکومت سے اُسکے اعصاب میں سرایت کر چکا تھا۔ وہ دنیا کے سرد و گرم سے واقف تھا۔ یہ اسی کی تدبیر و جہانداری تھی کہ جملہ ملکی و قومی انتظامات درست ہوئے تھے۔ یحییٰ برمکی کی طرح

اُسکا دربار ہمیشہ فقہا، علما، ادبا، سے معمور رہتا تھا - اُس نے تمام ممالک محروسہ میں مدارس قائم کیے، اور ۴۵۵ہ ہجری میں بغداد میں نظامیہ کالج قائم کیا - انتظامات ان مدارس کے حکومت کی جانب سے ہوتے تھے، اور انکے لیے خزانۂ عامرہ سے رقمیں بھی منظور کی گئی تھیں - سب سے بڑی خوبی نظام الملک میں یہ تھی کہ اذان سُن کر اہم سے اہم کاموں کو چھوڑ کر اُٹھ جاتا تھا اور بغیر نماز پڑھے ہوے کوئی کام نہ کرتا تھا - بہت سے ناجائز محاصل جو گذشتہ بادشاہوں کے زمانہ میں عائد کیے گئے تھے سب موقوف کر دیے گئے تھے - اس سے پہلے وزیر عمید الملک کندری نے سلطان طغرل کے عہد میں علی الاعلان منابر مساجد پر اثنا عشریوں اور اشعریوں پر لعنت بھیجنے کا طریقہ نکالا تھا، اُس کی وجہ سے بہت سے جید علما و ممتاز فلسفی مثلاً امام الحرمین اُستاد امام غزالیؒ اور ابوالقاسم قشیری وغیرہ ہجرت کرکے حجاز میں چلے گئے تھے —— نظام الملک نے اس بُرے طریقہ کو قانوناً بند کر دیا - اور ان مشاہیر مہاجرین کو واپس بلایا —— یہی وہ باتیں تھیں جنھوں نے مجموعی طور پر ملک شاہ کے دَورِ حکومت کو مؤرخین، آگسٹس، رشید و مامون کا ہم پلہ قرار دیا - اُس کا خطبہ حدود چین سے شام تک اور جنوب سے شمال تک پڑھا جاتا تھا - کہا جاتا ہے کہ ملک شاہ اپنی حیات میں کبھی کسی مقابلہ میں ناکام نہیں رہا - اسکے دورِ حکومت میں نہریں کھودی گئیں پُل تعمیر کیے گئے، مسجدیں آباد کی گئیں، مدرسے اور کالج قائم ہوے، حجاز کے راستہ میں جا بجا رباط اور لنگر خانے بنائے گئے اور اسلامی شان و شوکت بہ لحاظ [illegible] پر غالب ہوگئی - وہ نہایت عادل، متدین، عالی مرتبت اور بلند حوصلہ تھا - آلِ سلجوق میں ہر لحاظ سے اُسکا دورِ حکومت مبارک اور ممتاز تھا - جس طرف اُس نے رخ کیا وہ فاتح اور کامراں ہوا - انطاکیہ سے قسطنطنیہ تک رومیوں کو پسپا کیا اور اُس کفرستان میں پچاس مسجدیں تعمیر کیں اور قیصر سے خراج لیا"

(۹)

ہونے والی بات کہ ملک شاہ اپنے وزیر کی عزت و آبرو کا خواہاں ہوگیا - اُسکی گذشتہ خیرخواہیاں ایک ایک کرکے سب فراموش کر دی گئیں - مگر قبل اسکے کہ ملک شاہ کا ہاتھ اُسکے خون سے رنگین ہوتا طوسی اپنے ہی ہم نوالہ و ہم پیالہ کے ایک فدائی کے خنجر خوں آشام سے خواب فنا سے ہم آغوش ہوگیا - لیکن عجیب بات ہے کہ اس طرف نظام الملک نے ودیعتِ حیات پیکِ اجل کے سپرد کی اور اُس طرف ملک شاہ کی سلطنت کا آفتاب عروج بھی ڈھلنا شروع ہوگیا -

ملک شاہ ایک خاص ضرورت سے خلیفہ کے دربار میں بغداد میں موجود تھا - یہاں اُسکی

شادی ایک مسیحی بادشاہ الکیس کمنس کی لڑکی سے طے ہوئی تھی۔ اس اتحاد سے مشرق و مغرب میں بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں، لیکن فطرت سرہانے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ طوسی کے انتقال کو محض ایک ماہ اور تین دن ہوے تھے کہ ملک شاہ اکیس سال شان و شوکت سے حکومت کرنے کے بعد ۳۹ سال کی عمر میں ۱۵۔شوال ۴۸۵ھ مطابق ۱۸۔ نومبر ۱۰۹۲ء کو داعی اجل کو لبیک کہہ گیا —— اور اسکی وفات کے بعد ہی سلطنت سلجوقیہ کا آفتاب اقبال ڈھلنا شروع ہو گیا —— اور ملک شاہ کی قبل از وقت وفات نے اُس اتحاد کو روک دیا۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت خود مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

دنیا والے جس طرح چاہیں ملک شاہ کو تاریخ کی جرح و قدح میں تولیں، لیکن ہر حالت میں مجبوراً دوست و دشمن دونوں ملک شاہ کو دنیا کے بڑے حکمرانوں کی صف میں ضرور جگہ دیں گے۔ اگر صف اول میں چنگیز، صلاح الدین، رچرڈ، اکبر، محمد فاتح، اورنگ زیب، شاہجہان، ہارون الرشید، مامون الرشید، تیمور، شارلیمین، نیپولین، سیزر، قیصر، زار و سکندر کو جگہ دیں گے تو یہ ناممکن ہے کہ ملک شاہ صفِ اول میں جگہ پانے کا مستحق نہ ہو۔

دورِ حاضرہ کی مدنیت اور تہذیب کا ایام پارینہ کی تہذیب اور اخلاق سے موازنہ کرنا صریحًا غلطی ہے۔ آج بیسویں صدی کی ترقی اور تہذیب کا ہزار سال قبل سے مقابلہ کرنا یقینًا ایک فعل عبث ہے۔ ملک شاہ کی طبعیت کی تیزی اسکی مطلق العنانی کی بدولت تھی۔ لیکن دنیا والوں کو ٹھنڈے دل سے یہ سوچنا چاہیے کہ باوجود اسقدر با اختیار ہونے کے اس حد تک ضبط کرنا، رعایا کی خوشحالی میں شغف اور لوگوں کے ذاتی مفاد کا اسقدر پاس و لحاظ کیا اسکی عقل و ذہانت کا کافی ثبوت نہیں ہے۔ اس نے اپنے فرائض کی ادائگی میں کبھی بھی تساہل نہیں کیا۔ برائیوں کے تدارک، اور اپنی ہستی کو رعایا کی تکالیف سے آشنا بنانے کے لیے بارہ مرتبہ اپنی وسیع سلطنت کا دورہ کیا، شریعت و سائنس کو ترقی دی، اپنی ماتحت اقوام پر اپنی شخصیت کی وقعت اور اسلام کے فوائد ثابت کر دیے۔ ہر گوشہ سے لوگ آتے اور اپنے دامن مقصود کو گوہر مراد سے بھر کر لیجاتے۔ اُس کا دربار شان و شوکت میں آپ اپنی نظیر تھا ——"

(مختار)

مشیر احمد علوی

عطیۂ حضرت ریاض

موت آئے یہ دعا اچھی نہیں — ہجر میں بھی موت کیا اچھی نہیں
ہم غریبوں پر جفا اچھی نہیں — بیکسوں کی بد دعا اچھی نہیں
ہاتھ رنگنے کا لہو سے ہو گماں — شوخ اتنی بھی حنا اچھی نہیں
دل لگی میں تو بگڑتی ہے بہت — بات یہ زلف رسا اچھی نہیں
کیوں اڑاتی آئی۔ آتی ہے بہار — چھیڑ اسیروں سے صبا اچھی نہیں
کام نہ جائے گا میخانے کا بند — چشم ساقی کی حیا اچھی نہیں
ایک کافر آج یہ کہتا گیا — رات دن یاد خدا اچھی نہیں
وصل آیا وہ بعد جس کے ہجر ہو — درد دل اچھا دوا اچھی نہیں
بوسۂ لب سے مٹے تلخی غلط — گالیوں سے یہ مزا اچھی نہیں
شیخ یہ کہتا گیا پیتا گیا — ہے بہت ہی بد مزا اچھی نہیں
غم غلط کرنے کو میں کتنی پی لیا — رات دن غم کی گھٹا اچھی نہیں
دل وہ لیں سب کے یہ ہے اچھی ادا — جان لینے کی ادا اچھی نہیں

میکدے کو چھوڑ کعبے جا ریاض
غفلت اے مرد خدا اچھی نہیں

مسلم یونیورسٹی کی حالتِ زار

بڑے دن کی تعطیل سے چند ہفتے پیشتر اخبارات میں نیازمند خصوصی کے نام سے بعض مضامین کھلی چٹھیوں کے طور پر شایع ہوے تھے۔ فرضی ناموں سے ایسے مضامین لکھنا جن میں کسی کی کارروائیوں پر احتساب ہو، حد درجہ کی اخلاقی کمزوری ہے، اس لیے ان مضامین پر اب تک سرسری نظر ڈالنے کے سوا زیادہ التفات نہیں کی گئی۔ البتہ یہ ضرور پتہ چل گیا کہ علی گڈھ کی ایک جماعت کے لیے اب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بھی ناقابل برداشت ہوگئے ہیں اور وہ نہیں چاہتی کہ صاحبزادہ صاحب دوبارہ وائس چانسلر منتخب ہوں۔ لیکن اخبار ذوالقرنین بدایوں کے ایک نوٹ سے یہ معلوم کرکے بہت تعجب ہوا کہ "نیازمند خصوصی" کی آڑ میں جو صاحب، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب پر گلوخ اندازی کر رہے تھے وہ مسلم یونیورسٹی کے کوئی تنخواہ پانے والے کارکن ہیں۔ اور میں نے دسمبر کے الناظر کے لیے ایک نوٹ اسی وقت سپرد قلم کیا تھا کہ لوگوں کو اس قسم کی بدعنوانیوں پر توجہ ہو۔ اور چونکہ یہ بھی اطلاع مل گئی تھی کہ صاحبزادہ صاحب کے بجاے وہ بزرگ قوم یونیورسٹی کے وائس چانسلر منتخب ہوے ہیں جنکو فطرت نے گویا قائم مقامی ہی کے لیے وضع کیا تھا، تو مناسب معلوم ہوا کہ اس نئے کارنامہ پر بزرگان علی گڈھ کی بارگاہ میں تہنیت بھی پیش کردی جائے۔ الناظر کی اشاعت وقت پر نہیں ہوسکی اور اس اثنا میں مجھے علی گڈھ کی حاضری کا شرف حاصل ہوا تو وہاں ایک صاحب نے صاحبزادہ صاحب کی ایک رپورٹ شایع ہونے کا ذکر کیا۔ انکی گفتگو سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ اور یونیورسٹی کے دوسرے بہت سے ارباب یہ سمجھتے ہیں کہ علی برادران نے ترک موالات کے زمانہ میں علی گڈھ کو وہ نقصان نہیں پہونچایا جو صاحبزادہ صاحب کی اس رپورٹ سے پہونچیگا۔ ہمیں دیگر بزرگان علی گڈھ کی طرح صاحبزادہ صاحب سے اکثر امور میں اختلاف رہا ہے لیکن باوجود اسکے کبھی اسکا وہم و گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ کوئی دن ایسا بھی آئے گا جب صاحبزادہ صاحب علی برادران اور طبقۂ احرار کے دیگر افراد سے بھی زیادہ اس بارگاہ قومی کے راندۂ درگاہ ہوجائینگے۔ اس رپورٹ کے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور جوینده یابنده، ایک نسخہ مستعار حاصل ہوگیا اور اسکے مطالعہ کے بعد ضروری معلوم ہوا کہ اس پر تفصیل سے اظہار رائے کیا جائے۔ اس لیے دسمبر کے الناظر کی تکمیل کے وقت میں نے وہ مختصر نوٹ خارج کردیا۔

صاحبزادہ صاحب کی یہ رپورٹ یونیورسٹی کورٹ کے ارکین کے نام ہے اور علی گڈھ میں دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ صرف اسکے محدود نسخے شایع کیے گئے۔ مگر ضرورت اسکی ہے کہ قوم کے تمام تعلیمیافتہ اور دردمند اصحاب اسکو مطالعہ کریں، اور اس خیال سے میں الناظر کے لیے اس کا ترجمہ شایع کرنا چاہتا تھا لیکن یہ معلوم کرکے کہ اخبار ذوالقرنین کے دفتر سے اس کا ترجمہ شایع کیا جا رہا ہے' یہاں ترجمہ کرانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی - بہرحال رپورٹ کے ضروری اجزا کا خلاصہ پیش کر دیا جائے گا۔

صاحبزادہ صاحب نے اس رپورٹ میں اپنی وائس چانسلری کی سہ سالہ میعاد کے کاموں، اور تجربوں کی روداد پیش کی ہے اور قبل اسکے کہ انکے بیان کا خلاصہ پیش کیا جائے مناسب ہوگا کہ "نیاز مند خصوصی" صاحب نے اپنی چار کھلی چٹھیوں میں صاحبزادہ صاحب سے جو سوالات کیے تھے اُن سے ناظرین کرام آگاہ ہوجائیں -

پہلی چٹھی میں یہ سوال کیا گیا تھا کہ صاحبزادہ صاحب کے سہ سالہ عہد میں مسلم یونیورسٹی کے طلبہ نے "علمی، اخلاقی، روحانی، جسمانی حیثیتوں سے کہاں تک ترقی کی؟

دوسری چٹھی میں یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ "گروہ اساتذہ (جن کی نمائندگی یونیورسٹی کی ... کورٹ اور کونسل میں ہے) انھیں آنجناب کی عالمانہ قابلیت نے (آنجناب کے معیار کے مطابق) طالب علمانہ زندگی کا کس حد تک گرویدہ بنایا - نیز آنجناب کی مدبرانہ و مجربانہ رائے کس مرتبہ تک اساتذہ کو اپنا مطیع و معتقد بنا سکی - انگریزی اساتذہ کے ساتھ وائس چانسلر کے تعلقات باہمی کیسے رہے اور ہندوستانی تہذیب و تعلیم یافتہ اساتذہ سے وائس چانسلر صاحب کا سلوک کیا رہا؟

تیسری چٹھی میں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ ڈیپوٹیشن سے قبل ایک مشرح بیان شایع کردیا جائے۔

نیز یہ سوال اضافہ کیا گیا کہ

"آنجناب کے عہد میں ملک و قوم کی توجہ کس حد تک اس تعلیمگاہ کی طرف مبذول ہوئی"

ساتھ ہی اس امر کا اعتراف کرکے کہ علی گڈھ کالج پر نواب اسحٰق خاں کے زمانہ تک جو توجہ قوم کی رہی اُس سے وہ اب محروم ہے "اور مسلم یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد سے نوبت یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ کورٹ کے جلسوں میں ممبروں کی شرکت میں اتنی کمی ہونے لگی کہ اگر اکیڈمک کونسل کے نمایندے شریک نہ ہوں تو کورم بھی پورا نہ ہوسکے" - یہ توقع ظاہر کی گئی کہ صاحبزادہ صاحب کی "خوش بیانی و زباندانی، علمیت و دوستی بلکہ علم پروری اور سب سے بڑھ کر آپ کی بے لوث حب قومی نے

ضرور اس قدر دلچسپی پیدا کر دی ہوگی کہ کورٹ کے جلسوں میں کم از کم اتنے ممبروار اکین عزوز جمع ہو جاتے ہوں گے کہ ان جلسوں کی منظور شدہ تحریکات کو صحیح معنوں میں کورٹ (اور کورٹ کے ذریعہ سے قوم) کی منظور کردہ تحریکات قرار دیا جا سکے" اور خواہش کی گئی کہ

"آنجناب ملک و قوم کو اس سے بھی آگاہ فرمائیں کہ آنجناب کے مبارک عہد میں جو کچھ ہوا وہ نہ صرف حضور کے زیر اثر حیدر اساتذہ اور ہمعصر مقامی ممبران کورٹ کے غلبۂ آراء سے ہوا بلکہ اس کی توثیق قوم کی عام رسائے سے بھی (بذریعہ اتفاق ممبران کورٹ بموقع مجالس کورٹ) ہوتی رہی۔

اسی ضمن میں یہ سوال بھی تھا کہ

"صحیح تعداد اس طلبۂ کورٹ کے شرکاء کی بیان فرمائیں جس نے آنجناب کا انتخاب فرمایا تھا اور اسکے مقابلہ میں اُن مجالس کورٹ کے شرکاء کی تعداد بتائی جائے جو آنجناب کے عہد وائس چانسلری میں ہوئیں"

آخر میں حسب ذیل مزید سوالات تھے کہ مسلم یونیورسٹی پر ملک و قوم کی توجہ منعطف کرانے کے لیے

"(۱) کہاں کہاں آنجناب بہ نفس نفیس تشریف لے گئے؟

(۲) کتنے جلسے کن کن مقامات پر یونیورسٹی کے مفاد کے لیے منعقد ہوئے؟

(۳) جو جو حضرات گاہ گاہ یونیورسٹی میں کسی وجہ سے تشریف لائے ان میں سے کس کس کو اپنے ہاں مدعو فرما کر اُن کو یونیورسٹی کا ہمدرد و خیر سگال بنانے کی کوشش کی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ

(۴)۔ گذشتہ پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر یونیورسٹی اور علی گڑھ تحریک کے ساتھ جو ایک دلچسپی کی لہر مسلمانوں میں دوڑ گئی تھی اُسکو نہ صرف قائم رکھنے اور تیز کرنے کے لیے بلکہ اس سے مناسب فائدہ حاصل کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی گئیں اور موجودہ قوم کی ... کا کیا طریقہ ... ؟"

چوتھی چٹھی میں سابقہ چٹھیوں کے مطالبات کا اجمالی خاکہ پیش کر کے ... [illegible]

[illegible]

[illegible] اس یونیورسٹی [illegible]

[illegible] بیان کا امتحان [illegible]

کی نگاہ میں کس حد تک قابل اعتماد ثابت ہوئی"

ان چاروں چٹھیوں کا اسلوب بیان اور طرز تحریر اگرچہ بظاہر نہایت مودبانہ اور دردمندانہ ہے لیکن حقیقتاً اسکے لفظ لفظ میں تشنیع و تعریض کا زہر بھرا ہے۔ اور غالباً اسی سبب سے راقم تحریر نے جو یونیورسٹی کے ایک تنخواہ یاب ملازم ہیں اپنا نام شایع کرنے کی جرأت نہیں کی۔ تاآنکہ ۲۲-دسمبر کو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے اس کا پتہ چل جانے کے بعد کہ یہ چٹھیاں مولوی حاجی مقتدیٰ خاں شروانی منیجر مسلم یونیورسٹی پریس نے بھیجی تھیں شروانی صاحب سے بواجہ مسٹر سجاد حیدر رجسٹرار مسلم یونیورسٹی و خان بہادر مولوی حبیب اللہ انکے بارے میں استفسار کیا اور اس گفتگو کو جسمیں شروانی صاحب نے ان تحریروں کے راقم ہونے کا اقبال کیا تھا باضابطہ طریقہ پر اپنے دفتر کے کاغذات میں شامل کرا دیا۔

صاحبزادہ صاحب نے اپنی رپورٹ کو ۸ مختلف عنوانات پر تقسیم کیا ہے اور شروع میں دو ورق کے مختصر دیباچہ میں یہ ظاہر کیا ہے کہ جس طرح ۱۹۱۹ء میں سرجان ہیوٹ کی پالیسی سے اختلاف کرنے میں وہ ٹرسٹیوں کی جماعت میں منفرد تھے۔ ستمبر ۱۵ء میں جب مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کا ڈیپوٹیشن گورنمنٹ ہند کے وزیر تعلیم سے گفتگو کر رہا تھا تو انھوں نے گورنمنٹ کو یونیورسٹی کے پروفیسروں کے تقرر کا اختیار دیے جانے کی مخالفت کی رہنمائی کی تھی یا کالج کے طلباے قدیم کی ایک با اثر جماعت کی مخالفت اُن اصولوں کی تائید میں کرنا گوارا کی تھی جن پر اُنکی رائے میں اس درسگاہ کی اساس و بنیاد قائم ہے اُسی طرح نہایت مجبوری کے ساتھ وہ اسوقت اپنے اُن تجربات کو پیش کر رہے ہیں جن کو پڑھ کر اُن لوگوں کو بہت دُکھ ہوگا جو اس درس گاہ کے حقیقی خیرخواہ ہیں نیز اُنھوں نے یہ بھی پیشگوئی کر دی ہے کہ اس تحریر کی اشاعت کے بعد وہ لوگ جن پر اس رپورٹ سے زد پڑتی ہے کوشش کریں گے کہ اصل مقصد سے عام توجہ کو ہٹانے کے لیے صاحبزادہ صاحب کے متعلق اس قسم کی باتوں کو شہرت دیں کہ

(۱) اس درسگاہ اور مسلمانوں کے مخالفین کی مخاصمت کے لیے ایک آلہ فراہم کر دیا ہے اور

(۲) حکومت کو مداخلت اور تحقیقات کرنے کی دعوت دی ہے۔

مگر اس خیال سے کہ یونیورسٹی کے اندر ایسے حالات کی تائید کسی طرح قوم کے لیے مفید نہیں ہو سکتی جو مسلمانوں کی آنے والی نسل کی تہذیب و تربیت کو برباد کرنے والی ہوں۔ اُنھوں نے واقعات پر پردہ ڈالنا

گوارا نہیں کیا اور چونکہ گورنمنٹ کی طرف سے خود ہی تحقیقات کرنے کی تحریک کی گئی ہے اس لیے بجائے اسکے کہ الزام اُنپر لگایا جائے ضرورت اسکی ہے کہ اس بات پر غور کیا جائے کہ گورنمنٹ نے دسمبر ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کا جو قانون بنایا تھا وہ کہاں تک عملدرآمد میں کامیاب ہوا ہے اور کن امور میں ناکامیاب رہا۔ اور چونکہ قانون میں تغیر کرنا صرف حکومت ہی کے بس کی بات ہے اس لیے انکی رائے میں گورنمنٹ کی تحقیقاتی کارروائی کا خیرمقدم کرنا چاہیے۔ کیونکہ جب تک ان نقائص کی اصلاح نہ ہوگی حالات کا بہتر ہونا ممکن نہیں بلکہ اندیشہ ہے کہ اور ابتری پیدا ہوگی۔

اسی سلسلہ میں آپ نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ یونیورسٹی کے کاموں کے ضمن میں آپ کو اپنے پُرانے دوستوں اور شرکاے کار پر نکتہ چینی کرنا پڑتی ہے۔ ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب کی آپ نے ہمیشہ اس بنا پر تائید کی کہ آپ انکو قوم کا ایک قیمتی فرد تصور کرتے تھے اور اگرچہ نواب سید محمد علی صاحب نے جو دو برس تک کالج کے سکرٹری ہونے کی حیثیت میں ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب کے ساتھ کام کر چکے تھے اور مہاراجہ صاحب محمود آباد نے جو یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر تھے صاحبزادہ صاحب کو ڈاکٹر صاحب کی طرف سے متنبہ کیا تھا لیکن پھر بھی اُنھوں نے اپنی سابقہ واقفیت کی بنا پر ڈاکٹر صاحب ساتھ اتحاد عمل کا تہیہ کر کے وائس چانسلری کی زمام اپنے ہاتھ میں کی۔ البتہ تین سال کے تلخ تجربہ نے صاحبزادہ صاحب کی آنکھیں کھول دیں اور اُن پر ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب کی شخصیت کا دوسرا رخ بھی نمایاں ہو گیا۔ آخر میں آپ نے اپنی مسلسل علالتوں کا ذکر کر کے اس بات کی معذرت کی ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیمی حالت اور عام معاشرت کے بارے میں زیادہ نہیں لکھ سکے اور وعدہ کیا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد آرام کے بعد آپ ان ضروری مباحث پر تفصیل سے اپنے خیالات پیش کریں گے۔

اسکے بعد ۱۲۶ صفحہ پر اصلی رپورٹ ہے جس کے ہر باب کا خلاصہ درج ذیل کیا جاتا ہے:

باب اول - تمہید -

جب ۲۴ - دسمبر ۱۹۲۴ء کو صاحبزادہ صاحب کا انتخاب وائس چانسلر کے عہدہ پر ہوا تو آپ نے کورٹ کے اراکین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی تقریر میں اپنا مطمح نظر یوں ظاہر فرمایا :-

"میں چند الفاظ میں ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ جو امانت آپ نے میرے سپرد کی ہے اُسکے متعلق میرا کیا خیال ہے - میں سمجھتا ہوں کہ اس درسگاہ کا مرکزی مقصد یہ ہے کہ یہاں طلبا کی روحانی اخلاقی اور جسمانی تربیت و پرداخت ہماری توجہ اور جد و جہد کی اصلی غرض ہونا چاہیے - طلبا کی فلاح و ترقی مقصد ہے اور اساتذہ و اتالیق اس مقصد کے حصول کا ذریعہ - باقی ہر چیز اسکے

ضمن میں او ر تتمہ کے طور پر ہے ۔ ہمارے طلبا کی روحانی، ذہنی، اخلاقی اور جسمانی صحت دراصل اس امانت کا جزو اعظم ہے جو قوم نے ہمیں سپرد کی ہے ۔ انھیں کے نشو ونما و ترقی پر اس درس گاہ کی کامیابی کلیتہً منحصر ہے ۔ کسی قوم کے افراد کی تہذیب وسیرت، تندرستی اور قابلیت ہی اسکی اصلی دولت ہیں اور انھیں چیزوں میں ہماری قوم غریب ہے ۔ یہ درس گاہ اسی شدید ضرورت کو رفع کرنے کے لیے ہے اور یونیورسٹی کی خدمات کی اسی حیثیت سے جانچ ہوگی"۔

مندرجہ بالا خیالات اور ضرورتوں کے لحاظ سے صاحبزادہ صاحب کی رائے میں وائس چانسلر کا اصلی کام یہ تھا کہ

(۱) حکومت اور قوم سے مالی و اخلاقی امداد حاصل کرے ۔

(۲) ضروری عمارتوں اور سامان کی فراہمی کے اسباب مہیا کرے ۔

(۳) یونیورسٹی میں جو تعلیم و تربیت دی جاتی ہے اس میں اصلاح و ترقی کے لیے سعی کرے ۔

کام کی اہمیت اور دشواریوں کی بنا پر اُن کی رائے میں تین سال کی مدت کافی نہ تھی اسلیے صاحبزادہ صاحب نے اپنے خیال میں ایک ایسے نظام عمل کا خاکہ مرتب کیا جسکی تکمیل کے لیے چھ سال درکار تھے ۔ جس میں سے پہلے تین سال میں صرف پہلی اور دوسری مدوں پر توجہ مرکوز رکھنا مدنظر تھی اور دوسری سہ سالہ میعاد کو کلیتہً تیسری مد کے لیے مخصوص رکھنا چاہتے تھے کیونکہ اُنکے خیال میں یونیورسٹی کے مخصوص حالات کی بنا پر پہلی دو مدوں میں کامیابی تیسری مد پر ہمت صرف کرنے کے لیے ضروری تھی ۔ اس تیسری مد پر ابتدائی دور میں توجہ نہ کرنے کا ایک اور سبب یہ بھی تھا کہ تعلیم و تربیت کی اصلاح بہت کچھ اساتذہ کے طرز عمل اور طریق کار میں اصلاح و ترقی پر منحصر ہے اور اُنکی معاونت حاصل کرنے اور کسی قسم کی اندرونی چپقلش نہ پیدا ہونے دینے کے خیال سے یونیورسٹی کے اساتذہ سے تصادم گوارا نہ تھا ۔

باب دوم ۔ حکومت اور قوم کی اخلاقی و مالی اعانت حاصل کرنے کی کوشش ۔ حکومت ہند اور صوبائی حکومتوں کی مالی و اخلاقی امداد علیگڈھ کے لیے ابتدا سے موجب تقویت رہی ہے سنہ ۱۹۰۶ء سے ہر وائسرائے نے علیگڈھ کو اپنی تشریف آوری سے سرفراز کیا اور اس طرح سے امداد کی لیکن سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے کامل سولہ سال تک ملک معظم کے نائبین کے علی گڈھ نہ آنے سے لوگوں کو خیال ہو چلا تھا کہ حکومت نے رویہ میں تبدیلی ہو گئی ہے اس لیے صاحبزادہ صاحب کی دعوت پر لارڈ ریڈنگ ۲۶ - جنوری سنہ ۱۹۲۶ء کو علی گڈھ آئے اور اپنی تقریر میں علیگڈھ یونیورسٹی اور اسکے

مقاصد کے متعلق حکومت کی طرف سے اطمینان دلائے گئے - اسی موقعہ پر سرکار عالیہ بھوپال بھی علی گڈھ تشریف لائیں اور ایک لاکھ بیس ہزار کی فیاضانہ رقم عطا کی - اسکے بعد حکومت سے درخواست کی گئی کہ سالانہ امداد تین لاکھ تینتیس ہزار کردی جائے اور عمارات، کتب خانہ و دیگر لوازم کے لیے یکمشت سترہ لاکھ عطا کیے جائیں - اس سلسلہ میں صاحبزادہ صاحب کو عمال حکومت، اراکین مجلس مقننہ اور وزرائے [illegible] سے ملنے کی غرض سے باربار دہلی اور شملہ جانا پڑا اور یونیورسٹی ہی کے مفاد کے خیال سے انھوں نے اسمبلی کی رکنیت قبول کی - بالآخر حکومت نے اپنی مستقل امداد ایک لاکھ سالانہ کے بجائے ایک لاکھ پچیس ہزار کردی - اور عمارات کے لیے پانچ لاکھ روپیہ دینا منظور کیا -

باب سوم - ہزایکسیلنسی سر ولیم میرس گورنر صوبجات متحدہ کی تشریف آوری

سر ولیم میرس نے فروری ۲۲ء میں سرکاری طور پر یونیورسٹی کو اپنی تشریف آوری سے سرفراز کیا - اس سے جو اخلاقی مدد حاصل ہوئی اسکے علاوہ نواب سر مزمل اللہ خاں اور نواب عبد الصمد خاں کے عطایا اور انکے احباب کی رقوم سے میرس ہوسٹل کے لیے [illegible] ہزار روپیہ مہیا ہوا -

باب چہارم دسمبر ۲۵ء میں پنجاہ سالہ جوبلی کا جشن -

قوم کی عام بے توجہی کو دفع کرنے کے خیال سے ایک ایسا موقع فراہم کرنا ضروری تھا جبکہ ملک کے ہر حصہ کے نمایندے مجتمع ہوکر جو کام اب تک ہوچکا ہے اس سے واقفیت حاصل کریں اور ان امکانات کا اندازہ کرسکیں جو علی گڈھ تحریک کی بدولت رونما ہوسکتے ہیں - مئی ۲۵ء میں علی گڈھ کی درسگاہ کا پچاسواں سال ختم ہوتا تھا اس لیے اغراض بالا کو پیش نظر رکھکر جشن جوبلی منانے کا ارادہ کیا گیا - پہلے مارچ ۲۵ء میں جشن کا اعلان کیا گیا لیکن جنوری اور فروری ۲۵ء میں وائسرائے اور گورنر کی آمد کے باعث اس مدت میں توسیع کرکے دسمبر ۲۵ء میں جشن کا وقت مقرر کیا گیا - جوبلی کو کامیاب بنانے ہی کے خیال سے صاحبزادہ صاحب دو دفعہ پنجاب گئے اور اسی سال تعطیل کلاں کے زمانہ میں بمبئی میں جاکر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم لیگ کے جلسوں میں شریک ہوئے - اپریل ۲۵ء میں اسی غرض سے لکھنؤ اور الہ آباد گئے - اور جہاں گئے وہاں جلسوں میں تقریر کرنے کے علاوہ مشاورت کے جلسے منعقد کیے اور مقامی مسلمان رہنماؤں کو جوبلی میں شرکت کی دعوت دی - ستمبر ۲۵ء میں طلباے قدیم کا ایک جلسہ شملہ میں منعقد کرکے جوبلی کو کامیاب بنانے کی ضرورت و اہمیت ظاہر کی - اسکے علاوہ خاص علی گڈھ میں جوبلی کے مختلف انتظامات پر آخر اکتوبر ۲۵ء تک وہ اپنے وقت اور توجہ کا بہت بڑا حصہ صرف کرتے رہے - اس محنت شاقہ کی بدولت

صحت نے اکتوبر میں جواب دیدیا تو آپ نے ڈاکٹروں کی رائے کی بنا پر آرام لینے کی غرض سے جملہ انتظامات نواب مزمل اللہ خاں صاحب اور ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کے سپرد کردیئے اور اس سلسلہ میں ۱۹ اکتوبر کو ایک مفصل خط ڈاکٹر صاحب کے نام لکھ کر جوبلی کے کاموں کے متعلق تمام جزئی تفصیلات بیان کردیں۔ جسکے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس انہماک اور باضابطگی کے ساتھ تمام کاموں کا انصرام کیا گیا تھا۔

جوبلی کے موقع پر خیال تھا کہ اکثر رہنماؤں سے علی گڈھ تحریک کی تاریخ اور اُسکے کارناموں سے متعلق تقریریں کرائیں اور خود بھی علیگڈھ کی خدمات، موجودہ حالت اور آئندہ ضروریات پر ایک بسیط خطبہ پڑھیں اور اس طرح جو رہنمایان قوم جمع ہوں انکو یہ محسوس کرا دیا جائے کہ اس درسگاہ کی تکمیل اہم ترین قومی ضرورت ہے اور امید تھی کہ اس طرح جوبلی کے موقع پر ایک مناسب نظام عمل متعین ہو جائے گا جسکے بموجب تمام رہنما اپنے اپنے صوبوں میں یونیورسٹی کی ترقی ونشوونما کے لیے کوشش کریں گے اور اس طریقہ سے ذمہ داری کا بار ان رہنماؤں کے توسط سے کل قوم پر تقسیم ہو جائے گا۔ علالت کے باعث یہ خیال عملی جامہ نہ پہن سکا۔ پھر بھی جوبلی کو خاصی کامیابی ہوئی۔ اور علاوہ اخلاقی امداد کے تقریبًا تین لاکھ روپیہ چندہ ملا

باب پنجم - نواب صاحب اور بیگم صاحبہ بھوپال کی تشریف آوری۔

نواب صاحب بھوپال۔ علی گڈھ کے ایک قدیم طالب علم ہیں اور اس بنا پر جب آپ کے چانسلر بنائے جانے کا اعلان ہوا تو یہ خیال پیدا ہوا کہ یونیورسٹی کی طرف سے اس واقعہ پر مناسب طریقے سے اظہار مسرت کیا جائے۔ صاحبزادہ صاحب کی دعوت پر نواب صاحب نے ۱۴ - نومبر کو علی گڈھ تشریف لانے کا وعدہ کیا - ۱۵ - نومبر کو تقسیم اسناد کا جلسہ منعقد کیا گیا، اور حضور عالیہ بیگم صاحبہ جو یونیورسٹی کی چانسلر رہ چکی تھیں اس جلسہ کی صدارت کے لیے تشریف لائیں - اس ورود مسعود پر علی گڈھ میں بڑا اہتمام کیا گیا، اور نواب صاحب نے ۱۴ - نومبر کو سائنس کالج کا سنگ بنیاد رکھنے کے موقع پر دو لاکھ روپیہ کے عطیہ کا اعلان کیا - حضور بیگم صاحبہ نے نصر اللہ خاں ہوسٹل کا افتتاح فرمایا جو حضور ہی کے عطیہ سے تعمیر ہوا ہے - اور جس میں انٹرمیڈیٹ کالج کے تقریبًا ایک سو طلبہ رہتے ہیں -

۱۹۳۶ء تک مسلم یونیورسٹی کے لیے چندہ فراہم کیا جاتا رہا اسکے بعد کوششوں کے نتائج ذیل خود اپنی کہانی سُنا رہے ہیں : —

سنہ ۱۹۱۶ء سے سنہ ۱۹۲۳ء تک

امیر خسرو فنڈ	۱۷ ۷۱-۱۰۰-۱۰
سمیع اللہ خاں میموریل	۱۵ ۷۰۶-۱۳-۰
حمیدیہ پرشین روم	۳۴۸۲-۲-۳
جوناگڈھ ہوسٹل	۵۰۰۰-۰-۰
حضور نظام برائے عثمانیہ ہوسٹل	۵۰۰۰-۰-۰
گورنمنٹ برائے زنانہ مدرسہ	۱۵۰۰۰-۰-۰
میزان	۹۱۰۲۱-۰-۱

سنہ ۱۹۲۴ء سے سنہ ۱۹۲۶ء تک

وظائف فنڈ	۹۶۲-۱۴-۸
میرس ہوسٹل	۲۹۹۰۰-۰-۰
بیگم صاحبہ بھوپال برائے نصر اللہ خاں ہوسٹل	۹۰۰۰۰-۰-۰
" برائے کتبخانہ نباتات	۱۰۰۰۰-۰-۰
" برائے کتبخانہ (یونیورسٹی)	۱۰۰۰۰-۰-۰
" برائے زنانہ مدرسہ	۲۰۰۰۰-۰-۰
حکومت سندھ برائے سائنس کالج	۵۰۰۰۰-۰-۰
نواب صاحب بھوپال کا وعدہ	۲۰۰۰۰۰-۰-۰
کوٹھی خان بہادر حبیب اللہ خاں جو یونیورسٹی کو وقف کیگئی	۲۵۰۰۰-۰-۰
مولوی معین الدین برائے آرٹ گیلری	۲۰۰۰۰-۰-۰
جوبلی کے عطایا ۱۳ نومبر سنہ ۱۹۲۶ء تک	۲۳۹۰۰۵-۱۲-۸
میزان	۱۱۴۴۸۶۸-۱۱-۴

آیندہ حیدرآباد اور دیگر اسلامی ریاستوں میں وفود لیجانے کا ارادہ تھا لیکن علالت کے باعث دوسرے کاموں کی طرح یہ بھی ملتوی ہوگیا۔

باب ششم ۔ یونیورسٹی میں عام تعلیم و تربیت کی ترقی کے لیے جد و جہد۔

چانسلر منتخب ہونے کے تیسرے ہی دن صاحبزادہ صاحب نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کی جسکے خطبۂ صدارت میں آپ نے خصوصیت کے ساتھ سرسید مرحوم کے سوانح اور کارناموں کو یاد دلایا کہ اُنکے اصول اور یادگار خدمات کو اُنکی تحریک کے مرکز میں بھی لوگوں نے بُھلا دیا تھا۔ لیکن اس تعلیمی تحریک کے بعد یہ اصلی نذرانہ وہ تعلیمی نمائش تھی جسکا افتتاح ۲۰ دسمبر سنہ ۱۹۲۳ء کو سر ولیم میرس نے اُنکی درخواست پر دیرہ دون کے شکارگاہ سے تشریف لاکر کیا۔

یہ ہندوستان میں اپنی قسم کی پہلی نمائش تھی جسکے لیے صاحبزادہ صاحب نے ولایت سے واپس آنے کے بعد کئی مہینے تک محنت برداشت کی - اس نمائش کا ایک مقصد اعظم یہ تھا کہ اسکی بدولت یونیورسٹی میں تعلیمی ماحول پیدا ہو اور زمانہ حال کے نئے تعلیمی خیالات کا مرکز ہونے کی حیثیت میں علی گڈھ کا پایہ مضبوط ہو جائے -

یونیورسٹی کے تعلیمی معاملات' قانون رائج الوقت کے روسے کلیۃً اکیڈمک کونسل کے تحت میں ہیں - جس میں تعداد غالب اساتذہ کی ہے اور اس سبب سے قدرتاً پرو وائس چانسلر صاحب کا اس میں بہت اثر ہے - لیکن مسلم یونیورسٹی کے مخصوص حالات کی بنا پر یہاں پرو وائس چانسلر کو ایسا اثر و اقتدار حاصل ہوگیا ہے کہ انکے اور وائس چانسلر کے درمیان توازن قوت قائم نہیں رہا - یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد جنوری سنہ ۲۱ء سے دسمبر سنہ ۲۳ء تک تین سال کی مدت میں وائس چانسلر کا قیام چونکہ علیگڈھ میں نہ تھا اس لیے وہ کافی نگرانی نہ کرسکے اور پرو وائس چانسلر کو جب انکی جگہ کام کرنا پڑا تو انکے اختیارات بھی حاصل ہوگئے - اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ جب صاحبزادہ صاحب کا انتخاب ہوا اور انھوں نے کام شروع کیا تو پرو وائس چانسلر صاحب کو جو ابتدا سے اس عہدہ پر کام کر رہے تھے یہ تغیر پسند نہ آیا - اور چونکہ جدید آئین کے روسے یونیورسٹی میں نئی قوتوں کو اثر و اقتدار حاصل ہوگیا تھا اس لیے تعلیم و تربیت کی ترقی کا کام بہت دشوار اور نازک ہوگیا تھا - ۱۶ - فروری سنہ ۲۴ء کو جلسۂ تقسیم اسناد کے خطبہ میں صاحبزادہ صاحب نے اپنا تعلیمی مطمح نظر یوں ظاہر فرمایا :

"جن کامیاب طلبا کو اسوقت اسناد دی گئی ہیں انکو اور نیز قوم کو ان اسناد کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ ہونا چاہیے - دیکھنے میں یہ اسناد محض کاغذ کے پرزے ہیں لیکن انکی اصلی قدر و قیمت اُس تہذیب و اخلاق میں پوشیدہ ہے جو مسلم یونیورسٹی کی تعلیم و تربیت سے پیدا ہوتے ہیں - یہ اسناد اس بات کی ضمانت ہیں کہ انکے پانے والوں میں وہ اخلاقی و ذہنی خوبیاں موجود ہیں جو اس درسگاہ کا طغرائے امتیاز ہیں - ...... اسکی مثال یوں سمجھیے کہ جنگ سے قبل جرمن مارک کی قیمت ۲۰ شلنگ تھی مگر جنگ کے بعد اسکی کیا حالت ہوئی؟ وہ چھپے ہوئے اسی کاغذ پر اور اسی ٹائپ میں تھے لیکن جنگ سے پہلے جہاں مارک کی قیمت لاکھوں کی تھی' جنگ کے بعد اُس کاغذ کے برابر بھی قیمت نہ رہی جسپر وہ چھپے ہوئے تھے - یہ کیوں؟ اسلیے کہ جنگ سے قبل جرمنی کی دولت' قوت' اقتدار اور ساکھ برقرار تھی جسکی بنا پر دنیا کے بازاروں میں اسکے مارک کی قدر و قیمت تھی لیکن جنگ میں شکست پانے کی وجہ سے جرمنی کی قوت برباد ہوگئی اسلیے اُسکے کاغذی سکہ کی بھی قدر و قیمت جاتی رہی - بعینہٖ یہی حالت ہماری اسناد کی ہے - انکی خوبی کاغذ و طباعت کی خوبی پر منحصر نہیں ہے بلکہ ان کے پانے والوں کی اخلاقی' ذہنی اور جسمانی اہلیتوں سے انکی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاتا ہے ......"

کامیاب طلبا! یقین رکھو کہ عملی زندگی میں تم کو بہت زبردست نکتہ چینیوں سے سابقہ ہوگا اور تمھاری اسناد کی قدر و قیمت کی جانچ اس اخلاقی و ذہنی سازوسامان سے کی جائے گی جو تم دنیا کے بازاروں میں پیش کر سکوگے۔ اس لیے ان اسناد کی ساکھ اور اس درس گاہ کی شہرت کا انحصار کلیۃً تمھارے اخلاق اور سیرت پر منحصر ہے"

ان واضح الفاظ میں خطاب کرنے کی ضرورت یہ تھی کہ بانی درسگاہ کا اعلیٰ مقصد نظرانداز کرکے اور اخلاق و سیرت سے بے پرواہو کر محض کاغذی اسناد کی طلب پیدا ہوگئی تھی اور اگر اس مشورہ پر عمل کیا جاتا تو آج اسکی نوبت نہ آتی کہ حکومت یا اور کوئی یونیورسٹی کے معاملات کی جانچ کرنے پر آمادہ ہوتا۔ محض تقریروں ہی پر قناعت نہیں کی گئی بلکہ صاحبزادہ صاحب نے یونیورسٹی کے ہر شعبہ کی حالت و حیثیت کی جانچ کی۔ ہر شعبہ کے اساتذہ سے پرووائس چانسلر کی وساطت سے ملاقاتیں کی گئیں۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ کنبجا نہ، معمل خانوں کے آلات اور فرنیچر کے لیے بجٹ میں پہلے سے زیادہ رقم رکھی گئی اور جن معمل خانوں میں زائد گنجائش کی حاجت تھی وہاں مناسب ترمیم کی گئی۔ ٹریننگ کالج کی حالت بہت ناقابل اطمینان تھی اور اُسکے طلبا کو ایم اے اور قانون کی تعلیم ساتھ ساتھ جاری رکھنے کی اجازت تھی، ضرورت اسکی تھی کہ ٹریننگ کالج کے طلبا اپنا سارا وقت اپنے ہی مضمون پر صرف کریں، اس لیے اسکے سدباب کی کوشش کی گئی۔ اسکے علاوہ اساتذہ کی قلت رفع کرنے کی غرض سے ایک معلم اعلیٰ اور دو معاون معلم اضافہ کیے گئے۔

جغرافیہ کے شعبہ کا وجود محض کاغذ پر تھا۔ لہذا میجر ڈن جو اس علم کے ماہر ہیں انٹرمیڈیٹ کالج سے یونیورسٹی میں تبدیل کیے گئے کہ وہ اس ضروری شعبہ کی تعلیم کا انتظام کریں۔ پروفیسروں (ماہر معلمین) کے بجاے ریڈروں (اعلیٰ معلمین) کو اپنے محکمہ کا صدر بنانے کی رد تمام کی گئی، لیکن چونکہ قانون اسکی اجازت دیتا ہے اس لیے اسکا انسداد نہ ہو سکا۔

صدر محکمہ کو کسی شعبہ کی تعلیم کے انتظام میں بہت دخل ہوتا ہے اور جب پروفیسروں کو ریڈروں سے تنخواہ زائد دی جاتی ہے کہ وہ اپنے فن کے زائد ماہر ہوتے ہیں تو کوئی سبب نہیں کہ زیادہ لائق اشخاص کو صدر محکمہ نہ بنایا جائے۔ اگر یہ قاعدہ علیٰ حالہ قائم رہا تو نہ صرف یہ کہ پروفیسروں میں اپنے شعبہ کی طرف سے ذمہ داری مفقود ہو جائیگی بلکہ احتمال یہ ہے کہ ریڈروں میں اس سے بھی زیادہ بُرے حالات رونما ہوں گے۔

ایک طرف عام طور پر اساتذہ وقت کے پابند نہ تھے اور بعض بعض تو درجوں میں بالکل نہ

آتے تھے اور دوسری طرف طلبا کی کثیر تعداد درجوں سے غیر حاضر رہتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اوسط حاضری پورا کرنے سے طلبا بے نیاز ہیں۔ اس لیے پرو وائس چانسلر صاحب کو رائے دی گئی کہ غیر حاضر رہنے یا پابندی کے ساتھ حاضر ہونے والے طلبا کے نام وائس چانسلر اور طلبا کے والدین کے پاس بھیج دیے جایا کریں۔ مگر اس ہدایت پر چند ہی روز عمل کیا گیا۔

یکم جنوری سے ۱۹۔ اپریل ۱۹۲۴ء تک انگلستان جانے سے قبل صاحبزادہ صاحب روزانہ اپنے دفتر میں بیٹھ کر انھیں کاموں میں منہمک رہتے تھے اور تصادم کے پہلوؤں کو بچا کر تعلیم کی ترقی اور نظم کی درستی کے لیے مسلسل کوشاں رہے۔ اُس وقت یونیورسٹی میں نہ تو اکیڈمک رگولیشنز (تعلیمی ضوابط) تھے اور نہ کیلنڈر (کتاب ضوابط) اس لیے پرو وائس چانسلر صاحب کو شاں رجسٹرار صاحب اور اکیڈمک کونسل (مجلس تعلیمی) پر زور دیا گیا کہ اس سقم کو جلد سے جلد رفع کیا جائے۔

ولایت جاتے وقت ۱۶۔ اپریل کو جو خط اپنے قائم مقام نواب مزمل اللہ خاں صاحب کو لکھا اُس میں حسب ذیل ضروری ہدایات درج کی تھیں:

۱۔ یونیورسٹی کے قوانین کی بخوبی تعمیل کرنے کے لیے ضوابط کی ترتیب ضروری ہے لیکن باوجودیکہ تین سال سے زائد گزر گئے اب تک کوئی ضابطہ موجود نہیں۔ مجلس تعلیمی کو اس طرف توجہ دلائی گئی تھی اور پرو وائس چانسلر صاحب نے اطلاع دی ہے کہ اُنھوں نے ایک مسودہ بنا رکھا ہے مگر جب تک تمام ضروری ضوابط کو مجلس تعلیمی غور کر کے منظور نہ کر لے ایسے مسودات چنداں کار آمد نہیں ہو سکتے۔ یہ بہت اہم مسئلہ ہے اور پوری توجہ کا محتاج رہے گا۔

۲۔ بعض شعبہ جات کا وجود محض کاغذی ہے، انھیں میں سے ایک اسلامی علوم کا شعبہ ہے مجلس تعلیمی نے میری یادداشت مورخہ ۔ اپریل کی بنا پر طے کیا ہے کہ اس مدت تعلیمی کے اختتام سے پہلے ضروری نصاب بنا لیا جائے تاکہ نئے سال سے اُسکی تعلیم شروع ہو سکے۔ اس تجویز پر تعطیل کلاں سے پیشتر ہی عمل ہو جانا لازمی ہے۔

۳۔ یونیورسٹی میں علمی ماحول کے قیام و نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ یونیورسٹی اور کالج کے اساتذہ

(۱) علمی تحقیقات کا کام خود کریں اور اپنے طلبا کو اسکا شوق دلائیں۔
(۲) آئندہ سال کے دوران میں اہم تعلیمی مسائل پر خطبے دیں۔

اسکے علاوہ کوشش کرنا چاہیے کہ باہر کے ماہرین تعلیم اور بڑے بڑے لوگ یونیورسٹی میں آکر تعلیمی اور دیگر مضامین پر خطبات دیں۔

۴- یونیورسٹی کے مدرسہ کی حالت بہت ابتر ہے۔ دنیا کا کرہ یا اور نقشے تک نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اور میز کرسیاں تو بالکل جلا دینے کے قابل ہیں۔ اس سقم کو رفع کرنے کے لیے سال رواں کے بجٹ میں کچھ رقم رکھی گئی ہے اور ہیڈ ماسٹر اور مدرسہ کی کمیٹی کو ضروری امور بتا دیے گئے ہیں۔ صرف اس بات کی نگرانی کرنا ہوگی کہ ضروری چیزیں مہیا کی جائیں اور باقاعدہ رجسٹروں میں انکا اندراج ہو جائے۔ انجنیر صاحب کو یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ یہاں کون سی اشیا تیار کرائی جائیں گی اور دہلی سے کیا سامان آئے گا۔

۵- مدرسہ میں بولے اسکاؤٹس کا شعبہ شبیر احمد صاحب مدرس مسلم یونیورسٹی اسکول کے تحت میں کھول دیا گیا ہے اور ہیڈ ماسٹر کو ہدایت کردی گئی ہے کہ میری واپسی تک یہی انتظام قائم رہے۔

۶- انگلش ہاؤس کی حالت قابل اطمینان نہیں اور طے کیا گیا ہے کہ اسکا انتظام درست کیا جائے۔ مس گشس بی کی مدت ملازمت میں ۳۰- جون تک اضافہ کیا گیا ہے اور انکو اطلاع دیدی گئی ہے کہ اسکے بعد انکی حاجت نہ ہوگی۔ اس جگہ کے لیے ہندوستان میں اشتہار دیا جائیگا اور میں انگلستان میں بھی کسی مناسب اسامی کا متلاشی رہوں گا۔ مسئلہ کا تصفیہ ستمبر میں میری واپسی کے بعد ہوگا۔

حیدر خاں صاحب اس محکمہ کے نگراں تھے اور اب انکے چھوڑنے کی وجہ سے مسٹر زیدی کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ اسکے عمدہ انتظام کے لیے مناسب تجویز تیار کی گئی ہے جو مشتہر کر دیجائیگی تاکہ والدین اور عامۃ الناس ختم سال سے قبل اس سے آگاہ ہو جائیں۔

۷- مسٹر میکنزی ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات صوبجات متحدہ نے ملاقات کے دوران میں کہا تھا کہ وہ اپنے محکمہ میں اسباب ذیل کی بنا پر ہمارے ٹرننگ کالج کے کامیاب طلبہ کو ملازمت نہ دیں گے۔

(۱) اس کالج کے اساتذہ نہ قابل ہیں نہ تعداد میں کافی۔

(۲) ہم نے طلبا کو دوسرے مضامین لینے کی اجازت دے رکھی ہے حالانکہ کہیں ایسا نہیں کیا جاتا۔

مجلس تعلیمی نے میری توجہ دہانی پر طے کر دیا ہے کہ آئندہ سے کوئی شخص ٹریننگ کالج میں نہ لیا جائے گا جو بی اے نہ پاس ہو۔ اور ایم اے کے طلبا امتحان میں اسی وقت شریک ہو سکیں گے جبکہ وہ کم سے کم دو سال تک اس کالج میں پڑھ چکے ہوں۔ مئی میں جب کالج کھلے تو داخلہ کے وقت مجلس تعلیمی کی اس تجویز پر نفاذ ہونا چاہیے۔

۸۔ ڈاکٹر اور اتالیقوں کو شکایت رہی ہے کہ یونیورسٹی کے حدود میں بعض ملازمین کے مویشی رکھنے کی وجہ سے گندگی پھیلتی ہے۔ عارضی طور پر ہر جانور کے لیے محصول مقرر کر دیا گیا تھا مگر بر بنائے مصلحت ہیں تو قطعاً انھیں یہاں رکھنے کی اجازت نہ ہونا چاہیے۔ سب لوگوں کو ہدایت کر دی جائے کہ ۲۰ جون تک اپنے مویشی ہٹا لیں۔

۹۔ منٹو سرکل کی نالیاں خاص توجہ کی محتاج ہیں۔ ڈسٹرکٹ انجینئر صاحب کو بتایا گیا تھا کہ ان نالیوں کا پانی جمال پور کے قریب گندے نالے میں پہونچایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اس رائے سے اتفاق کیا اور ڈسٹرکٹ بورڈ کو مطلع کیا مگر بورڈ نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ آپ چونکہ بورڈ کے صدر ہیں اسلیے خاص طور پر آپ کی توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔

محکمہ طبیات کو مزید گنجایش کی سخت ضرورت ہے اور صدر محکمہ کے مشورہ کے بموجب شرقی برآمدہ بند کرا دیا جائے گا۔

صاحبزادہ صاحب کے وائس چانسلر منتخب ہونے سے پیشتر یعنی ۱۷ دسمبر ۲۳ء کو نواب مزمل اللہ خاں صاحب کی صدارت میں مجلس انتظامی کا ایک جلسہ ہوا اور اس میں طے پایا کہ مولانا سلیمان اشرف صاحب جو اسوقت تک مذہبی تعلیم کے مشاہرہ یاب معلم اور شعبہ اسلامی علوم کے بغیر مشاہرہ معلم اعلیٰ تھے اور مسٹر حمید الدین خاں جو فارسی کے معلم تھے دونوں کو اسلامی علوم اور فارسی کے شعبوں کا ریڈر (معلم اعلیٰ) بنا دیا گیا۔ اس جلسہ میں بجٹ پیش نہ تھا اور نہ اسوقت عموماً ترقیاں دی جاتی ہیں۔ پھر جہاں تک کہ اسلامی علوم کے شعبہ کا تعلق ہے اسمیں نہ تو تعلیم دی جاتی تھی اور نہ اسوقت تک کوئی طالب علم ہی تھا۔ بلکہ اس شعبہ کا وجود محض کاغذ پر تھا۔ بر انہیم پرو وائس چانسلر صاحب کی تجویز اور نواب صاحب اور مجلس انتظامی کی منظوری سے مولانا یکم جنوری ۲۴ء کو مشاہرہ یاب معلم اعلیٰ مقرر ہو گئے تمام اساتذہ میں سے صرف ان دو حضرات کو غیر معمولی ترقی دینے سے صاف ظاہر ہے کہ پرو وائس چانسلر صاحب کے تعلقات و روابط اُن سے کیا تھے۔ اور اس خیال کی مزید تصدیق ذیل کے تجربات سے ہوتی ہے۔

فروری ۲۴ء میں شعبۂ اسلامی علوم کے ارکین سے ملاقات کی گئی اور اس بارے میں ۵۔ اپریل ۲۴ء کو نواب صاحب کو جو تحریر بھیجی گئی اُس کا ضروری ملخص یہ ہے:۔

گذشتہ جنوری میں مختلف شعبوں کے اساتذہ طلب کیے گئے۔ سب آئے لیکن مولانا سلیمان اشرف صاحب نہیں آئے بلکہ انھوں نے شعبہ اسلامی علوم پر گفتگو کرنے کے لیے تیار ہونے کی مہلت مانگی۔ چنانچہ

وہ اور اس شعبہ کے دوسرے ارکین فروری میں ملنے آئے اور دریافت کرنے پر حیرت ہوئی کہ صدر محکمہ کو یہ بھی نہ معلوم تھا کہ اسلامی علوم سے کیا مراد ہے - حتیٰ کہ انھوں نے .... پوچھا کہ اسلامی علوم کے سلسلہ میں اُنھیں کیا اور کتنا پڑھانا چاہیے - بحث و گفتگو کے بعد اُنکو مزید مہلت دی گئی کہ وہ آپس میں غور کرکے نتیجہ سے بعد میں اطلاع دیں مگر ہنوز روز اول معلوم ہوتا ہے - اس طرح محکمہ میں اگرچہ معلم اعلیٰ اور دوسرے ارکین موجود ہیں لیکن عملی کام کچھ نہیں ہوتا -

حیرت کی وجہ ظاہر تھی - سنہ ۲۳-۲۴ء کی مطبوعہ فہرست نصاب میں اس محکمہ کا ذکر گیارہویں نمبر پر موجود تھا اور مولانا سلیمان اشرف صاحب اُسکے معلم اعلیٰ و صدر ظاہر کیے گئے تھے - اس طرح پبلک کو باور کرایا گیا کہ دوسرے شعبہ جات کی طرح اسلامی علوم کا شعبہ بھی اس یونیورسٹی میں ہے اور پرو وائس چانسلر صاحب کی اس سفارش پر کہ مولانا سلیمان اشرف جو اُنکے خیال میں اسلامی علوم کے مضمون کے لیے موزوں ترین شخص ہیں اس شعبہ کے معلم اعلیٰ مقرر کیے جائیں اُنکی تنخواہ ۳۰۰ سے ۵۰۰ تک کے بجائے ۴۰۰ سے ۷۵۰ تک کردی گئی اور غالباً اپنے اسی عہدہ کی بنا پر وہ مجلس تعلیم کے بھی رکن بنگئے ہیں - فی الحقیقت جہاں تک کہ مولانا کی تنخواہ اور اُنکے صدر محکمہ کی حیثیت کا تعلق ہے اسلامی علوم کا شعبہ وجود میں ہے مگر جہاں تک کہ تعلیمی کام کا تعلق ہے اس محکمہ کا عدم و وجود برابر ہے - نہ تو اس شعبہ کے تعلیم پانے والے طلبا ہی ہیں اور نہ اب تک اُسکا نصاب ہی متعین ہوا ہے -

مجلس تعلیم کو اس پر فوراً توجہ کرنا چاہیے اور بغیر تاخیر مزید سب سے پہلے اس بات کا تصفیہ کرنا چاہیے کہ اس شعبہ میں کیا پڑھایا جائیگا - یہ تصفیہ سال خواندگی کے اختتام سے قبل ہو جانا چاہیے ورنہ آئندہ سال کی فہرست نصاب میں اس شعبہ کا قطعاً کوئی ذکر نہ کیا جائے - قاعدہ ۱۹ کی رو سے یونیورسٹی پر اس شعبہ کا قائم کرنا لازم ہے لیکن تعمیل قانون کی یہ کوئی صورت نہیں کہ تعلیم کا انتظام کیے بغیر محض کاغذ پر شعبہ قائم کردیا جائے -

اسی طرح جغرافیہ کے شعبہ پر توجہ دلائی جاتی ہے، جسپر اگرچہ کچھ صرف نہیں ہوتا مگر جس کا وجود بھی محض کاغذ پر ہے -

یکم ستمبر سنہ ۲۴ء کو صاحبزادہ صاحب انگلستان سے واپس آئے اور ۲۴ - اکتوبر کو نواب صاحب نے ایک مطبوعہ رسالہ "السبیل" دیا جو نواب صاحب کے حکم سے طبع ہوا تھا - صاحبزادہ صاحب اُسوقت لاہور جا رہے تھے، کچھ دنوں کے بعد رسالہ کو دیکھ چکے تو آپ نے نواب صاحب کو ایک مفصل خط لکھا جسمیں اُن تمام واقعات کا بوضاحت اعادہ کرنے کے بعد جو شعبہ اسلامی علوم کے متعلق اجمالاً

اوپر مذکور ہو چکے ہیں اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ اس رسالہ کے طبع و اشاعت سے قبل اُن سے اسکا قطعاً ذکر نہیں کیا گیا حالانکہ وہ ولایت سے بھی اس پر اظہار رائے کر سکتے تھے اور اشاعت سے تقریبًا دو ماہ قبل علیگڈھ واپس آچکے تھے۔ یہ رسالہ علیحدہ طبع ہو چکا ہے اور اس میں علاوہ اس کے کہ مولانا سلیمان اشرف صاحب نے اپنے سر سے الزام دُور کرنے کے لیے غلط بحث کر کے یونیورسٹی کے ارباب کار پر تعصب کا الزام اور انیورسٹی کے شعبۂ عربی پر اعتراضات وارد کیے ہیں۔ شعبۂ اسلامی علوم کے متعلق ایک مطول یادداشت ہے جسکے شروع میں نواب صاحب، ڈاکٹر صاحب، نواب صدر یار جنگ اور سر فخر الدین وزیر تعلیم صوبۂ بہار کی تقریظات شامل ہیں۔

صاحبزادہ صاحب کی خواہش و ہدایت یہ تھی کہ اختتام سال سے قبل نصاب تعلیم متعین کر دیا جائے۔ اس خواہش کو ایک پمفلٹ تیار کر کے نہایت خوبصورتی سے ٹال دیا گیا۔ اور چونکہ نواب صاحب اور ڈاکٹر صاحب مولانا کی پشت پناہی کر رہے تھے اور وایسرائے علیگڈھ آنیوالے تھے، اور جوبلی کا جشن منایا جانے والا تھا جن دونوں موقعوں پر زیادہ سے زیادہ اتحاد عمل کی ضرورت تھی، اس لیے صاحبزادہ صاحب نے اس کارروائی سے اغماض برتا اور تعلیمی اصلاح کے کام کو اپنے عہدہ کی دوسری میعاد پر اُٹھا رکھنا مناسب سمجھا۔

بایں ہمہ اس شعبہ کے متعلق صاحبزادہ صاحب کی کوششوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ ولایت کے قیام میں اُنھوں نے بعض انگریز اور جرمن مستشرقین کی رائیں حاصل کی تھیں واپسی کے بعد ڈاکٹر اقبال، مولوی محمد شفیع، مسٹر صلاح الدین خدابخش وغیرہ سے مراسلت کی گئی اور ان سب لوگوں کی رایوں کو اس سلسلہ میں مجلس کے سامنے پیش کر دیا جو نواب صدر یار جنگ نے انکی تحریک پر طلب کیا تھا۔ اس مجلس نے جو تجاویز مرتب کیں وہ یونیورسٹی کے قانون کے مطابق مجلس تعلیمی کے سامنے رکھدیں جسنے شعبۂ اسلامی علوم سے اُنکے متعلق رائے طلب کی ہے۔ یہ ہے تین سال کی کوششوں کا سارا حاصل۔

ستمبر ۱۹۲۴ء میں جبکہ ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب انگلستان گئے ہوے تھے اور مسٹر شریف اُنکے قائم مقام تھے یہ انتظام کیا گیا کہ ہر ہفتہ اسٹریچی ہال میں مختلف اہم مسائل پر خطبات دیے جائیں۔ ان مواقع پر صاحبزادہ صاحب خود شرکت کرتے تھے اور یہ دیکھ کر مایوس ہوتے کہ طلبا اور اساتذہ دونوں کو قطعاً دلچسپی نہ تھی۔ لوگ شریک ہی کم ہوتے اور جو شریک ہوتے وہ بھی دیر میں آتے۔ ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب کی واپسی پر یہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔ اساتذہ کی غالب تعداد نے اسی موقع پر اپنی سرد مہری کا ثبوت نہیں دیا بلکہ مارچ ۱۹۲۵ء میں سرسید کی برسی منائی گئی تو اساتذہ اور

طلبا میں سے بہت کم شریک ہوئے جس سے عیاں ہو گیا کہ اس درسگاہ میں کسی سنجیدہ مضمون یا موقع کی طرف کوئی میلان باقی نہیں۔ اس لیے اس بارے میں تمام کوششیں بے سود رہیں کہ درسگاہ کا موجودہ ماحول اُنکے لیے قطعاً ناسازگار تھا۔

علمی ماحول پیدا کرنے ہی کے خیال سے خطبات کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس غرض کے لیے متعدد نئی علمی و ادبی مجالس قائم کی گئیں اور انکی امداد کے لیے بجٹ میں خاص رقم مہیا کی گئی لیکن پرو وائس چانسلر صاحب اور دیگر اساتذہ کی بے توجہی کے باعث کوئی کوشش بارور نہ ہوئی۔ علمی تحریکات کی طرف سے عام سرد مہری کے علاوہ خاص دقت یہ بھی تھی کہ جو کام شروع کیا جاتا اُسکی وہ اصحاب مزاحمت کرتے جن کے اقتدار عمل ہی پر کامیابی کا انحصار تھا۔ اس لیے متعدد مفید تجاویز کو معرض التوا میں ڈالنا پڑا۔ اور حتی الامکان درسگاہ کی تعلیمی زندگی سے وائس چانسلر کو اپنے تئیں بہت کچھ بے تعلق رکھنا پڑا۔

(باقی آئندہ)

ظفر الملک

آہ شاد

مولانا شرر کی ماتم گساری سے ابھی ہم لوگ فارغ نہ ہوئے تھے کہ ایک دوسری مصیبت نازل ہو گئی۔ یعنی ہمارے خان بہادر مولوی علی محمد شاد عظیم آبادی کے انتقال کی خبر موصول ہوئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

شاد مرحوم کا کلام اگرچہ ملک میں اس کثرت سے شائع نہیں ہوا جتنا کہ ہونا چاہیے تھا، مگر باخبر اصحاب اس امر سے ناواقف نہیں ہو سکتے کہ حضرت شاد نے نظم اردو کے ذخیرہ میں کما و افر اضافہ کیا۔ شاید اُنکے معاصر شعرا میں ایسے کم نکلیں گے جنھوں نے اُن کی طرح شعر گوئی کے ساتھ ساتھ نثر نگاری پر بھی کافی توجہ کی ہو۔ افسوس ہے کہ حضرت شاد کی وفات سے شعرائے اردو کا وہ دور قریب خاتمہ کے آ گیا جسے مولف تذکرہ گل رعنا کی تقسیم کے بموجب متاخرین کا دور ثانی کہنا بیجا نہ ہوگا۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ سالہا سال کی بے التفاتی و سرد مہری کے بعد اب جو ان صوبجات اور صوبہ بہار و اڑیسہ کی حکومتوں کو اردو کی طرف کچھ توجہ ہوئی اور امید تھی کہ دونوں صوبوں میں حکومت کی جانب سے جو ادبی ادارات قائم ہونگے مولانا شرر و حضرت شاد کے بیش قیمت مشوروں سے انکی بہت کچھ رہنمائی ہو سکے گی مگر قبل اسکے کہ سرکاری تجاویز عملی جامہ پہنیں ملک دونوں بزرگوں سے محروم ہو گیا۔ سرکاری ادارات کے لیے ممکن ہے کہ یہ کوئی قابل لحاظ نقصان نہ ہو مگر اردو ادب کے لیے یہ نقصان یقیناً ناقابل تلافی ہے۔ ظفر الملک

پچھلے مہینے کے رسالے

دلگداز سال گزشتہ کے آخری ماہ میں مولانا شرر مرحوم نے دلگداز کو آخری بار اپنے ہاتھوں سے مرتب کیا۔ اُنکی آخری تحریر (سنہ ۲۶ء کا خاتمہ) پڑھیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم سنہ ۲۶ء کا نہیں بلکہ خود اپنا خاتمہ لکھ رہے ہیں:

"آجکل فضائے عالم سنہ ۱۹۲۶ء کا بستر مرگ بنی ہوئی ہے۔ یہ قریب المرگ برس آج سے بارہ مہینے پیشتر دنیا میں آیا تھا .... اتنی تھوڑی ہی مدت میں اُس نے بچپن کی نادانیاں جوانی کی اُمنگیں اور بڑھاپے کی پختہ کاریاں سب دیکھ لیں، اور اب پانچ چھ روز کا مہمان ہے۔

عالم تکوین میں جتنی چیزیں ہیں مرنا اور فنا ہونا سب کے لیے ہے۔ اور سب کو یقین ہے کہ ایک دن مریں گے۔ مگر وہ دن کسی کو نہیں معلوم۔ نجومیوں، رمالوں، کاہنوں اور پاک باطن فقیروں سب سے دریافت کیا گیا، مگر ایک نے بھی قطعی طور پہ نہ بتایا کہ فرشتۂ موت سے اُسکو کب سابقہ پڑیگا؟"

معارف مدینہ کے ایک شاندار کتبخانہ کا حال پچھلے ماہ میں معارف کے صفحات سے اخذ کیا جا چکا ہے اس ماہ کے معارف سے ذیل کے گزشتہ حال گرانبہا قیمت کتبخانہ کی تصویر سید صاحب کے الفاظ میں پیش کی جاتی ہے۔ سلطان محمود عثمانی نے مدینہ منورہ میں مدرسہ محمودیہ کے ساتھ کتبخانہ محمودیہ بھی قائم کیا تھا اور انکے مصارف کے لیے شام میں ایک جائداد وقف کردی تھی۔ جب سے فرانس نے شام پر قبضہ جمایا ہے وہ آمدنی بھی غصب ہوگئی ہے۔

"اوپر کی منزل میں مسجد مبارک کی سمت کے کمرے میں کتبخانہ تھا۔ کتبخانہ کھلا گیا تو معلوم ہوا کہ شاید مدت سے یہاں کسی کا گذر بھی نہیں ہوا ہے۔ تمام گرد پڑی تھی۔ دیواروں سے لگی ہوئی الماریوں میں بترتیب کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ٹرکی نے جنگ عظیم میں مدینہ منورہ کے جن کتبخانوں کو وہاں سے شام منتقل کردیا تھا، ترکوں نے جب شام خالی کیا تو نادر کتابیں چن کر قسطنطنیہ منتقل کردیں اور بقیہ کتابیں وہیں پڑی رہیں۔ اسی اثنا میں دیار نہر میں سیلاب آیا جس سے کتابوں کو نقصان پہونچا۔ ملک میں جب تسلط ہوا اور شریف علی مدینہ کے امیر مقرر ہوئے تو متولیوں نے اُن سے کہہ سن کر کتابیں واپس منگوائیں۔ اسی طرح اس کتبخانہ کی کتابیں واپس آئیں، جن میں ایک صندوق ایسا ہے جس کی کتابیں سیلاب کے پانی سے اس طرح برباد ہوئیں کہ ورق سے ورق الگ نہیں ہو سکتا۔

اسوقت اس کتبخانہ میں پانچ ہزار کے قریب کتابیں ہیں جو الماریوں میں ترتیب سے فن وار رکھی ہوئی ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ کتبخانہ کو کسی واقف کار نے ترتیب

نہیں دیا ہے، اس لیے کہیں کی کتابیں کہیں رکھ دی گئی ہیں۔ بعض کتابیں تلاش کرنے پر ملیں بھی نہیں۔ قلمی کتابوں کے ساتھ مطبوعہ کتابیں بھی یہاں ہیں۔ کتابوں کی فہرست بھی ہے۔ جو کتابیں قسطنطنیہ چلی گئی ہیں اُن پر حرف "غ" غائب کا اشارہ بنا دیا گیا ہے۔

بہر حال یہ تو ظاہری حالت کا نقشہ ہے۔ کتابوں کو جب میں نے ہاتھ لگایا تو خوشی سے اُچھل پڑا کہ حدیث و تفسیر کا اتنا نایاب ذخیرہ اب تک میری نگاہوں نے نہیں دیکھا تھا۔ بہت سی کتابیں جنکو صرف ایک دفعہ دیکھنے کی تمنا تھی، وہ یہاں آج پوری ہوگئی۔ حسرت رہی کہ بہت سی کتابیں جن کا ایک ہی نسخہ یہاں تھا وہ قسطنطنیہ چلا گیا۔ یا اگر دو تین نسخے تھے تو کامل چلا گیا اور ناقص یہاں رہ گیا۔ کاش ترک اتنا ایثار کرتے کہ ان کتابوں کو مرکز اسلام پر دوبارہ جمع کر دیتے۔"

نگار

نگار نے دسمبر نمبر میں سید عبد القادر سروری بی اے کے قلم سے "فن افسانہ نگاری" پر ایک دلچسپ اور مفید مضمون شائع ہوا ہے۔ عام طور پر افسانہ چھوٹی کہانیوں کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے مگر اہلِ نظر جانتے ہیں کہ ایک کامیاب افسانے میں کتنی صداقت اور حقیقت پنہاں ہوتی ہے۔ مسٹر سروری فرماتے ہیں :—

"افسانہ کے اندر بھی صداقت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے مگر یہ صداقت بالکل اُسی قسم کی نہیں جسکی ہم حسابی امور سے توقع رکھتے ہیں۔ جہاں ان دونوں سے تصادم کر دیا جاتا ہے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ افلاطون بھی اسی مغالطہ کی بنا پر تمام تخیلی ادب کو "دھوکا" سمجھتا ہے۔ ..... ارسطو کے عدیم المثال دماغ نے افلاطون کے اسی مغالطہ کو پاکر ہمیشہ کے لیے اس جھگڑے کو طے کر دیا، وہ کہتا ہے کہ ہر تخیلی پیداوار میں ایک اصولی صداقت موجود ہوتی ہے جسکو حقیقت شعری کے نام سے موسوم کرنا چاہیے۔ یہ اس صداقت سے زیادہ عمیق اور زیادہ وسیع ہے جو کسی تاریخی کارنامے میں نظر آتی ہے، کیونکہ مورخ کو صرف اُنھیں اوقات تک محدود رہنا پڑتا ہے جو گذر چکے ہیں۔ لیکن افسانہ نگاری کا تعلق "کائناتِ مثالی" سے ہے ..... پہلی قسم کی صداقت کا امتحان حقائق کے ساتھ مطابقت سے کیا جاتا ہے اور یہ غیر متبدل نہیں۔ کیونکہ سائنس کی جدید معلومات قدیم نظریوں کو بے بنیاد ثابت کرتی چلی آرہی ہیں، اس لیے سائنس، حیاتیات وغیرہ کی کتابوں کو ہر وقت نئے سرے سے لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی اور تواریخ پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن دوسری قسم کی صداقت غیر متزلزل ہے، کیونکہ اس کا تعلق فطرتِ انسانی، اسکے جذبات اور احساسات سے ہے۔ فطرت انسانی کبھی بدل نہیں سکتی۔ اسلیے قدیم ترین کتب جنکا تعلق اس صداقت سے ہے آج بھی ویسے ہی قابل قدر ہیں جیسے لکھے جانے کے وقت تھے۔ خود ارسطو کے خیالات نئی تحقیقات کی روشنی میں مدھم پڑتے نظر آرہے ہیں لیکن الیڈ، آڈیسی، مہابھارت اور شاہنامہ کی دلچسپی اور عظمت کے خزانے ہمیشہ معمور رہیں گے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے "افسانہ میں سوائے نام

اور تاریخ کے ہر شے صحیح ہے اور تاریخ میں سوائے نام اور تاریخ کے کچھ صحیح نہیں"۔

ہمایوں مولوی حمید احمد کرم آبادی کے قلم سے دسمبر کے "ہمایوں" میں "اسوۂ حسنہ" پر ایک مختصر مضمون شائع ہوا ہے۔ جذبۂ انتقام میں اعتدال پیدا ہو جانے کے متعلق ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"انتقام کی رسم جاہلیت قدیمہ کا ایک تازہ یادگار ہے۔ آنحضرت کی تعلیمات کے تصدق میں عفو و رحم کے ساتھ انسانیت کی ازلی پیمان از سر نو استوار ہوا اور جاہلیت کے تمام دستور پیغمبر کے قدموں کے نیچے پامال ہو گئے۔ اس مبارک دور کا آغاز آپ نے اپنے خاندان سے کیا اور سب سے پہلے ربیعہ بن الحارث کا خون معاف کیا۔ اسی طرح وہ تمام مجرمین بھی معاف کیے گئے جو تیرہ برس تک بلکہ اسکے بعد بھی رسول اللہ اور انکی امت پر ہر قسم کے ستم توڑ کر اپنے دل کے حوصلے نکالتے رہے تھے۔ دشمنوں سے خون ریز انتقام لینے کا اصول جاہلیت قدیمہ و جدیدہ دونوں کے شعار مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ البتہ دورِ قدیم کے اہل جاہلیت کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ جو کچھ کہتے تھے وہی کرتے تھے۔ لیکن ارباب جاہلیت جدیدہ اپنا اصول حیات تو یہ بیان کرتے ہیں کہ خدا کی راہ انسان کے دونوں گال طمانچوں کے لیے بنائے گئے ہیں، مگر عملاً انکے جذبۂ انتقام کی شان ہمیشہ عرب قدیم کی ضلالت و جہالت کی ارتقائی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔ سرزمین فرنگ کے "جدید جاہل" گذشتہ جنگ عظیم سے پہلے ایک معمولی سے قتل پر بھڑک اٹھے تھے اور اس طرح تاریخ روزگار کا وہ سب سے بڑا محاربہ برپا ہوا تھا جسکے سامنے ہنگامہ گیرو دار کے افسانے گرد ہو کر رہ گئے۔ اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ نسلی و وطنی تعصب کے بت وہاں کے سامنے حرص و آز، نخوت و نفسانیت کے پجاری یورپ میں آج بھی موجود ہیں ...... دنیا کے سب سے بڑے بت شکن نے کعبہ کے تین سو ساٹھ بتوں کے ساتھ عصبیت نسل و وطن کے بت کو توڑ کر اسکی پرستش بھی حرام کر دی اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں اعلان کر دیا کہ لیس للعربی فضل علی العجمی ولا للعجمی فضل علی العربی کلکم ابناء آدم و آدم من تراب۔"

جامعہ جامعہ ملیہ کے پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اس مہینے کے "جامعہ" میں یورپ میں ڈرامے کی ترقی کے دلچسپ حالات "ڈرامہ" کے عنوان سے شائع کیے ہیں۔ روس کے آئیڈیلسٹ (تخیل پسند) ایکٹروں کے متعلق فرماتے ہیں:

"اور تھیٹروں میں یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی ڈرامہ دکھانا چاہتے ہیں تو جو ہدایتیں ڈراما نویس نے اسٹیج کے معاملہ میں دی ہوں وہ حرف بحرف پوری کی جائیں مختلف کیرکٹر کے لیے جو ایکٹر ان کے نزدیک مناسب ہوتے ہیں وہ انکو دے دیتے ہیں۔ اور چند آزمائشی کھیلوں کے بعد ڈراما پبلک کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے۔ آئیڈیلسٹ اسکول کے لیے یہ بالکل ناکافی ہے۔ وہ پہلے تو جو ڈراما دکھانا چاہتے ہیں اسکی روح کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسکا ان پر جو خاص اثر ہوتا ہے اسکو پوری طرح سمجھ لیتے ہیں اور اسکو ظاہر کرنے کے لیے

اسٹیج وغیرہ میں بھی اگر ضروری ہو تو تبدیلیاں کر لیتے ہیں۔ اسکے بعد سب ایکٹر جمع ہو کر آپس میں حصے تقسیم کر لیتے ہیں۔ اور محض یاد نہیں کرتے بلکہ آپس کی زندگی میں ایک دوسرے سے اسی طرح پیش آتے ہیں جیسے وہ کیرکٹر جن کو وہ اسٹیج پر دکھانا چاہتے ہیں۔ آزمائشی کھیل میں ایک یا دو مشیر بھی ہوتے ہیں جو تماشہ دیکھنے والوں اور آرٹسٹ دونوں کی نظر سے انکی ایکٹنگ میں اصلاح دیتے ہیں۔

اور تھیٹروں میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایکٹر ڈراما (مضمون) اور تماشہ بین کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور یہ بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنا پارٹ یاد کیا ہے اور اب دکھلا رہا ہے۔ ماسکو آرٹ تھیٹر میں یہ کشاکش نہیں ہوتی۔ کیونکہ تھیٹر کے باہر بھی سب ایکٹر ساتھ رہتے ہیں۔ اور چونکہ ایکٹنگ میں صرف دوسروں کے جذبات ظاہر کرنا شرط نہیں بلکہ ان جذبات کو بڑی حد تک ایکٹر کو اپنا بنانا بھی ہوتا ہے۔ اسلیے الفاظ اور حرکتوں کے معاملے میں بھی کافی آزادی ہوتی ہے۔ اسٹیجنگ، ایکٹنگ اور مضمون میں اس جماعت نے ایک حیرت انگیز تال میل پیدا کر لی ہے اور اسوقت اگر کوئی تھیٹر دنیا میں ہے تو وہ ماسکو آرٹ تھیٹر ہے۔"

شمع مسٹر حسن عابد جعفری اڈیٹر شمع اپنے رسالے میں "قرون وسطیٰ میں خشکی کی راہ سے ہندوستان کی تجارت اور سفر کے ذرائع" پر ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ شایع فرما رہے ہیں۔ مضمون پُر از معلومات اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نہایت مفید ہے۔ اس لیے اس ترجمہ کی آخری قسط سے پالکی کے سفر کے متعلق کچھ حالات ناظرین کی آگاہی اور دلچسپی کے لیے نقل کی جاتی ہے:۔

"جب کوئی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا چاہتا، تو پیدل یا بیلوں پر سوار ہو کر جاتا تھا، یا اگر کشتی کا راستہ نہ ہوتا تھا تو بیل گاڑی، یا دوسری قسم کی کوئی اور سواری استعمال ہوتی تھی، مختلف اقسام کی ڈولیاں، چوڈولیاں اور پالکیاں وغیرہ بھی رائج تھیں سنسکرت کی کتاب یوکتی کلپتارو (مصنفہ راجہ بھوج میں (جسکا زمانہ تصنیف گیارہویں صدی عیسوی ہے) مختلف اقسام کی ڈولیوں کا تذکرہ ہے مثلاً ڈولا، چترڈولا، انشٹاڈولا اور پانکا۔ ان پالکیوں کے مختلف سائز ہوتے تھے اور نام بھی مختلف ہوتے تھے۔ بعض انشٹاڈول ڈولیاں آٹھ کیوبٹ فیٹ لانبی آٹھ کیوبٹ فیٹ چوڑی اور چھ کیوبٹ فیٹ اونچی ہوتی تھیں اور انکو آٹھ آدمی اٹھاتے تھے۔ . . . .

یورپین لوگوں کے سفر کے لیے جو پالکیاں استعمال ہوتی تھیں وہ غالباً وہی تھیں جنکو ابوالفضل کے زمانہ میں سکھاسن کہتے تھے اور ان میں اٹھنے بیٹھنے لیٹنے اور سونے کی کافی گنجایش ہوتی تھی۔ انکی ساخت آجکل کی پالکیوں سے مختلف تھی اور تمام پہلوؤں سے مشابہ نہیں . . .

یہ لوگ (کہار) ایسے سبک رفتار ہوتے تھے کہ پالکی میں بیٹھنے والے کو جنبش نہیں ہوتی تھی اور تیرہ چودہ لیگ روز سفر کرتے تھے۔ گاڑیوں کی نسبت پالکی زیادہ گراں اور آرام دہ تھا

اور وہی لوگ اس میں سفر کرتے تھے جو مالدار ہوتے تھے"

قوس قزح قوس قزح کے مدیر اعزازی مولوی علم الدین سالک بی اے نے دسمبر کے قوس قزح میں ڈراما کا ارتقا کے عنوان سے کشوری موہن مترا ایم اے، ایم آر اے ایس کے ایک مضمون کا ترجمہ شایع کیا ہے۔ اگر جناب سالک انھیں صفحات میں فارسی ڈراما کی مفصل تاریخ بھی شایع فرمادیتے تو ایک مفید خدمت ہوتی۔ زیر نظر مضمون کا ماحصل یہ ہے کہ :-

" دور صفویہ میں (۱۵۰۲ء - ۱۷۳۶ء) شیعہ مذہب حکومت کا مذہب قرار دیا گیا اور انہی ایام میں تعزیہ کی بنیاد رکھی گئی جو رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے ایک اعلیٰ درجہ پر پہونچ گیا۔ اسوقت ایرانی ٹریجڈی جو تمثیلی مناظر کے اجتماع کا نام ہے جو فنی لحاظ سے اپنے اندر نمایاں نور رکھتی ہے مگر مضمون اور اثر کے لحاظ سے بالکل عدیم المثال ہے۔ اس صنف کی ترقی کے لیے ضرور ہے کہ اسکو مذہبی قیود سے آزاد کیا جائے۔ اور یہ بات اگر ایک دفعہ حاصل ہوگئی تو ایرانی ڈراما ایک وقت میں دنیا کی تاریخ میں بالکل نمایاں ہو جائے گا۔

اس موقع پر نہایت افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑتا ہے کہ اسوقت تک اہل ایران کی ٹریجڈی دنیائے مغرب کے اثر سے بالکل آزاد ہے۔ اسکے مقابلہ میں کامیڈی بعینہ مغربی طرز پر لکھی جاتی ہے۔ ۲۴- اکتوبر ۱۹۱۶ء میں تہران میں پہلے پہل ایک کامیڈی بعنوان "انعام زن" کھیلی گئی جو کسی روسی ڈرامہ کے ترجمہ کا نتیجہ تھا۔ اسکے بعد مندرجہ ذیل چھ ڈرامے کھیلے گئے (۱) ملا ابراہیم کیمیاگر - ۲- طبیب نباتات - ۳- خرس دزد افگن - ۴- وزیر خان لنکران - ۵- مرد خسیس ۶- دکلائے مرافعہ -)

۱۹۲۱ء میں ایک ایرانی فاضل نے ان ڈراموں پر ایک تبصرہ لکھا اور انھیں کتابی صورت میں شایع کیا۔ انکا شایع ہونا تھا کہ ایرانیوں کے تخیل کو اپنی جولانی طبع کے لیے ایک نیا میدان مل گیا۔ دنیائے ادب میں انقلاب پیدا ہوا۔ فارسی زبان جو مدت سے رسم و رواج و تصنع کی قیود میں مبتلا تھی یکسر آزاد اور مطلق العنان ہوگئی"

خیاباں نقوش طباعت، کتابت اور اعلیٰ مضامین کے ساتھ ایک نیا اردو رسالہ "خیاباں" سرونج سے جاری ہوا ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے! دسمبر کے خیاباں میں حکومت اور مذاہب ملک پر پروفیسر حبیب احمد کا ایک محققانہ مضمون شایع ہوا ہے۔ مسلمان فرمانرواؤں کی بے تعصبی کے متعلق فرماتے ہیں :-

" سلاطین دہلی جنکی قوت کا انحصار ہندو رعایا سے محاصل، سپاہ اور حکومت کی مادی قوت حاصل کرنے پر تھا انکے لیے یہ پالیسی ناممکن تھی۔ انکے لیے فرقہ وارانہ سوال تباہی تھا۔ دور وسطیٰ میں مفروضہ مظالم کی مثالیں انگلیوں پر شمار ہو سکتی ہیں اور تحقیق و تدقیق کے بعد وہ انفرادی ناانصافی کا ثبوت قرار پائیں گی نہ کہ تمام اسلامی بادشاہوں کی۔ جنگ ترائن میں افغانوں کا ایک دستہ رائے پتھورا کے زیر کمان لڑا تھا۔ مسلم توپ خانہ نے پانی پت کی تیسری لڑائی میں مرہٹوں کو کمک دی تھی۔

لیکن سلاطین دہلی کے اصول مساوات صرف اپنے قلمرو کے حدود میں تھے - ادھر انھوں نے اپنی سرحد سے باہر قدم رکھا پھر مساوات پادر ہوا تھی - تعصب کی دبی ہوئی چنگاری پھر تو شعلہ بنکر بھڑکتی تھی - محمود کی تقلید سلاطین دہلی نے دکن میں کی - اظہر من الشمس سے انکار ہی کیا؟ دور وسطیٰ کا ہر مسلم مورخ فاتح سپاہ کی غارت گری، مندروں کے ڈھانے، بتوں کے توڑنے اور بے عدیل یادگاروں کے منہدم کرنے کا تذکرہ فخریہ کرتا ہے وہ اپنے افسوسناک کارناموں پر ضرور افتخار کرتے ہیں، لیکن انکی پردہ پوشی کی ہرگز کوشش نہیں کرتے -

مندروں اور معابد کا ڈھانا اصول اسلام کے منافی ہے - اسلام کا وہ مرقع جو دور وسطیٰ کے مؤرخین نے پیش کیا ہے ہرگز اس پر اسلام کے متعلق فیصلہ نہیں کیا جا سکتا .... اور اس دور کی روایات کے مطابق دشمن کے معبد کو صفحہ ہستی سے نابید کر دینا اصول جنگ کے بالکل مطابق تھا - جب مغلوں نے ممالک اسلامیہ ایشیائے وسطیٰ، ایران، اور افغانستان پر حملہ کیا ہے تو انھوں نے مسجدوں اور معابد کے تباہ کرنے کو اپنے فاتحانہ کارناموں کا جزو قرار دیا تھا - وہ جذبہ جس نے مختلف المذاہب رعایا کے ساتھ اپنے قلمرو میں مساوات برتنے کو جائز ٹھہرایا تھا اسی نے غیر ملکیوں کے ساتھ مظالم کرنے کو خواہ ہم مذہب ہی کیوں نہ ہو جائز متصور کیا تھا - دہلی کے خلجی اور دوسرے ترکی سلاطین کی افواج میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی اور ان ہندوؤں نے جنوبی ہند کے مندروں کو تباہ کرنے میں حصہ لیا "

"سید"

رسید کتب

۱- **باقیات فانی** — مسٹر شوکت علی خاں فانی بی اے وکیل — ے ر

۲ **سرود مستاں** — پروفیسر رشید احمد صدیقی ایم اے

اردو رسائل کے خاص مضامین

(دسمبر ۲۶ء)

دلگداز - لکھنؤ

(۱) مذہب اور حکومت

معارف - اعظم گڑھ

(۱) حجاز کے کتب خانے
(۲) عجمی تصوف اور جمود اسلام
(۳) ارتقائے ادب فارسی در اکبریا

زمانہ - کانپور

(۱) کربلا (ڈرامہ)

ہمایوں - لاہور

(۱) اسوۂ حسنہ
(۲) تذکرۂ قیصر

نگار - بھوپال

(۱) فن افسانہ نگاری
(۲) رحمت کا فرشتہ [illegible]
(۳) لارڈ رپن کا عہد حکومت

مرقع - [illegible]

(۱) جذبات شعر کا اظہار

جامعہ - دہلی

(۱) ڈرامہ
(۲) جاحظ اور تاریخ طبعی

نیرنگ خیال - لاہور

(۱) مار گزیدہ (افسانہ)
(۲) مخفی مخلوق

شمع - آگرہ

(۱) تعلیم نسواں
(۲) گیتان جلی اور فلسفۂ حیات
(۳) قرون وسطے میں ہندوستان کے ذرائع تجارت

خیابان - لکھنؤ

(۱) اخلاقی تعلیم کے لیے ایک عام دستور العمل
(۲) سلطنت دہلی دور وسطیٰ کے آغاز میں-
(۳) سیفو (ڈراما)

قوس قزح - لاہور

(۱) فارسی ڈراما کا ارتقا
(۲) مغلوں اور دکنی شاہیوں کے تعلقات

تصانیفِ شررؔ پر تنقید و تبصرہ
کے لیے
انعامی مقابلہ

مولانا شررؔ مرحوم نے اُردو زبان کی جو خدمات انجام دیں، اُنکی اہمیت و عظمت کا اعتراف مختلف صورتوں میں کیا جا رہا ہے لیکن ابھی تک کسی کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہوئی کہ مولانا کی تصانیف پر مفصل تنقید و تبصرہ لکھ کر اُنکی خصوصیات کو نمایاں کیا جائے، بتایا جائے کہ ادب کے جن مختلف شعبوں کی اُنھوں نے خدمت کی اُن میں سے ہر ایک میں اُنکی کیا منزلت تھی، اور کن کن امور میں شعبہ کے دوسرے مشاہیر اہلِ قلم سے وہ ممتاز تھے، اور واضح کیا جائے کہ خالص انشا پرداز کی حیثیت سے اُنکو کس طبقہ میں جگہ ملنا چاہیے۔

الناظر میں انعامی مقابلوں کا سلسلہ شروع کرنے کا بڑا مقصد یہی ہے کہ لوگوں میں ادبی تنقید کا ذوق پیدا ہو اور جو کچھ سرمایہ ہماری زبان میں فراہم ہو چکا ہے اُسکی مختلف حیثیتوں سے جانچ پڑتال ہوتی رہے اسلیے ملک کے جملہ اہلِ قلم حضرات کو صلائے عام دی جاتی ہے کہ شرائطِ مندرجۂ ذیل کو پیش نظر رکھ کر اس ضروری، مفید اور دلچسپ موضوع پر طبع آزمائی فرمائیں۔

شرائطِ مقابلہ

(۱) مضمون فلسکیپ کاغذ کے کم از کم ۵۰ صفحوں پر صرف ایک جانب لکھا جائے
(۲) ۳۰ - جون ۱۹۲۷ء تک رجسٹری کے ذریعہ دفتر الناظر میں وصول ہو جائے
(۳) اصحاب ذیل مضامین کی جانچ کریں گے:

۱- مولوی عبد الحق بی اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو
۲- مولوی سید محفوظ علی بی اے بدایوں۔
۳- مسٹر سید سجاد حیدر (یلدرم) بی اے علی گڈھ
۴- منشی امیر احمد علوی بی اے نیمچ چھاؤنی

۵ - مولوی عبد الماجد بی اے دریاباد ضلع بارہ بنکی

(۴) بہترین مضمون نگار کو حسب ذیل انعامات دیے جائیں گے:-

۱ - تمغۂ شرف (سونے کا)

۲ - ایک سو ایک روپئے کی تھیلی

۳ - مضمون کے پچاس مطبوعہ نسخے

(۵) جس مضمون پر انعام دیا جائے گا نیز سلسلہ مضامین کے مجموعہ کے حقوق طبع و اشاعت بحق الناظر محفوظ رہیں گے اور مجموعہ شایع ہونے سے قبل کوئی مضمون الناظر کے سوا کہیں اور شایع نہ ہوسکے گا۔

۱۴ - مارچ ۲۷ء

ظفر الملک

معذرت

الناظر کا یہ نمبر باوجود انتہائی کوشش کے امید کے خلاف بہت دیر میں شایع ہو رہا ہے - دسمبر کے پرچہ کے مکمل کر چکنے کے بعد ہی شدید نزلہ میں مبتلا ہو گیا جسکی وجہ سے تقریباً دو ہفتے الناظر کے لیے کچھ نہ لکھ سکا - طبیعت صاف ہوئی تو رمضان سر پر موجود تھا چند دنوں کی مہلت میں الناظر ایجنسی کی فہرست مرتب نہ ہو جاتی تو پھر کہیں اپریل میں توجہ کرنے کا موقع ملتا - کہ ماہ صیام میں اس قسم کی دردسری گوارا نہ کی جا سکتی تھی - مجبوراً الناظر کے کام کو روکنا پڑا - بحمد اللہ کہ شعبان کے اندر ہی اندر مصنفین الناظر کی ترتیب تمام ہو گئی، اور اس پرچہ کی اشاعت تک امید ہے کہ طباعت بھی ہو جائے گی -

اب کچھ عرصہ تک انشاء اللہ الناظر پر کافی توجہ ہو سکے گی اور کوشش کی جائے گی کہ جون تک اس ششماہی کے جملہ پرچے شایع ہو جائیں تاکہ جولائی سے جبکہ الناظر کا انیسواں اور دو سالہ تعطل کے حساب سے سترھواں سال شروع ہوگا، پرچہ ابتدائی دور کی طرح پوری پابندی سے شایع ہوا کرے ——— ممکن ہے کہ اسی جد و جہد میں ایک یا دو پرچے ملا کر شایع کرنا پڑیں -

ظفر الملک

روداد سالانہ انجمن اُردو لکھنؤ

بابت ۱۹۲۶ء

جناب صدر اور معزز ارکان انجمن اُردو!

انجمن اُردو کی یہ چوتھی سالانہ رپورٹ ہے جو آپ حضرات کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے رپورٹ سنتے وقت فطرتاً یہ سوال آپ حضرات کے ذہن میں پیدا ہوا ہوگا کہ اس ایک سال کے عرصے میں انجمن نے کیا کیا کام انجام دیئے۔ میں اسکے جواب میں عرض کروں گا کہ سب سے بڑا کام جو انجمن نے کیا وہ یہ ہے کہ اپنے حامیوں کی بے توجہی کے باوجود زندہ رہی۔ اسکی یہ سخت جانی بھی داد کے قابل ہے۔ آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ میں در پردہ آپ کی شکایت کر رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں بالاعلان اپنے قصور کا اعتراف کر رہا ہوں۔ مجھے علم ہے اور آپ حضرات کو مجھ سے زیادہ علم ہے کہ ہر انجمن کا روح و رواں اُس کا معتمد ہوتا ہے۔ اگر انجمن کو ایک کل فرض کریں تو ارکان انجمن اس کل کے پُرزے ٹھہریں گے اور معتمد انجمن وہ اسٹیم قرار پائے گا جو اُن پُرزوں کو متحرک کرتی ہے۔ اگر کوئی کل بہت آہستہ آہستہ حرکت کرے تو یہ اسٹیم کا قصور ہوگا۔ اگرچہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسٹیم کمی نہ کرے لیکن کل کے پُرزے زنگ آلود ہو گئے ہوں یا بگڑ گئے ہوں مگر جہاں تک انجمن اُردو کی کل کا تعلق ہے میں آپ حضرات کو یقین دلاتا ہوں کہ اُسکے پُرزوں میں کوئی خرابی نہیں ہے اسکی آہستہ روی کی ذمہ دار صرف اسٹیم کی کمی ہے۔ مجھے انجمن کے کسی رکن سے یہ شکایت نہیں کہ میں نے اُس سے کوئی مدد چاہی ہو اور اُس نے انکار کیا ہو مجھے تو اپنے اس قصور کا اعتراف ہے کہ میں نے ارکان انجمن سے بہت کم مدد مانگی۔ اسکے ساتھ ہی میں اُن ارکانِ انجمن کا تہ دل سے شکر گزار ہوں جو انجمن کے کاموں میں دلچسپی کے ساتھ شریک ہوتے رہے ہیں اور ہر موقع پر میری مدد کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے دو حضرات یعنی مولوی ظفر الملک صاحب اور ڈاکٹر ضیاء الرحمن صاحب میرے بلکہ انجمن کے خاص شکریہ کے مستحق ہیں۔

کیونکہ ان صاحبوں نے صرف میری درخواست پر میری مدد نہیں کی بلکہ خود سے اپنے آپ کو انجمن کی خدمت کے لیے پیش کرتے رہے اور مجھے اپنے فرائض کی ادائی کی طرف متوجہ

فرماتے رہے۔

شکر و شکایت تو ہو چکی اب انجمن کی سال بھر کی کارگزاری سُنیے۔ سال تمام میں مجلس انتظامیہ کے سات جلسے ہوے۔ ان جلسوں میں جو عملی تجویزیں پیش ہوئیں اُنکا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔ ہر تجویز کے ساتھ یہ بھی عرض کرتا جاؤں گا کہ اسکے بارے میں کیا کارروائی عمل میں آئی۔

پہلی تجویز۔ انجمن کے کتب خانے کے لیے ایک مکان عہ روپیہ ماہوار کرایہ پر لیا جائے اور ارکان انجمن سے کتابیں اور اخبار وغیرہ حاصل کرکے سردست ایک دارالمطالعہ کھول دیا جائے۔ ایک چپراسی عہ روپیہ ماہوار پر اور ایک محرر صہ روپیہ ماہوار پر رکھ لیا جائے۔ اور ضروری سامان یعنی میزیں کرسیاں وغیرہ خرید لی جائیں۔ اسکے بعد بیرونی مستطیع حضرات سے کتبخانے کی مالی امداد حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس تجویز کے آخری جزو کے سوا اور سب اجزا عمل میں آچکے ہیں۔ انجمن کو جناب مولوی ظفر الملک صاحب علوی کا نہایت ممنون ہونا چاہیے کہ اُنکی اعانت سے دارالمطالعہ ماہ مارچ ۱۹۲۶ء سے کھلا ہوا ہے۔ یہی مکان جس میں آپ حضرات اسوقت تشریف فرما ہیں عہ روپیہ ماہوار پر لے لیا گیا ہے۔ ایک شخص عہ روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ لیا گیا تھا جو محرر اور چپراسی دونوں کے فرائض انجام دیتا تھا مگر کچھ دنوں کے بعد وہ ملازمت ترک کرکے چلا گیا۔ اب جون ۱۹۲۶ء سے ایک چپراسی عہ روپیہ ماہوار پر نوکر ہے۔ محرر کوئی نہیں ہے۔ محرر کے نہ ہونے سے انجمن کے کاموں میں بڑا حرج واقع ہوتا ہے۔ میرے فرائض منصبی کے علاوہ تصنیف و تالیف کا شغل، مطالعہ کتب کا شوق، اور قدیم و کمیاب کتابوں کی فراہمی کی دُھن۔ یہ کام مجھسے اس قدر مصروف رکھتے ہیں کہ مجھ کو انجمن کی محرری کا وقت نہیں مل سکتا۔ انجمن کا کام یقیناً بہت پھیلایا جا سکتا ہے اور پھیلایا جانا چاہیے لیکن اس کام کی نوعیت ایسی ہے کہ جو قدم آگے بڑھائیے اُس سے مراسلت کا ایک نیا باب کھل جاتا ہے۔ اور چونکہ خط و کتابت کا تمام کام مجھی کو کرنا پڑتا ہے اس لیے میں قلتِ فرصت کی معذوری کی بنا پر بعض مفید تجویزوں پر عمل کرنا کیا اُنکے اظہار سے بھی ڈرتا ہوں۔ بہرحال یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ انجمن کے لیے ایک محرر کی نہایت سخت ضرورت ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انجمن کی مالی حالت کے سوا کوئی امر محرر کے تقرر میں مانع بھی نہیں ہے۔ اس سال انجمن کا کام جس طرح شروع کیا گیا ہے اور جن تجویزوں پر عنقریب عمل کیا جانے والا ہے اُسے امید تو یہی ہے کہ انجمن اسقدر

تہیدست نہ رہے گی کہ ایک محرر کی تنخواہ بھی نہ دے سکے۔

بہر حال انجمن کا دار المطالعہ قائم ہے اور اخباروں اور رسالوں کی تعداد کے لحاظ سے لکھنؤ میں کوئی دار المطالعہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس میں کوئی چالیس ماہوار رسالے، اور پچیس اردو اور دس انگریزی اخبار آتے ہیں۔ مگر ہمارے پاس فی الحال فرنیچر اتنا کافی نہیں ہے کہ ہم ان تمام اخباروں اور رسالوں کو پھیلا کر رکھ سکیں اور بیس آدمیوں سے زیادہ کی نشست کا کا انتظام کر سکیں۔ اسکے علاوہ ابھی تک دار المطالعہ صرف شام کو چار گھنٹے کے لیے یعنی ۴ بجے سے ۸ بجے تک کھلا رہتا ہے۔ مجھ سے کئی صاحب فرمائش کر چکے ہیں کہ دار المطالعہ صبح کو بھی کھلا رہنا چاہیے مگر چونکہ فی الحال انجمن کے پاس صرف ایک ہی چپراسی ہے اور خطوط کی تقسیم اور چندہ کی تحصیل بھی اسی کے سپرد ہے اس لیے اُنکی فرمائش پر عمل کرنا ممکن نہ ہوا۔ مگر امید ہے کہ عنقریب انجمن کی مالی حالت اس قابل ہو جائیگی کہ وہ وقت اور جگہ دونوں کے اعتبار سے دار المطالعہ کی توسیع کر سکے۔ اُسوقت ہمارے اس ادارے سے پبلک کو موجودہ حالت کے مقابلہ میں بہت زیادہ فائدہ پہونچے گا۔

دار المطالعہ کے مصارف کے بارے میں یہ عرض ہے کہ مارچ ۱۹۲۶ء میں جب دار المطالعہ قائم کیا گیا تھا اُسوقت انجمن کے پاس مبلغ ما لیتہ تھے اور ۱۶-جون ۲۶ء کو جب انجمن کا کام میرے سپرد کیا گیا ہے تو تحویل میں صرف سے کی رقم تھی اور مکان کا ڈیڑھ ماہ کا کرایہ عہ ماہوار کے حساب سے اور چپراسی کی ڈیڑھ ماہ کی تنخواہ عہ ماہوار کے حساب سے انجمن کے ذمے واجب الادا تھی۔ اس رقم کی ادائی کے بعد انجمن کے خزانے میں صرف صہ باقی تھے اور اخباروں اور رسالوں کی قیمت کے علاوہ کوئی صہ عہ ماہوار کا دار المطالعہ کا مستقل خرچ تھا۔ میں سخت پریشان تھا کہ یہ خرچ کیونکر پورا ہوگا مگر خدا کا نام لیکر میں نے انجمن کا چارج لے لیا اور چندے کی وصول یابی کی باقاعدہ کوشش شروع کردی۔ جناب مولوی ظفر الملک صاحب کی یہ تجویز بہت مناسب تھی کہ کوئی پچاس آدمی ایسے تلاش کیے جائیں جو دار المطالعہ کی اعانت کے لیے عہ ماہوار دینا منظور کر لیں۔ مجلس انتظامیہ کے بعض ارکان نے اس کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا تھا مگر ایفائے وعدہ کی نوبت ابھی تک نہیں آئی۔ بہر حال میں نے جناب مولوی ظفر الملک صاحب کی معیت میں کئی مرتبہ دورہ کیا اور لوگوں کو انجمن کی رکنیت اور دار المطالعہ کی اعانت پر آمادہ کیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۱- آدمیوں نے انجمن کی رکنیت منظور کر لی اور

۱۳ صاحبوں نے دارالمطالعہ کے لیے عدد ماہوار دینا منظور فرمالیا۔ اگر مجلس انتظامیہ کے معزز ارکان کچھ بھی کوشش فرماتے تو تعداد اس سے کہیں زیادہ ہوتی۔ بہرحال انجمن کی رکنیت کا چندہ اور دارالمطالعہ کی اعانت کی رقم دونوں کو ملا کر مستقل ماہوار مصارف پورے کیے گئے۔ مگر اسکے علاوہ اور کوئی کام انجمن کے امکان میں نہ رہا۔

اس سال انجمن نے ایک اردو کتبخانہ کا قیام اپنا مقصد قرار دیا تھا مگر انجمن کے دفتر اور دارالمطالعہ کے مصارف نے اپنی طرف اتنا توجہ کرلیا کہ کتبخانے کی تجویز آگے نہ بڑھائی جاسکی بہرحال دارالمطالعہ بھی کتبخانے کا پیش خیمہ بلکہ ایک جزو ہے اور برائے نام کتبخانے کا افتتاح بھی ہو گیا ہے۔ طے یہ ہوا تھا کہ پہلے ارکان انجمن سے چندہ اور کتابیں حاصل کر کے ایک چھوٹا سا کتب خانہ قائم کردیا جائے اسکے بعد دوسرے حضرات سے مالی امداد کی درخواست کی جائے اور کتب خانے کو ترقی دی جائے۔ اس قرارداد کے مطابق عمل کیا گیا چنانچہ بعض حضرات نے چندے کا بعض نے کتابوں کا اور بعض نے دونوں کا وعدہ کیا۔ موعودہ چندے کی مقدار اب تک پہنچی ـــہ روپے ہے جس میں سے صرف عہ روپے وصول ہو چکے ہیں۔ جو کتابیں اب تک وصول ہوئی ہیں انکی تعداد سو کے قریب ہے مگر ان میں سے اکثر کتابیں بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کتب خانے کے سلسلے میں ابھی تک بہت کم کوشش کی گئی ہے مگر امید ہے کہ اس سال ہم کتبخانے کو کافی ترقی دے سکیں گے۔

مجلس انتظامیہ کی دوسری تجویز یہ تھی کہ انجمن کا سالانہ جلسہ بابت ۱۹۲۵ء ۲۳ - اپریل ۱۹۲۶ء کو منعقد ہو۔ چنانچہ اس تجویز پر عمل کیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک بات یہ بھی عرض کردوں کہ انجمن کا پہلا سالانہ جلسہ فروری میں دوسرا مارچ میں اور تیسرا اپریل میں منعقد ہوا تھا، اس لیے آج کا جلسہ پہلا جلسہ ہے جو ختم سال کے بعد پہلے مہینے یعنی جنوری میں ہو رہا ہے۔

تیسری تجویز یہ تھی کہ نومبر ۱۹۲۶ء میں ایک عام ادبی جلسہ کیا جائے اور اس میں گذشتہ سال یعنی ۱۹۲۵ء تک کے ادبی نتیجے اور نمائش کی رپورٹ چھاپ کر تقسیم کی جائے۔ یہ امید بھی ظاہر کی گئی تھی کہ اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد انجمن کی دوسری نمائش کے لیے چندہ فراہم کرنے میں آسانی ہوگی۔ مگر جلسے کے مصارف کا تخمینہ سو روپے کا تھا اور اتنی رقم خرچ کرنا انجمن کے امکان میں نہ تھا لہذا یہ جلسہ بھی ملتوی رہا اور رپورٹ کی طباعت و اشاعت بھی۔

چوتھی تجویز مولوی سید محمد صاحب رامپوری کے تالیف کیے ہوئے تذکرۂ شعرا کے بارے

یں تھی۔ جناب مولف نے فارسی اور اُردو شعرا کے ہم معنی اشعار کا ایک مجموعہ مرتب کر کے س کا نمونہ کتاب کی اشاعت کی غرض سے انجمن کے پاس بھیجا تھا۔ مجلس انتظامیہ نے ایک سب کمیٹی اس غرض سے بنادی کہ وہ اس کتاب کو دیکھ کر فیصلہ کرے کہ انجمن کی طرف سے اسکی شاعت مناسب ہے یا نہیں۔ اور اگر مناسب ہو تو مصارف کا تخمینہ بھی پیش کرے۔ میں نے فاضل مولف کو مجلس انتظامیہ کی اس کارروائی کی اطلاع دی اور لکھا کہ اگر کتاب میں شعرا کے حالات اور اُنکی شاعری پر تبصرہ وغیرہ بھی ہو تو وہ سب کمیٹی کے سامنے کے لیے بھیجدی جائے۔ اسکے جواب میں مولوی صاحب نے ایک طویل خط لکھا جس سے معلوم ہوا کہ اُنکی کتاب محض ہم معنی اشعار کا مجموعہ ہے۔ اُنھوں نے اپنے خط میں انجمن کی ناقدرشناسی پر کچھ غصہ بھی فرمایا اور کتاب کا نمونہ واپس منگوالیا۔

پانچویں تجویز پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی تقریروں کے متعلق تھی۔ آخر اگست میں جناب پنڈت منوہر لال صاحب زتشی سے معلوم ہوا تھا کہ آیندہ موسم سرما میں حضرت کیفی چند روز کے لیے لکھنؤ تشریف لائیں گے۔ مجلس انتظامیہ نے اپنے ۵۔ ستمبر کے جلسے میں طے کیا کہ جناب کیفی سے درخواست کی جائے کہ وہ لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں ادبِ اُردو پر چند تقریریں فرمائیں۔ جناب موصوف نے انجمن کی یہ درخواست منظور کرلی اور ایک تقریر کرنے کا وعدہ فرمایا۔ بعد کو اطلاع دی کہ وہ یکم سے ۱۲۔ جنوری ۲۷ء تک لکھنؤ میں قیام کریں گے۔ چنانچہ مجلس انتظامیہ نے اپنے ۶۔ دسمبر کے جلسہ میں آپ کی تقریر کے انتظامات کے لیے ایک سب کمیٹی بنا دی۔ اس کمیٹی کے حُسنِ انتظام سے یہ تقریر ۱۰۔ جنوری ۲۷ء کو کرسچین کالج لکھنؤ کے ریڈ ہال میں جناب آنریبل جسٹس وزیر حسن صاحب کی صدارت میں ہوئی۔ تقریر کا موضوع تھا "اُردو اور لکھنؤ"۔ یہ موضوع ادبِ اُردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے عموماً اور حضرات لکھنؤ کے لیے خصوصاً نہایت دلکش تھا۔ اس لیے گو کہ وہ تعطیل کا دن نہ تھا اور اُسی وقت لکھنؤ یونیورسٹی میں بھی ایک نہایت دلچسپ موضوع پر تقریر ہونے والی تھی پھر بھی مجمع بہت کافی ہوگیا تھا۔ جناب کیفی کا یہ لکچر نہایت مفید، دلچسپ اور معلومات سے پُر تھا۔ سامعین نے اُسے نہایت پسند کیا۔ اگر اس طرح کے لکچر انجمن کی طرف سے وقتاً فوقتاً ہوتے رہیں تو اُردو زبان و ادب کی طرف توجہ کرنے کی ایک تحریک پیدا ہو جائے اور انجمن کے قیام کا ایک اہم مقصد حاصل ہو جائے۔ سال گزشتہ انجمن کی مالی حالت ان ادبی جلسوں کے مصارف کا تحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر اس سال ممکن ہوا تو کئی تقریریں

کا انتظام کیا جائے گا۔

چھٹی تجویز کے ذریعہ سے ایک سب کمیٹی اس غرض سے بنائی گئی کہ وہ انجمن کے کتب خانے کے لیے کتابیں فراہم کرے اور جو سرمایہ کتب خانے کے لیے جمع ہوا ہے اُس سے کتابیں وغیرہ خریدے۔ یہ کمیٹی ۶ دسمبر کو بنی تھی مگر ابھی تک اس نے کوئی کام انجام نہیں دیا۔ انجمن کے پاس ابھی اتنا سرمایہ بھی نہیں ہے کہ کتب خانے کے انتظام کے لیے کسی کمیٹی کی ضرورت ہو۔ کتابوں کی فراہمی کی ایک یہ صورت ذہن میں آئی تھی کہ لکھنؤ میں جتنے اہل مطبع ہیں اُن سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنے مطبوعات کا ایک ایک نسخہ انجمن کے کتب خانہ کے لیے مرحمت کریں۔ چنانچہ اس سلسلے میں میں نے مولوی ظفر الملک صاحب کی معیت میں ایک دن دورہ کیا۔ اتفاق سے صرف مطبع نامی کے منیجر صاحب سے عرض حال کی نوبت آئی۔ اُنھوں نے ہماری درخواست نہایت خوشی سے منظور فرمالی۔ کتابیں ابھی تک اُنکے یہاں سے نہیں آئی ہیں مگر عنقریب آجائیں گی۔ اور امید ہے کہ اسی طرح تمام اہل مطبع سے کتابیں کافی تعداد میں مل جائیں گی۔

ساتویں تجویز میں یہ طے ہوا کہ اس صوبے کے جو امرا معززین موسم سرا میں کونسل کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے تشریف لاتے ہیں اُن کی خدمت میں انجمن کی طرف سے وفد بھیج کر انجمن کے سرمایے کے لیے امداد حاصل کی جائے۔ اس تجویز کو عمل میں لانے کے لیے ایک سب کمیٹی بنا دی گئی تھی اور جناب نواب سید محمد زکی علی خاں صاحب ہاتف اُس کے داعی مقرر کیے گئے تھے۔ نواب صاحب موصوف اپنے صاحبزادے کی بیماری کی وجہ سے اب تک کوئی کام نہ کرسکے۔ موصوف کی طرف سے میں نے اُس کمیٹی کا ایک جلسہ کرکے کمیٹی کا نظام عمل طے کرلیا ہے انشاءاللہ اسی ہفتے میں بعض معززین کو خط لکھ کر وفد کی روانگی کی تاریخ اور وقت مقرر کرلیا جائیگا اور وفد مرتب کرکے اُنکی خدمت میں بھیجے جائیں گے۔ اس سلسلے میں یہ خوشخبری بھی سنا دوں کہ انجمن کا ایک وفد جناب نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب کے۔ سی۔ آئی۔ ای + او۔ بی۔ ای کی خدمت میں اس ماہ کی ابتدا میں حاضر ہوا اور نواب صاحب موصوف نے سو روپے کا عطیہ انجمن کو مرحمت فرمایا جسکے لیے انجمن کو شکرگزار ہونا چاہیے۔

یہاں تک تو سال گذشتہ کی روداد تھی۔ اب کچھ سال رواں کے بارے میں بھی عرض کردوں۔ اس سال کا آغاز جس شان سے ہوا ہے اُس سے اُمید کی جاتی ہے کہ انجمن اس سال اپنے مقاصد میں بہت کچھ کامیابی حاصل کرے گی۔ اس سال کا ایک مہینہ بھی ابھی تمام نہیں

ہوا ہے اور انجمن دو قابلِ ذکر کام کر چکی ہے ایک جناب کیفی کی تقریر جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اور دوسرے جناب کیفی کی دعوتِ چائے نوشی جس میں شہر کے معززین اور اہلِ علم و ادب اچھی خاصی تعداد میں شریک تھے۔ اس دعوت کے سلسلے میں جناب سید احمد حسین صاحب رضوی آنریری مجسٹریٹ لکھنؤ کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے۔ اگر سید صاحب بروقت انجمن کی مالی اعانت نہ فرماتے تو انجمن اس دعوت کے مصارف برداشت کرنے کے قابل نہ ہوتی۔ کاموں کے علاوہ آمدنی کے اعتبار سے بھی یہ سال انجمن کے لیے بہت مبارک معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ پہلے ہی مہینے میں اس کی آمدنی دو سو سے اوپر پہونچ چکی ہے۔ یہ رقم گو بہت بڑی نہیں ہے لیکن انجمن کی آمدنی کی رفتار دیکھتے ہوئے نہایت درجہ اطمینان و مسرت کے قابل ہے۔

گوشوارۂ آمدنی و خرچ آڈیٹر صاحب کی رپورٹ میں درج ہے جو اس رپورٹ کے ساتھ منسلک ہے۔ اتنا اور عرض کر دینا ضروری ہے کہ [illegible] کی رقم جو اختتامِ سال پر تحویل میں رہ گئی ہے اس میں [illegible] کتب خانے کی رقم ہے۔ باقی رہتے صرف [illegible] لیکن مکان انجمن کا تین ماہ کا کرایہ یعنی [illegible] واجب الادا تھا اس طرح حقیقت میں تحویل میں کچھ رقم ہونا کیا انجمن کوئی [illegible] کی قرضدار تھی۔ اس بیان سے ارکانِ انجمن کی ہمت شکنی مقصود نہیں۔ مجھ کو قوی اُمید ہے کہ سالِ رواں میں انجمن کی مالی حالت قابلِ اطمینان رہے گی۔

خاکسار

سید مسعود حسن رضوی ام۔ اے

معتمد انجمن اُردو۔ لکھنؤ

آڈیٹر صاحب کی رپورٹ

بخدمت جناب صدر انجمن صاحب انجمن اردو لکھنؤ

تسلیم - حسب ہدایت مجلس انتظامیۂ انجمن اردو میں نے انجمن کے حساب آمد و خرچ بابت ۲۶-۱۹۲۵ء کی جانچ کی اور اسکا نتیجہ حسب ذیل خلاصہ کی صورت میں پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں -

جملہ آمدنی دوران ۱۹۲۶ء	ادلسه	جملہ مصارف ۲۶-۱۹۲۵	۱۱معسه ۵/
بقایائے ۱۹۲۵ء	اموسه ۱۱/	باقی در تحویل	مدللعسه ۶/
میزان	ماعسه ۱۱/	میزان	ماعسه ۱۱/

رجسٹر کے جملہ اندراجات آمدنی کا تطابق رسید بہی سے کرلیا گیا ہے۔ البتہ مصارف کے جملہ پرچے اور ... اکثر موجود نہیں ہیں اس لیے انکا تطابق نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال چونکہ مصارف معینہ و منظور ہ ہیں اس لیے بعض رسیدات اور پرچوں کی عدم موجودگی کے باوجود مجھے یقین ہے کہ حساب بالکل درست ہے۔

امید ہے کہ آئندہ سال میں ان پرچوں اور رسیدوں کی حفاظت کا اہتمام کیا جائے گا۔

۲۸- جنوری ۱۹۲۶ء   خاکسار ظفر الملک

... مرحوم

- ...عجائب
- ...ے سرور

...مینائی مرحوم

- ...لغات ناکمل
- ...عشق
- ...یب
- خاتم النبیین
- ...سخن
- ...ب امیر مینائی

...ل مرحوم

- زبان اردو
- ...ائے دلکش
- ...رین
- تذکیر و تانیث
- تاریخ
- منتخب

محمد عباس ... مرحوم

- نادر جہان
- ...سہیلی

...فضل حسین ثابت

- ...در بیر
- ...سین

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانہ آزاد جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلیٰ کبلاں نا دل
- کامنی
- بچھڑی دلہن

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- میٹھی چھری
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

منشی جوالا پرشاد برق

- مرزالنی
- مار آستین
- بنگالی دلہن
- معشوقہ فرنگ
- پرتاب
- رودہنی

پریم چند

- پریم بتیسی
- بازار حسن

مولینا عبدالحلیم شرر

- جنید بغدادی
- خواجہ معین الدین چشتی
- تذکرہ مشاہیر عالم
- مخدرات
- قیس و لبنی
- مقدس نازنین
- ایام عرب
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور
- الفانسو
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین
- نیکی کا پھل
- جویائے حق
- بابک خرمی
- طاہرہ
- شوقین ملکہ
- یوسف و نجمہ
- گزشتہ لکھنؤ
- شاعرانہ و عاشقانہ مضامین
- آغاز و ختم سال
- سیر رجال
- تاریخی و جغرافی مضامین
- مینا بازار

حکیم محمد علیخان مرحوم

- رام پیاری کامل
- عبرت کامل
- حسن سرور کامل
- اختر و حسینہ
- دیول دیوی
- جعفر و عباسہ

شوق قدوائی مرحوم

- ترانہ شوق
- قاسم و زہرہ
- نیرنگ جمال
- گنجینہ
- سیکفرن اور لوسی

خواجہ عبدالروف عشرت

- زبان دانی
- اصلاح زبان اردو
- قواعد میر
- اصول اردو
- جان اردو
- شاعری کی پہلی کتاب
- " دوسری کتاب
- " تیسری کتاب
- لغات اردو

منشی محمد احسن وحشی

- محبوس کنشت
- جام زہر

مولینا حکیم عبدالحی مرحوم

- یاد ایام
- تذکرہ گل رعنا

حکیم احمد حسین الہ آبادی

- تاریخ ابن خلدون جلد اول
- " " " دوم
- " " " سوم
- " " " چہارم
- " " " پنجم
- " " " ششم
- " " " ہفتم
- " " " ہشتم
- " " " نہم
- " " " دہم
- " " " یازدہم
- سلطان صلاح الدین
- نور الدین محمود

مولوی محمد حلیم انصاری

- الاسلام والنصرانیہ
- فتح اندلس
- ابو مسلم خراسانی
- تاریخ عرب

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی

- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف
- تذکرۃ الشعراء میر حسن

حافظ اسلم جیراجپوری

- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنو امیہ
- خلافت بنو عباس
- عباسیہ بغداد
- علوم عرب

قاضی محمد سلیمان منصور پوری

- رحمۃ للعالمین
- سفرنامہ حجاز

مولوی خلیل الرحمن

- اخبار الاندلس جلد
- تاریخ مولدین
- مختصر تاریخ اسلامی
- عذرا

مولوی محمد انشاء اللہ

- سیرۃ الرسول
- تاریخ آل عثمان
- حالات عراق عرب و عجان
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخ مراکش و مغرب الاقصیٰ

منشی سعید احمد مارہروی

- آثار اکبری
- حیات خسرو
- امرائے ہنود

...لیلہ ۔ مہاتما بدھ کی مختصر سوانحعمری اور ان کی مذہبی تعلیم نہایت دلکش انداز میں لکھی گئی ہے۔ قیمت صرف .. ۴

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز عا ر
- ذکر مارہی عہ ر

خواجہ عباد اللہ اختر
- صدیق اکبر ۱۲ آ
- حضرت زید ۶ ر
- مشاہیر اسلام ۱۲ آ
- بغداد ۶ ر
- دمشق ے ر
- دیوان حافظ مع شرح ے

مفتی انوار الحق ایم اے
- تاریخ ابو البشر عہ
- تذکرۃ الحبیب عہ ر
- حقایق اسلام عا ر

میر ولی اللہ بی اے
- [illegible] عا ر
- [illegible] الکرام ے ر
- لسان الغیب جلد اول
- دوم عا ر
- سوم عا ر
- چہارم عا ر

سید مسعود بی اے
- نصاب اردو عہ
- جاپان کا تعلیمی نظم ے ر
- انتخاب زرین عا

مولانا حسرت موہانی
- شرح دیوان غالب عہ ر
- مکمل دیوان حسرت عا ر

سید سجاد حیدر بی اے
- خیالستان عہ
- ثالث بالخیر ۸ ر
- زہرا ۱۲ ر
- جلال الدین خوارزم شاہ عہ ر

مسٹر ظفر عمر بی اے
- چوروں کا کلب ۹ ر
- نیلی چھتری ۴ آ
- بہرام کی گرفتاری عہ ر
- مستقبل اسلام ۵ عہ

پروفیسر فیروز الدین مراد
- تحفہ سائنس ے ر
- بادل کے نیچے عہ ر
- خونابہ عشق عہ ر

حکیم احمد شجاع بی اے
- باپ کا گناہ عا ر
- حسن کی قیمت عا ر

منشی عبد المجید سالک بی اے
- راہ و رسم منزلہا ۸ ر
- چھپا دیا افسانے عہ
- چترا (ٹیگور) ۱۲ ر

منشی احمد علی بی اے
- تاریخ تمدن ے ر
- شباب لکھنؤ ۸ ر

مولوی عبد الماجد بی اے
- فلسفہ جذبات عا ر
- مکالمات برکلے عہ ر
- پیام امن ۴ آ
- تصوف اسلام عہ ر
- فلسفیانہ مضامین عہ
- زود پشیمان ۸ ر

منشی محمد لطیف بی اے
- اکبر ۴ آ
- اورنگ زیب ۴ آ
- رنجیت سنگھ ۴ آ
- لارڈ کلایو ۴ آ

پروفیسر نواب علی ایم اے
- معارج الدین ۱۲ آ
- تذکرۃ المصطفیٰ عہ
- صحف سماوی ے ر
- شمع سخن ۱۰ ر

پروفیسر الیاس برنی ایم اے
- جذبات فطرت چار حصے للعہ ر
- معارف ملت " للعہ ر
- مناظر قدرت " للعہ ر
- علم المعیشت عہ

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن للعہ
- سیرۃ عائشہؓ ے ر
- حیات امام مالک عہ ر
- خلافت عثمانیہ اور اسلام ۴ آ
- خلافت اور ہندوستان ۴ آ

مولوی عبد السلام ندوی
- اسوہ صحابہ ۲ جلد ے ر
- سیرۃ عمر بن عبد العزیز عہ
- انقلاب الامم عا ر
- تاریخ الحرمین الشریفین عا ر
- شعرائے اسلام عہ
- فطرت نسوانی عہ
- شعر الہند ۲ جلد ے

مولوی عبد الباری ندوی
- مبادی علم انسانی عہ
- برکلے کا فلسفہ عہ

مولوی سعید انصاری
- سیر الصحابہ جلد اول ے ر
- سیر الانصار ۲ جلد ے ر
- سیر الصحابیات عا ر

مولوی عبد الرزاق ندوی
- اسوہ حسنہ عا ر
- کتاب الوسیلہ عا ر
- ٹرکی اور یورپ ۶ ر

خواجہ حسن نظامی
- قرآن آسان قاعدہ عہ ر
- میلاد نامہ عہ ر
- محرم نامہ عہ ر
- فاطمی دعوت اسلام ے ر
- ذکر غوث پاک ۱۲ ر
- کرشن جیون عہ
- شامی جہاد عہ
- سیپارہ دل عا ر
- گم تو موت عہ
- چٹکیاں اور گدگدیاں ۱۲ ر
- اتالیق خط نویسی عہ ر
- روزنامچہ عا ر
- بیوی کی تعلیم ۴ آ
- بیوی کی تربیت عہ ر
- اولاد کی شادی عہ ر
- جگ بیتی کہانیاں ۱۰ ر
- آپ بیتی ۴ آ
- بچوں کی کہانیاں ۱۲ ر
- سیر دہلی ۱۲ ر
- سفرنامہ ممالک اسلامیہ عا ر
- غدر دہلی کے افسانے عہ
- یزید نامہ ۴ آ
- طمانچہ برخسار یزید عہ ر
- اردو دعائیں ۸ ر
- تسکین احساس ۸ ر
- روزنامچہ ہند ۱۲ ر
- اسلام کا انجام ۲ ر
- تسخیر مہر و قہر ۱۰ ر

مولوی عبد الراشد الخیری
- الزہرا عہ
- صبح زندگی عہ
- شام زندگی عہ ر
- شب زندگی عا ر
- نوحہ زندگی ۱۲ ر
- در شہوار ۱۰ ر
- منازل السائرہ
- سراب مغرب ۸ ر
- بنت الوقت ۸ ر
- قطرات اشک عہ
- جوہر قدامت عہ
- عروس کربلا عہ
- یاسمین شام عہ
- تیغ کمال عہ
- ماہ عجم عہ
- محبوب خداوند عہ
- موودہ ۴ آ

نیاز فتح پوری
- گیتان جلی عا
- گہوارہ تمدن عا
- نگارستان عا
- صحابیات عا
- تاریخ الدولتین عا

یاس عظیم آبادی
- چراغ سخن ۴ آ
- نشتر یاس ۸ ر

تاریخ اندلس یعنی موروں کے استقلال مسلمانوں کی شجاعت اور انگریزوں کی حکمت کا آئینہ [illegible] قیمت ۱۲ ر

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۰۸

ہوالمستعان

الناظر

ایڈیٹر ـــــ ظفرالملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ عمہ

قیمت فی پرچہ ۸ر

باللہ

فہرست مضامین ماہ فروری و مارچ ۱۹۲۷ء

نمبر ۲ و ۳ جلد ۳۲

نئی کتابیں

مثنوی خواب و خیال - خواجہ میر درد دہلوی کے برادر خورد خواجہ میر اثر کی نایاب مثنوی جو سلاست و فصاحت کی کان ہے اور جسکے تتبع میں بقول مولانا حالی، نواب مرزا شوق نے اپنی مشہور مثنویاں زہر عشق وغیرہ لکھی تھیں، اب پہلی بار زیور طبع سے آراستہ ہوئی ہے - مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے مقدمہ، فہرست مضامین اور حواشی کا اضافہ کرکے اس ادبی تبرک کی قدر دوبالا کردی ہے - قیمت ۱۲؍

عالم خیال - منشی احمد علی شوق قدوائی مرحوم کی لاجواب نظم جو دو بار چھپ کر مقبول عام ہو چکی ہے اب تیسری بار بالکل نئے قالب میں شائع ہوئی ہے - مصنف نے انتقال سے کچھ مدت پیشتر بہت سی ترمیمیں کردی تھیں، پھر نظم کی مناسبت سے ایک تصویر خاص اہتمام سے بنوا کر لگائی گئی ہے اور بیگم صفدر علی نے ایک دلچسپ مقدمہ تحریر کیا ہے - قیمت ۸؍

عبرت - خواجہ عبدالحی صاحب اُستاد تفسیر جامعہ ملیہ کی تفسیر الفرقان فی معارف القرآن کی تازہ جلد جس میں سورۂ یوسف کی معنی خیز تفسیر لکھی گئی ہے - قیمت ۸؍

امداد باہمی - انجمن ہائے امداد باہمی کی ابتدائی تاریخ اور اُنکے بنیادی اصول و اعمال، ممالک متمدنہ میں اُن کا تدریجی نشو و نما اور عالمگیر وسعت، امداد باہمی کے مختلف طریقوں کی تشریح، اقتصادی فلاح کے لیے اسکی ضرورت و اہمیت اور بنکہائے سرمایہ شرکت و انجمنہائے امداد باہمی کے اساسی مسائل اور طریقۂ کار کی نوعیت اور اُنکا باہمی تقابل وغیرہ - اُردو زبان میں اس موضوع پر پہلی جامع اور مبسوط کتاب منشی اظہر علی بی اے وکیل نے لکھی ہے - حجم ۲۰ جزو - ۳ عکسی تصویریں قیمت عمہ؍

فسانۂ جوش اُردو کے مشہور فسانہ نگار اور ظریف انشا پرداز مسٹر سلطان حیدر جوش کے اُن دلچسپ و مؤثر فسانوں اور دلآویز و پُر کیف مضامین کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً رسالۂ الناظر میں شائع ہوئے - حجم ۲۰۰ صفحے - قیمت عہ؍

سفرنامۂ برہما - جس میں برہما کی اخلاقی، معاشرتی، تجارتی، تعلیمی، سیاسی زندگی کو بتفصیل تحریر کیا گیا ہے اور عصر موجودہ کے تمام چشمدید حالات و واقعات مندرج ہیں - مصنفہ مولانا سید ابو ظفر ندوی پروفیسر بہادر یالے کالج احمد آباد - قیمت عہ؍

(مصنفین اُردو بابت ۲۷ء ایک آنہ کا ٹکٹ بھیجکر منگا لیجیے)

منیجر الناظر کتاب ایجنسی، لکھنو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۲و۳ جلد ۳۲ — فروری و مارچ سنہ ۱۹۲۷

ملوکیت و جمہوریت

مضمون مندرجۂ ذیل میں اختصار کے ساتھ میں نے اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں ورنہ اسکے ہر عنوان پر بسیط بحثیں ہو سکتی ہیں۔

اس تحریر سے مجھے کسی کی حمایت یا مخالفت مقصود نہیں، بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ اسلامی زاویۂ نگاہ سے ان مسائل کو دکھلانے کی کوشش کروں جو اسوقت ہندوستان کے مسلمانوں میں موجبِ اختلاف بنے ہوئے ہیں

اسلم

اس میں کچھ شک نہیں کہ جمہوریت اُس مساوات اور اخوت کی روح کے مطابق ہے جسکا اسلام خاص طور پر مبلغ ہے۔ چنانچہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اُنکے شاگردانِ خاص یعنی صحابۂ کرام نے جمہوریت ہی پر اسلامی نظام حکومت کی بنیاد قائم کی۔

لیکن ملوکیت بھی اسلام کے مخالف نہیں۔ کیونکہ قرآن میں ملوک کا ذکر ہے اور احسان کے موقع پر ذکر ہے۔ نیز خود اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے طالوت کو ملک قرار دیا تھا۔

صحابۂ کرام نے جو جمہوری نظام قائم کیا تھا وہ بھی خالص جمہوری نہیں کہا جا سکتا، بلکہ ملوکیت بھی اُس میں شامل تھی - کیونکہ ایک طرف اگر خلیفہ کے انتخاب میں امت کے شوریٰ کی حاجت تھی، تو دوسری طرف اُسکے اختیارات بھی بادشاہوں کی طرح غیر محدود تھے - اور گو اُمت کا ہر فرد اُس سے محاسبہ کرنے کا مجاز تھا، لیکن ساری امت باوجود مخالفت کے بھی اُسکے حکم پر مجبور رہتی جب تک کہ وہ معصیت نہ ہو۔

تاہم جمہوریت کے اسی تخم کی ملتِ اسلامیہ نے اگر پرورش کی ہوتی تو یہ ایک ایسا عظیم الشان تناور درخت ہوا ہوتا جسکے سایہ میں تمام عالم امن و راحت سے بسر کرتا، مگر افسوس کہ یہ بھی بہت جلد ضایع کر دیا گیا اور خلفاء راشدین کے بعد بنی اُمیہ اور پھر بنی عباس کی استبدادی، خاندانی اور وراثتی حکومتیں خلافت کے نام سے قائم رہیں۔

زوال بغداد یعنی سنہ ۶۵۶ھ کے بعد سے تو محض خلافت کا نام قائم رکھنے کے لیے سلاطین مصر نے بقایائے بنی عباس میں سے قاہرہ میں وظیفہ خوار خلفاء رکھے جن سے سنہ ۹۲۲ھ میں فتح مصر کے بعد خلافت آلِ عثمان کو حاصل ہوئی - لیکن انکے یہاں بھی خاندانی اور وراثتی ہی رہی تا آنکہ ۳ مارچ سنہ ۱۹۲۴ء میں غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے اس نام کی خلافت کو مٹا کر جمہوریۂ ترکیہ قائم کر دی۔

یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ خلافت راشدہ مسلمانوں کا ایک متحدہ نظام تھا - بنی امیہ نے بھی باوجود اپنے استبداد کے تمام عالم اسلامی کو ایک ہی جھنڈے کے نیچے رکھا اور شیرازۂ اتحاد ٹوٹنے نہ دیا - لیکن عہد بنی عباس سے یہ وحدت جاتی رہی - اُندلس روز اول سے انکی حکومت میں نہ آیا - پھر جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، رفتہ رفتہ عالم اسلامی کے ایک ایک حصے خود مختار ہو کر انکی ماتحتی سے نکلنے لگے - بعض بعض نے خلافت کے بھی دعوے کر دیے۔ چنانچہ ایک زمانہ میں عالم اسلامی میں تین خلافتیں قائم ہو گئی تھیں - خلافت اندلس بنی امیہ - خلافت مصر بنی فاطمہ - خلافت بغداد بنی عباس - اس تشتت اور افتراق کے جو نتائج ہونے چاہیے تھے وہ ہوئے - یعنی اکثر اسلامی ممالک کمزور ہو گئے - اور اُن پر غیر مسلم قوموں نے آکر قبضہ کر لیا -

جمہوریۂ ترکیہ

اسوقت جو ممالک مسلمانوں کے ہاتھوں میں بچ رہے ہیں وہ افغانستان، ایران، ترکی اور عرب ہیں - جن میں سے عرب و افغانستان میں شخصی

ایران میں مشروطہ، اور ترکی میں جمہوری حکومت ہے۔ لیکن یہ سب شقاق و افتراق کے مظاہر ہیں، جو امت اسلامیہ کے زوال کا اصلی سبب ہیں۔ ترکی جمہوریہ، اسلامی جمہوریہ نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی صرف ایک جماعت کی جمہوریہ ہے۔ اور جو لوگ اسلامی جمہوریت کا صحیح مفہوم سمجھتے ہیں وہ کبھی اسکو جائز نہیں رکھ سکتے کہ امت کی ہر ایک جماعت الگ الگ اپنی جمہوریت بنالے اور اقوام مسلمہ میں سے ہر ایک اپنی انفرادی اور جداگانہ زندگی بسر کرے۔

جمہوریت خود کوئی مقصود بالذات یا متبرک اور مقدس شے نہیں ہے، اسکی خوبی اور برکت یہی ہے کہ اسکی بدولت تمام ملک کا شیرازۂ اتحاد بندھتا ہے۔ صحابہؓ نے جو جمہوریت قائم کی تھی اُسکی ترقی اور عظمت کا راز یہی تھا کہ وحدتِ امت اس میں مستتر تھی جسکو بنی اُمیہ نے بھی باوجود استبداد کے قائم رکھا۔ چنانچہ ۱۳۲ھ یعنی زوال بنی امیہ تک عالم اسلامی میں بجز ایک خلافت کے اور کوئی حکومت اور بجز ایک خلیفہ کے اور کوئی حکمراں نہ تھا۔

جمہوریتِ حجاز

حجاز کی جمہوریہ جسکا مطالبہ مسلمانان ہند کی ایک جماعت بڑے شد و مد سے کر رہی ہے، یہ بھی ترکی جمہوریہ کی طرح ایک مقامی اور جزئی جمہوریہ ہوگی، جو اسلام کے کسی اصول پر مبنی نہیں۔

یہ ممکن ہے کہ مسلمان ایک ایک گاؤں، ایک ایک قبیلہ بلکہ ایک ایک خاندان کی جمہوریت قائم کرلیں، لیکن اسکو سوائے شقاق و افتراق ملت کے اور کچھ نہیں کہا جائیگا۔

اسلامی جمہوریہ جغرافی حدود، اور زبان یا نسل کی یگانگت سے بہت بالاتر ہے۔ اسکی تعمیر صرف عالم اسلامی کی وحدت ہی پر ہو سکتی ہے جیسے کہ آغاز اسلام میں ہوئی تھی۔ محض حجاز کی جمہوریت سے کوئی ملی مرکز نہیں قائم ہو سکتا۔ کیونکہ جو مسلمان غیر حکومتوں کے ماتحت ہیں وہ اسکی حکمبرداری کے قابل نہیں۔ اور جو خود اپنی مستقل سلطنتیں رکھتے ہیں شلاً ترک و افغان وغیرہ، انکے قوانین منضبط ہیں جن سے وہ ایک انچ ہٹنا نہیں چاہتے اور نہ کسی بیرونی حکومت کے خواہ حجازی ہی کیوں نہ ہو محکوم ہو سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں جمہوریۂ حجاز بجز اہل حجاز کے اور کسی کی نہ ہوگی۔ اور کوئی دوسرا مسلمان اُسکے احکام کا نہ مخاطب ہوگا نہ پابند۔

بے شک دینی مرکزیت کا شرف جو اسکو حاصل ہے وہ جمہوریت اور ملوکیت دونوں حالتوں میں یکساں ہے۔

الحجاز للحجازئین یہ دلفریب جملہ یا نعرہ بھی اسلام کے مطابق نہیں ہے، بلکہ خالص مغربی ہے۔ جہاں ہر ایک قوم نسلی اور جغرافی تقسیم میں منقسم ہے۔ اور صرف اپنی اپنی خیر منا رہی ہے۔ اسلام کا تو صرف ایک ہی نعرہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ " الارض للمسلمین "۔

کسی شخص کی نگاہ میں وحدتِ اسلام نہیں، اگر کم سے کم وحدتِ عرب ہی ہو تو وہ بھی جمہوریت حجاز کو تفریق امت ہی قرار دے گا۔ اور عرب میں پہلے ہی سے تفریق کی کمی نہیں۔ نجد میں آلِ سعود ہیں، بحرین میں آلِ خلیفہ، کویت میں آلِ صباح، عسیر میں آدریسی، صنعاء میں امام یحییٰ، عراق میں فیصل۔ الغرض نصف درجن ائمہ و شیوخ میں ایک اور صدرِ حجاز کا اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن یہ صدرِ حجاز غالباً سب سے زیادہ بے طاقت ہوگا۔ کیونکہ وہاں کا ذریعۂ آمدنی بجز تبرعات حجاج و زائرین اور کچھ نہیں۔ ایسی صورت میں یہ جمہوریہ کیا نفع دیگی جبکہ اسکی حیثیت ایک بین الاقوامی خانقاہ سے زیادہ نہ ہوگی۔ اور جسکا بے طاقت صدر ایک مجاور سے بڑھ کر نہ ہوگا۔

علاوہ بریں اس قسم کی جزئی اور مقامی جمہوریات کے لیے صرف اُسی مقام کے لوگ دعوے کے حقدار ہو سکتے ہیں، دوسروں کو شورش کرنے کا کوئی حق نہیں ہو سکتا۔ نہ وہاں کی تشکیل ہیئت حکومت میں انکی رائے کوئی اثر ڈال سکتی ہے۔

بیشک فریضۂ حج اسلام کا ایک رکن ہے جسکو ادا کرنے کے لیے اُمم اسلامیہ حجاز میں ہر سال مجتمع ہوتی ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ جو حکومت وہاں ہو وہ حج کی ادائگی میں حتی الوسع آسانیاں پیدا کرے اور کتاب و سنت کے خلاف عمل نہ ہونے دے۔

ابن سعود موجودہ ملکِ حجاز اگر تعمیل کتاب و سنت اور حجاج کے لیے آسانیاں مہیا کرنے سے انکار یا تساہل کرے، تو اقوام مسلمہ کو حق حاصل ہے کہ اُسکے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں۔ لیکن وہ نہ تو تعمیل کتاب و سنت سے انکاری ہے نہ حجاج سے بے پروا۔ بلکہ اسکے عہد میں، جو دو سال سے زیادہ کا نہیں ہے، وہ آسانیاں حاجیوں کے لیے پیدا ہوگئی ہیں جو اس سرزمین میں کبھی نہ تھیں۔

یہ بہت ممکن ہے کہ اُسکے خلاف کچھ شکایات بعض لوگوں کو ہوں، اور کس کے خلاف شکایات نہیں ہوتیں؟ اسلام کا بہترین زمانہ بعد رسالت کے خلافت راشدہ کا ہے جسکے چار خلفاء میں دو محض جماعتوں کی شکایت اور مخالفت کی وجہ سے مقتول ہوئے۔

حضرت عثمان کے خلاف جو شکایات تھیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ انھوں نے حج میں جمع بین الصلوتین نہیں کی انکی بنیاد پر ایک جماعت نے مدینہ پہونچکر اُنکے گھر کو آگ لگا دی اور جس حالت میں کہ وہ قرآن کی تلاوت کر رہے تھے اُنکو قتل کر دیا - اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بھی ایک جماعت کو شکایت پیدا ہوگئی تھی - چنانچہ جب ابن ملجم نے اُنکے سر پر تلوار ماری تو اُس جماعت نے اِسکو ایک بڑا کار خیر سمجھا اور ایک شاعر نے اُسکی مدح میں لکھا

یا ضربۃ من تقی ما اراد بہا　　الا لیبلغ من ذی العرش رضوانا

یعنی اس متقی نے یہ وار صرف اس لیے کیا ہے کہ اپنے رب کو راضی کرے - لیکن کیا اِن شکایات کے پیدا ہو جانے سے ان مقدس خلفاء کا قتل جائز تھا؟ اسی طرح اگر سلطان نجد سے کوئی شکایت ہے تو اصلاح کے راستہ سے اسکی اصلاح کرائی جا سکتی ہے نہ کہ حجاز سے اُسکے اخراج یا وہاں قیام جمہوریہ کی کوشش کی جائے - جس میں کامیابی بھی محال ہے - کیونکہ سلطان ابن سعود جیسے اقتدار پسند اور سلطنت کے خواہشمند شخص کے پنجے سے حجاز کو بلا جنگی طاقت کے نکالنا ممکن نہیں اس لیے کہ وہ اپنی ملوکیت حجاز کو جائز سمجھتا ہے - کیونکہ خود امراء و روسائے حجاز نے متفقہ طور پر جمادی الثانی ۱۳۴۴ھ میں اُسکو ملک الحجاز تسلیم کیا ہے -

موتمر مکہ

سال گذشتہ مکہ مکرمہ میں ابن سعود نے غالباً اپنے داخلۂ حجاز کی خوشی یا مسلمانوں کی دلجوئی کیلیے ایک موتمر قائم کی اور ممالک اسلامیہ میں جا بجا دعوت نامے بھیجکر مسلمانوں کے نمائندے طلب کیے - جن کی خاطر مدارات میں تقریباً ۲۰ - ۲۵ ہزار اشرفیاں بھی صرف کیں -

یہ موتمر تاریخ اسلام میں ایک جدید امر تھا جسکو اگر دینی نہیں تو کم سے کم سیاسی بدعت ضرور کہا جا سکتا ہے کیونکہ حج خود اسلامی موتمر ہے - اس موتمر عظیم میں یہ انتخابی ارکان کا موتمر ایسا ہی ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا -

حج بیت اللہ

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد اجتماعیات پر ہے - ہر محلہ کے باشندوں کا اجتماع اُس محلہ کی مسجد میں دن میں پانچوں وقت - پھر سارے شہر کا اجتماع جمعہ کو - پھر شہر اور توابع کا اجتماع عیدین میں - اور تمام عالم اسلامی کا اجتماع حج میں -

حج کا مقصد یہ ہے کہ وہاں دین اسلام کی اصلی بنیاد اور ملت ابراہیمی کی حنیفی توحید کا نقش حجاج کے قلوب پر راسخ ہو جائے - اعلائے کلمۃ الحق ہو - اسکے علاوہ دنیاوی منافع بھی

حاصل کیے جائیں۔ مسلمان ایک دوسرے سے مل کر اُنکے حالات سے باخبر ہوں اور باہمی تناصر اور تعاون علی الخیر کے ذرائع سوچیں۔

اس لیے مسلمانانِ عالم کا اصلی اور قدیمی موتمر حج ہے۔ اور یہ اجتماع نہ صرف دینی و مذہبی، بلکہ مُلکی و ملّی بھی ہے۔ ہر مسلمان جو اس فریضہ کی ادائگی کے لیے اس مقدس سرزمین میں پہونچتا ہے وہ اپنے ملک، اپنے شہر، اپنے محلّہ اور اپنے خاندان کا نمایندہ ہے۔ اسکے لیے کسی سلطان کی دعوت یا کسی جماعت کے انتخاب کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اس کا دعوت نامہ وہ ہے جو کعبہ کے رب نے بانیِ کعبہ حضرت ابراہیمؑ سے فرمادیا تھا واذّن فی الناس بالحج الآیۃ

مومنین احرام باندھے ہوے، امیر و غریب ایک لباس میں اللہ کا نام پکارتے ہوے، خالص اُسی کا خوف اور اُسی کی امید دل میں لیے ہوے مکہ میں پہونچیں۔ قلوب ہر قسم کی کثافتوں اور خود غرضیوں سے پاک ہوجائیں۔ ہر ہر ملک کے اعیان آپس میں ملیں۔ امت کے حالات پر غائر نظر ڈالیں اور کم سے کم سال بھر کا لائحۂ عمل مرتب کریں۔ جو صدر منتخب ہو وہ میدانِ عرفات میں خطبہ دے اور عملی پروگرام امت کے سامنے رکھدے۔ پھر منا میں پہونچکر قربانیاں ہوں، دعوتیں کھائی اور کھلائی جائیں۔ رمی جمرات، اور ذکر اللہ کے ساتھ ساتھ وہاں مجالس بھی ہوں جن میں ہر حاجی پر عالم اسلامی کی کیفیت آشکارا کی جائے تاکہ جب وہ اپنے وطن کو واپس جائے تو اس سال امت کے لیے جو کام کرنا چاہیے اُسکا پیغام اپنے خاندان، محلہ، اور اہل شہر کو پہونچا سکے۔

اس آفتاب (حج) کے ہوتے ہوے اس شمع (موتمر) کی جو سال گذشتہ ہوا ضرورت نہ تھی لیکن لوگوں کی نگاہ میں وہی اُسوقت پسندیدہ معلوم ہوا۔ کیونکہ حج کی اصلی غرض و غایت مدت سے مفقود ہوچکی ہے، اور صدیوں سے مسلمان صرف فقہی اور انفرادی حج پر قانع چلے آتے ہیں۔

اس جدید موتمر کا سلطان کو جیسا تلخ تجربہ ہوا اُس سے اب غالب بلکہ اغلب یہ ہے کہ وہ اسکے اجلاس کی جرأت نہ کریں گے، نہ امسال، نہ کبھی آیندہ۔ کیونکہ بجاے تعاون و تناصر کے اس سے باہمی مخالفت پیدا ہوگئی۔ اس لیے بعض مسلمانانِ ہند نے لکھنؤ میں موتمر کی جو شاخ ہند قائم کی ہے وہ بے اصل ہے یعنی اُسکی جڑ نہیں۔

لکھنؤ کے اس اجلاس میں حکومتِ حجاز کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ مختلف العقائد اسلامی فرقوں کا بھی لحاظ رکھے۔ میرے خیال میں یہ تجویز محدود ہونی چاہیے تھی، کہ "جہاں تک کتاب و سنت

اجازت دے" کیونکہ ایک طرف تو اُس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ کتاب و سنت کے خلاف نہ کرے، اور دوسری طرف خواہش کی جاتی ہے کہ فرقہ ہائے اسلامی سے رواداری بھی برتی جائے۔ حالانکہ بہت سے فرقے بدعات اور مشرکانہ رسوم میں مبتلا ہیں۔ اگر اس مقدس مقام میں بھی بدعات اور ضلالات کے ساتھ رواداری کا برتاؤ رہا تو اور کہاں سے اصلاح کی امید رکھی جائے گی؟ میرے خیال میں تو اُس مرکزِ دین میں قرآن و سنت کے خلاف کوئی کام کرنے کی اجازت نہ ہونی چاہیے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں سختی ہونی چاہیے۔

آخر میں میری التماس یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو آزاد اسلامی ممالک خاصکر جزیرۂ عرب کے معاملات میں جہاں مخالفین کے ایسے وسائل مصروفِ عمل ہیں جنکا صحیح اندازہ ہم نہیں کرسکتے، نہایت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ اور جذبات یا عصبیت کو مطلق دخل نہ دینا چاہیے، ورنہ عالمِ اسلامی کو بجائے فائدہ کے نقصان پہونچ جانے کا خطرہ ہے۔ فقط

اسلم جیراجپوری
قرول باغ - دہلی

مضمون کے وصول ہونے کے بعد شریف شرف عدنان صدر موتمر نے شعیب قریشی صاحب معتمد شاخ ہند کے اُس تار کی بنا پر جس میں ہندوستان میں موتمر کی شاخ قائم کیے جانے اور اس سال کے موتمر کے لیے اُسکی جانب نمایندے منتخب ہونے کی اطلاع دی گئی اور انعقاد موتمر کا وقت دریافت کیا گیا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی گذشتہ موتمر کے نائب صدر کو جو تار دریافت حالات کی غرض سے بھیجا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا کا رُخ کدھر ہے۔ حج کا زمانہ بالکل قریب ہے، مگر اب تک آزاد اسلامی حکومتوں تک نے نہ تو مجلس انتظامی کے ارکین کا تقرر کیا، نہ مقررہ سالانہ چندہ رکنیت بھیجا، اور نہ ہندوستان کے سوا کہیں سے موتمر کی شاخ قائم ہونے یا نمایندے منتخب کیے جانے کی اطلاع شائع ہوئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف سلطان ابن سعود ہی نہیں بلکہ دنیائے اسلام کے دوسرے اعضا بھی، گذشتہ سال کے تلخ تجربہ کی بنا پر اس موتمر سے کچھ اچھی توقعات نہیں رکھتے۔

موتمر کی غرض و غایت مسلمانوں کے داخلی فوز و فلاح، یا اغیار خصوصاً یورپ کے دول استعمار کی ہوا و حرص سے اسلامی ممالک کے تحفظ کے لیے باہمی مشاورت اور مختلف ممالک کے مسلمانوں کے درمیان رابطۂ اخوت و محبت یا مشترک مقاصد کے لیے اتحادِ عمل کی صورتیں پیدا کرنا ہونا چاہیے تھی، مگر بدبختی دیکھیے کہ جو مجلس اتحاد و اتفاق کے لیے قائم کی گئی تھی ہم نے اسی کو آلۂ تفریق و نفاق بنانا چاہا۔ حالی نے اسی موقع کے لیے شاید کہا تھا:

دھو شوق سے کپڑے کو پہ اتنا نہ رگڑ		دھبّا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دیں کہ وہ آپس میں لڑ لڑ کر کمزور ہونے کے بجائے باہمی اتحاد کی صورتیں پیدا کریں اور چالاک دشمنوں کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچیں۔

ایڈیٹر

کلامِ وحشت

کچھ مسرت ہے وفا پر اُن کو مائل دیکھکر
کچھ ہے مایوسی ہجومِ حسرتِ دل دیکھکر

تھا جگر کو بھی جگرداری کا دعویٰ عشق میں
خون ہوکر بہ گیا بربادیِ دل دیکھکر

راکھ کے نیچے دبی تھی جو بھڑک اُٹھی وہ آگ
شعلہ ہائے شوق لپکے تیغِ قاتل دیکھکر

حال میرا میرے مستقبل کی دیتا ہے خبر
اپنی کشتی کو بھی دیکھا سوے ساحل دیکھکر

کون سمجھے مدعا کیا ہے نگاہِ ناز کا
کچھ کیا ارشاد اُس نے جانبِ دل دیکھکر

شوقِ بسمل کا اِدھر غلبہ اُدھر طغیانِ ناز
رہ گیا میں جنبشِ بازوے قاتل دیکھکر

سعی و محنت کی حقیقت آج دہقاں پہ کھُلی
برقِ خاطف کو بلا گردانِ حاصل دیکھکر

ماتمِ صد آرزو کی صاف دیتی تھی خبر
وہ صدا جو قیس نے دی سُوے محمل دیکھکر

آرزو کا خون ہوتا ہے یہ ظاہر ہو گیا
آج مجھ کو رنگِ استغناے قاتل دیکھکر

خود بخود آ ہی گیا کچھ شیوۂ عرضِ نیاز
اُس سراپا ناز کو اپنے مقابل دیکھکر

صاحبِ محمل کے دل میں کچھ کدورت بڑھ گئی
خاکِ مجنوں کو بلا گردانِ محمل دیکھکر

دیدۂ مشتاق کی حرماں نصیبی کیا کہوں
پھر نہ کچھ دیکھا گیا اُن کو مقابل دیکھکر

ہے ادائے شکر میں بسمل تہِ تیغِ ستم
پا گیا دل کی مُرادیں روے قاتل دیکھکر

میان سے نکلی ہے شمشیرِ جفا کہتی ہوئی
اب اگر دم لوں تو لوں میں خونِ بسمل دیکھکر

کام اپنے منحصر اُنکی مروّت پر رکھے
میں نے عرضِ مدعاے دل کو مشکل دیکھکر

بیخبر منزل سے ہیں وہ سالکانِ راہِ عشق
جو قدم رکھتے ہیں راہ و رسمِ منزل دیکھکر

کچھ اُمنگیں دل میں اُٹھی ہیں کسی جانباز کے
دب نہ جائیں بے نیازی ہاے قاتل دیکھکر

آئے تھے افسردہ دل ہم اب ہیں اک برقِ تپاں
محفل افروزی تری او شمعِ محفل دیکھکر

وقتِ آخر چشمِ حسرت نے بہائے اشکِ یاس
عمر بھر کی کاوش و کوشش کا حاصل دیکھکر

امتحاں عشق و ہوس کا ہے نہ کھا جانا فریب
دیکھکر اے حسن، فرقِ حق و باطل دیکھکر

دل بھی نازک دل کا افسانہ بھی نازک کیا کریں
ہم غزل پڑھتے ہیں وحشتؔ رنگِ محفل دیکھکر

رضا علی وحشت

یادگارِ انیس

مولفہ

مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔اے

"یادگارِ انیس" جیسا کہ اُسکے نام سے ظاہر ہوتا ہے میر انیس مغفور کی سوانحعمری اور اُن کی شاعری پر تبصرہ ہے۔ کتاب اپنے نام اور موضوع کی نوعیت میں خواجہ حالی مرحوم کی مشہور کتاب یادگارِ غالب سے مشابہ ہے لیکن اس میں وہ تحقیق، وہ دقتِ نظر، وہ ہمہ گیری نہیں ہے جو یادگارِ غالب میں ہے۔ شروع میں مولف نے ۶۳ صفحوں میں مرثیہ کا ماخذ مرثیہ گوئی کی ابتدا اور مرثیہ کی ترقی کی مختلف منزلیں اختصار کے ساتھ بیان کی ہیں۔ یہ حصہ گویا اصل کتاب کا مقدمہ ہے اور نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ گو مولف نے اپنی ذاتی تحقیق سے بہت کم کام لیا ہے لیکن جو مسالا اِدھر اُدھر منتشر تھا اسکو نہایت سلیقہ سے ترتیب دیا ہے۔ مگر اس سلسلہ میں ایک بڑی کمی یہ رہگئی ہے کہ میر خلیق اور مرزا فصیح کے مرثیوں کا کوئی نمونہ نہیں دیا گیا۔ میر خلیق میر انیس کے والد اور اُستاد تھے۔ انھیں کے دامنِ تربیت کے سایہ میں بڑھ کر ببر علی میر انیس ہوے تھے۔ ضرورت تھی کہ باپ بیٹے یا اُستاد شاگرد کے مرثیوں کے نمونے پیش کرکے دونوں کے کلام کا فرق دکھایا جاتا اور اس فرق کے اسباب سے بحث کی جاتی۔

میر تقی کے مرثیوں کے بارے میں فاضل مولف نے تحریر فرمایا ہے:-

"میر تقی نے بھی مرثیہ کہا، لیکن وہ اس پایہ کا نہ تھا کہ شہنشاہ سخن کے دیوان میں شامل کیا جاتا"

(یادگارِ انیس صہ)

یہ رائے محض قیاس ہے صرف اس بنا پر قائم کی گئی ہے کہ میر کے موجودہ مطبوعہ دیوان میں مرثیے شامل نہیں ہیں، یا شاید یہ وجہ بھی ہو کہ میر کے ایک مرثیہ پر مرزا سودا نے بہت سے اعتراض کردیے ہیں۔ لیکن بقول حضرت مولف مرزا سودا "جب خود مرثیہ کہنے بیٹھے تو اس زمین کو ذرا بھی بلند نہ کرسکے" صہ۹

"سودا نے خداوند سخن کو ہدفِ ملامت بنایا لیکن خود بے تکلف مرثیوں میں غلط الفاظ استعمال

کرتے ہیں۔ نہ صفائی بندش کا لحاظ ہے۔ نہ مرتبہ و نظر، اور نہ مضامین نو بہ نو کی تلاش" (ص۱۱)
یعنی حضرت مولف کی رائے میں سودا کے مرثیے میر کے مرثیوں سے بہتر نہیں ہیں۔ اور جو نقص سودا نے میر کے مرثیوں میں نکالے تھے وہ سودا کے کلام میں بھی موجود ہیں۔ باوجود اس کے سودا کے مرثیے انکے کلیات میں شامل ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ میر کے کلیات میں مرثیوں کا شامل نہ ہونا مرثیوں کی خرابی کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ کیا عجب ہے کہ اہل مطبع نے کلیات کی ضخامت کے خیال سے مرثیے نکال ڈالے ہوں۔ مرثیوں کو نکالنے کے بعد بھی کلیات میر ایک سودا ہی کے کلیات سے نہیں بلکہ اردو کے کل مشہور شاعروں کے مطبوعہ کلیاتوں سے بڑا ہے۔ مجھے صرف فاضل مولف کے قیاس سے اختلاف ہے ورنہ میں خود میر کی مرثیہ گوئی کا قائل نہیں ہوں۔ میں نے میر کے ایک دو نہیں، تین درجن سے زیادہ مرثیے دیکھے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ میر کا سا نقاشِ جذبات اور مصورِ درد شاعر ایسے پست اور بے اثر مرثیے کیونکر کہہ سکا۔ مرزا غالب کے مرثیہ کے تین بند بہت مشہور ہیں اور زیرِ تبصرہ کتاب کے صفحہ ۱۰۶ میں بھی نقل کیے گئے ہیں۔ مجھے کبھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ بند مرزا غالب کے قلم سے نکلے ہونگے، لیکن میر کے مرثیے دیکھنے کے بعد اب یہ بات قیاس میں آ سکتی ہے۔

فاضل مولف نے تحریر فرمایا ہے کہ ایک مجلس میں مرزا دبیر کا ایک بند سن کر "خواجہ آتش نے پکار کر فرمایا کہ بھئی سلامت علی خدا تم کو سلامت رکھے، کون کہتا ہے کہ تم فقط مضامین اچھے کہتے ہو، تم سے بہتر دوسرا شاعر زبان بھی نہیں کہہ سکتا" (ص۲۴) اِس روایت کے لیے سند کی ضرورت ہے۔ ورنہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر آزاد نے آبِ حیات میں جو حکایت لکھی ہے کہ خواجہ آتش نے مرزا دبیر کا ایک مرثیہ سن کر کہا کہ "میں سوچتا ہوں کہ یہ مرثیہ تھا یا لندھور بن سعدان کی داستان تھی"۔ اُسی حکایت کے جواب میں یہ روایت کسی دبیریے نے گڑھ لی ہے۔

میر انیس اور مرزا دبیر کا موازنہ فاضل مولف نے یوں کیا ہے:

> دونوں اُستادوں کی روش جداگانہ ہے۔ میر انیس کا کلام فصیح اور شیریں ہے اور مرزا دبیر کا دقیق و ملیح۔ شیرینی اور نمک دونوں کی بنی آدم کو احتیاج ہے اور ایک کو دوسرے پر من کل الوجوہ ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ البتہ میر انیس کو یہ فوقیت مرزا صاحب پر حاصل ہے کہ انکے کلام کی سادگی و تاثیر عرصے تک زندہ رہیگی اور مرزا دبیر کی شوکتِ الفاظ و بلند پروازی مٹ جائے گی۔ مرزا دبیر نے جو صنائع و بدائع اپنے کلام معجز نظام میں صرف کیے ہیں اُنکے

سمجھنے والے ہندوستان میں بہت کم باقی ہیں۔ اور اگر مشرقی علوم سے بے توجہی کا یہی عالم رہا تو چند ہی روز میں شاید کوئی شخص ان صنایع سے لطف اُٹھانے والا ہندوستان میں تلاش کرنے سے بھی نہ ملے گا۔ برخلاف اسکے میر انیس کی سادہ زبان اور محاورہ بندی اُسوقت تک مزہ دیگی جب تک کہ اُردو زبان زندہ ہے ....

...... سید افضل حسین ثابت لکھنوی نے اپنے بے نظیر گنجینۂ واقعات حیات دبیر میں اُن تمام صنعتوں کا مفصل تذکرہ کیا ہے جو مرزا دبیر کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ مگر افسوس کہ ان میں سے بیشتر کا زمانۂ حال کے تعلیم یافتہ طبقے نے آم بھی نہ سنا ہوگا۔" (ص ۲۷)

اس بیان میں انیس و دبیر کا مقابلہ جس اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے وہ بھی عجیب ہے اور عجیب تر یہ ہے کہ وہ بیسویں صدی کے ایک قابل گریجوئٹ کے قلم سے نکلا ہے۔ شیرینی اور نمکینی کے مبہم الفاظ زمانۂ قدیم کے تذکرہ نویسوں ہی کے منہ پر کچھ خوب زیب دیتے ہیں جو کسی کی فکر کو آسماں سیر، کسی کو سپہر سخن کا آفتاب کسی کو اقلیم سخن کا شہنشاہ کہہ کر سمجھتے تھے کہ تنقید کا حق ادا ہوگیا۔ جناب مؤلف یقیناً واقف ہیں کہ تنقید کا مفہوم آجکل کیا ہے اور انیس و دبیر کی شاعری کا فرق دکھانے کے لیے کن کن باتوں پر نظر کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ غالباً موصوف کی سہل انگاری تھی کہ اس اہم مبحث کو یوں دو لفظوں میں ختم کر دیا۔ مجھے اس اختصار پر کچھ زیادہ اعتراض بھی نہیں ہے۔ مگر اس مختصر بیان سے ایک غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انیس و دبیر کے کلام میں اگر کوئی خاص فرق ہے تو صرف انداز بیان کا۔ انیس اپنا مطلب سیدھی سادی زبان میں ادا کرتے ہیں اور دبیر صنائع و بدائع سے کام لیتے ہیں۔ اسکے علاوہ مرثیے کا انداز، مرثیے کے مضامین، مرثیے کے اجزا، سیرت نگاری، واقعہ نگاری، منظر نگاری وغیرہ میں دونوں کے کلام میں کوئی خاص فرق نہیں۔ ممکن ہے کہ جناب مؤلف کا یہ خیال نہ ہو مگر اُنکی عبارت سے نتیجہ یہی نکلتا ہے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ یا تو موازنہ بالکل نہ کیا جاتا یا اگر کیا گیا تھا تو دونوں اُستادوں کے امتیازی خصوصیات کی طرف ایک اشارہ ضرور کرنا چاہیے تھا۔

مجھ کو اس بات پر بھی حیرت ہے کہ کلام انیس کا کوئی شیدائی صنایع و بدایع کو شاعری کیونکر قرار دے سکتا ہے۔ حضرت مؤلف کو افسوس ہے کہ جو صنعتیں مرزا دبیر کے کلام میں پائی جاتی ہیں "اُن میں سے بیشتر کا زمانۂ حال کے تعلیم یافتہ طبقے نے نام بھی نہ سنا ہوگا۔" لیکن

میں تو اس خیال سے یقیناً خوش ہوں، بلکہ چاہتا ہوں کہ چند صنعتوں کے نام جو لوگوں کو یاد رہ گئے ہیں انکو بھی وہ بھول جائیں، تاکہ لفظی بازیگری اور شاعری کو خلط ملط کرنے کا امکان ہی باقی نہ رہے۔

جناب مولف تحریر فرماتے ہیں :-

"راقم آثم کے لیے ان بزرگوں کی زبان سے نکلا ہوا ہر ایک مصرعہ تبرک ہے۔ وہ ان دونوں شہنشاہانِ سخن کے متحد المضامین اشعار کا نمونہ پیش کرتا ہے اور ترجیح کا فیصلہ ناظرین کے ذوقِ سلیم پر چھوڑتا ہے۔" صفحہ

اس عبارت کا پہلا جملہ پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ حضرت مؤلف نے امتیازی قابلیت کے باوجود بے نیازی کا اعلان کیوں کیا۔ فیصلہ ناظرین کے ذوق پر چھوڑ دینا کیا معنی۔ یہ فرض کر لینا بھی صحیح نہیں ہے کہ ہر ناظر کتاب ذوقِ سلیم رکھتا ہوگا۔ اگر تمام ناظرین اپنے ذوقِ سلیم سے صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں تو اس کتاب کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کتاب لکھنے والے کا فرض تو یہ ہے کہ وہ اپنی خاص قابلیت و واقفیت یا مخصوص تلاش و تجسس سے ایسی باتیں ناظرین کے سامنے پیش کرے جن تک انکا ذہن آسانی سے خود نہ پہنچ سکتا ہو۔ اسکے علاوہ صرف متحد المضمون کلام کو دیکھ کر ترجیح کا فیصلہ کرنے کی رائے دینا میرے خیال میں ناظرین کو غلط فہمی میں مبتلا کرنا ہے۔ عام طور پر لوگوں کے نزدیک انیس و دبیر کے کلام کے موازنے کی بہترین صورت یہی ہے کہ دونوں کے متحد المضمون کلام پر نظر کی جائے اور تقریباً کل مصنفین و مولفین نے اس مسئلۂ خاص میں اب تک یہی مسلک اختیار کیا ہے اس لیے میرا یہ خیال کہ ایسا کرنا غلط فہمی کا راستہ دکھانا ہے کچھ عجب نہیں کہ قابلِ قبول نہ معلوم ہو لہذا میں اپنے دعوے کی دلیل میں چند باتیں عرض کرتا ہوں :-

(۱) متحد المضمون کلام کے لیے بہترین کلام ہونا ضروری نہیں۔ اس لیے صرف متحد المضمون کلام پر نظر رکھنے سے دونوں کا بہترین کلام معرض بحث میں نہیں آ سکتا۔

(۲) متحد المضمون کلام سے زیادہ تر وہ باتیں معلوم ہو سکتی ہیں جو دونوں کے کلام میں مشترک ہیں۔ دونوں کے امتیازی خصوصیات اکثر چھوٹ جاتے ہیں۔

(۳) متحد المضمون کلام اکثر ایک دوسرے کے جواب میں کہا جاتا ہے جس میں ہر شاعر اپنے رنگ سے ہٹ کر دوسرے کے رنگ میں اپنا کمال دکھانا چاہتا ہے۔ اس لیے اُس میں مصنف کے امتیازی خصوصیات ڈھونڈنا غلطی ہے۔ اور اس لیے ہمعصر شعرا کے کلام میں موازنے کا یہ طریقہ

اور یہی غلط ہو جاتا ہے

(۴) متحد المضمون کلام کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیشہ مرثیوں کے اجزا منتخب کیے جاتے ہیں۔ لیکن کسی مرثیے کے ایک جزو کا کسی دوسرے مرثیے کے ایک جزو سے بہتر ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ پہلا مرثیہ لازمی طور پر دوسرے سے اچھا ہے۔ نہ کسی مرثیے کے ایک جزو کے اچھے یا بُرے ہونے سے پورا مرثیہ اچھا یا بُرا قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۵) متحد المضمون کلام پر نظر کرتے وقت نقطۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ یعنی زیادہ توجہ اس بات کی طرف ہو جاتی ہے کہ کس کے کلام میں کون کون خوبیاں نہیں ہیں حالانکہ اصل غرض اس امر کا پتہ لگانا ہونا چاہیے کہ کس کے کلام میں کون کون خوبیاں ہیں۔ ان سب باتوں پر نظر کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ متحد المضمون کلام کا موازنہ کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچا سکتا۔

مقدمے کے خاتمے میں ان دونوں باتوں سے بحث کی گئی ہے کہ مرثیہ اور تاریخ میں کیا تعلق ہے۔ اور مرثیے کو رزمیہ نظم سمجھنا چاہیے یا نہیں۔ یہ بحث مختصر ہے مگر بہت دلچسپ ہے۔ فاضل مولف کا خیال ہے کہ رزمیہ نظم میں ہیرو کی فتح ہونا ضروری ہے اور مرثیے کے ہیرو کو بظاہر فتح نہیں ہوئی .... لہذا مرثیے کو رزمیہ نظم کہنا درست نہیں۔ اس ایک کمی کے علاوہ بقول مولف مرثیہ گویان لکھنؤ نے مرثیوں میں "رزمیہ شاعری کے تمام شرائط جمع کر دیے" ہیں۔ لیکن اگر جناب مؤلف اس نکتہ پر نظر رکھتے کہ مرثیہ گویوں کی نگاہ میں کربلا کی جنگ کوئی ملکی یا سیاسی جنگ نہیں تھی، بلکہ ایک اخلاقی جنگ تھی جس میں اخلاقِ رذیلہ اخلاقِ فاضلہ کو مغلوب کرنا چاہتے تھے مگر نہ کر سکے۔ جن کے ہیرو کا مقصد حق کی حمایت میں سب کچھ نثار کر دینا تھا اور وہ اس مہتم بالشان مقصد میں یوں کامیاب ہوا کہ دنیا ایسی کامیابی کی نظیر نہیں پیش کر سکتی تو وہ یقیناً مرثیہ کو رزمیہ شاعری کی صنف میں رکھتا کیا بلکہ رزمیہ شاعری کی ایک بہتر اور بلند تر صنف قرار دیتے۔

مقدمے کے بعد ، ، صفحوں میں میر انیس کے سوانح زندگی، حالات سفر، اور لطائف و حکایات ہیں۔ اس حصے میں زیادہ تر وہی باتیں ہیں جو انیس کے دوسرے سوانح نگار لکھ چکے ہیں۔ اسکے بعد ا ے صفحوں میں میر انیس کی شاعری پر نظر ڈالی گئی ہے۔ کتاب کا یہ حصہ جو سب سے زیادہ توجہ کا مستحق تھا سب سے زیادہ بے توجہی سے لکھا گیا ہے۔ اگر کتاب کے مولف کوئی پرانی تعلیم یا پرانے خیال والے بزرگ ہوتے تو مجھے یہ شکایت نہ ہوتی۔ مگر اس کے

مولف جدید تعلیم پائے ہوئے ایک وسیع النظر فاضل ہیں۔ جنکو یقیناً علم ہے کہ انگریزی مصنفوں نے شاعروں کے کلام پر بحث کرنے میں کیسی کیسی دقت نظر سے کام لیا ہے۔ کیا کیا باتیں تحقیق کی دوربین سے دیکھ کر دوسروں کو دکھائی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نقاد شاعروں کے دلوں میں بیٹھے ہوئے اُن کا ایک ایک تغیر اُنکی ایک ایک کیفیت اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور لکھتے جاتے تھے۔ پھر اپنے دعووں کے ثبوت میں کیسی کیسی دلیلیں پیش کرتے ہیں کہ اُنکے ذہنوں کی رسائی پر عقل متحیر ہو ہو کر اور دل مزے لے لے کر رہ جاتا ہے۔ شیکسپیر کے ڈراموں پر بالخصوص جو جو لطیف اور نازک بحثیں جس جس پہلو سے ہوئی ہیں اُن سے بھی فاضل مؤلف بے خبر نہیں ہیں۔ وہ خود انصاف فرمائیں کہ کیا انیس کی شاعری سے بحث کرنے کیلیے صرف اسی قدر کافی تھا کہ انکی شاعری کے چند خصوصیات کی طرف ایک ایک اشارہ کر کے بہت بہت سا کلام نقل کر دیا جائے۔ یادگار انیس میں یہی کیا گیا ہے۔ فاضل مولف نے اسکی وجہ یہ بتائی ہے کہ "علامہ شبلی نے اپنے موازنہ میں کلام انیس پر ایسا مفصل تبصرہ کیا ہے کہ اس بحث پر زیادہ لکھنا ممکن نہیں" غالباً جناب مؤلف نے تنقید کلام انیس کے پُر خار راستے سے دامن بچانے کے لیے یہ فرما دیا ہے ورنہ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ شکسپیر کے کلام کی تنقید یں جس شخص کی نظر سے گذر چکی ہوں اُسکا اعتقاد موازنہ کے بارے میں حقیقت میں یہی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ علامہ شبلی مرحوم نے بڑا کام کیا ہے اور جو کچھ لکھا ہے بہت خوب لکھا ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ کلام انیس پر ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور لکھا جائے گا۔ میرانیس کے کلام میں اتنی خوبیاں ہیں اور اُنکی ایک ایک بات میں حسن کے اتنے پہلو ہیں کہ ایک نظر میں اُنکا احاطہ کوئی نہیں کر سکتا۔ اُنکے کلام پر یہ مصرعہ بالکل صادق آتا ہے۔ ع۔ دامان نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار۔ جب ایک مدت تک بڑے بڑے نکتہ بیں اور دقیقہ رس لوگ کلام انیس کو نئے نئے پہلوؤں سے دیکھ دیکھ کر اُس پر بالتفصیل بحث کرینگے تب جا کر اسکی تمام خوبیاں منظر عام پر آئیں گی۔

بہرحال عام پڑھنے والوں کے لیے مجموعی حیثیت سے یہ کتاب نہایت مفید اور نہایت دلچسپ ہے۔ مولف کی بے لوثی، بے تعصبی اور ادب کا سچا ذوق بات بات سے نمایاں ہے۔ مولف نے لفظ 'ہرسیہ' کی جو توجیہ بیان کی ہے وہ بالکل نئی اور غالباً صحیح ہے۔ کتاب کی عبارت نہایت خوبصورت اور دلکش ہے۔ بعض لوگوں کو اس کتاب پر یہ اعتراض ہے کہ اس میں

نئی بات کوئی نہیں ہے۔ مولف نے تمام باتیں دوسروں کے یہاں سے لی ہیں۔ اس اعتراض کا جواب خود جناب مولف کی زبان سے سنیے اور موصوف کے حسنِ بیان کا نمونہ دیکھیے :-

"بندۂ ناچیز نے مختلف کیاریوں سے پھول چُن کر گلدستہ بنایا اور شہریارانِ اقلیم فصاحت کی سرکار میں نذر کرنے کو بیچا۔ غمازوں نے پردہ دری کی

اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمھارا کیا ہے
آنکھ نرگس کی۔ دہن غنچہ کا۔ حیرت میری

کلیاں اشتہری کے گلزار سے چُنیں، گلہائے شگفتہ احسن کے لالہ زار سے توڑے، پتیاں ثابت کے سدا بہار سے لیں، بیندش تشبیہی کے مرغزار سے اُڑائی، سُوت کا ڈورا لیکر یوسف کی خریداری کو جاتا ہے۔ ہاتف غیب نے آواز دی کہ

حاسد کا دل جلے نہ تو اُردو کے داغ سے
روشن چراغ ہوتے ہیں سَو۔ اک چراغ سے

سادہ کار دوسرے کی انگوٹھی پر نگینہ جڑتا ہے اور انعام پاتا ہے۔ ساقی پیرمغاں کی شراب اندازہ سے پلاتا ہے اور دعائیں لیتا ہے۔ مرقع ساز پرانی تصویر چوکھٹے میں سجاتا ہے، اور صناع کہلاتا ہے۔ باغبان روشوں کو جھاڑ جھنکاڑ سے صاف کرتا، پھول پتی کے خوبصورت چمن جدا جدا بناتا، سرو وشمشاد کے پودے مختلف مقامات سے لاکر قرینہ قرینہ سے لگاتا ہے اور تمغۂ امتیاز پاتا ہے۔ سلیقہ شعار سکرٹری ڈرائنگ روم کے دروازوں پر گوہر نگار پردے آویزاں کرتا، دیواروں پر نقش ونگار بنواتا، کمرے کو جھاڑ فانوس کنول سے دلھن بنا دیتا ہے اور خطاب پاتا ہے۔

کیا عجب ہے کہ حضرت ممدوح کے فیضِ نسبت سے خادِ خطا پر صادِ صواب کا دامن سایہ گستر ہو اور آبِ قبول کے چھینٹوں سے مرجھائے ہوئے پھولوں میں وہ مہک پیدا ہو کہ انکی خوشبو مدت تک قدر شناسوں کے دماغ کو طبلۂ عطار بنائے رکھے۔

غارتِ گنجِ نہ چیں کردہ ام
تا صنعے چیند گزیں کردہ ام

سید مسعود حسن رضوی ادیب ایم۔اے
لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ

ہم نہیں رکھتے

از جناب مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی

(یہ غزل سکندرآباد دکن کے ایک مشاعرہ میں پڑھی گئی)

سہتے ہیں جفا۔ موت کا ڈر ہم نہیں رکھتے
انجام وفا پیش نظر ہم نہیں رکھتے

گل رکھتے ہوں گلچیں سے ڈر ہم نہیں رکھتے
کیا زور چلے اُن کا کہ زر ہم نہیں رکھتے

جو دیکھنا تھا دیکھ لیا دیدۂ دل سے
پروا تری اے دیدۂ سر ہم نہیں رکھتے

کرتا ہے ترا حسن اگر محوِ نقشگر
خورشید کے زانو پہ بھی سر ہم نہیں رکھتے

تم جلوہ دکھاؤ تو۔ ابھی سے کہیں کیونکر
موسیٰ کی طرح تابِ نظر ہم نہیں رکھتے

آتی ہیں بصارت سے بلاؤں پہ بلائیں
وا چشمِ بصیرت کو اگر ہم نہیں رکھتے

لب ملتے ہی دل ملتے ہیں۔ کیا زود رسیاں ہیں
تم رکھتے ہو یہ بات اگر ہم نہیں رکھتے

کھولیں تری امداد سے قدرت کے سب اسرار
مقدور یہ اے عقلِ بشر ہم نہیں رکھتے

ہیں بےخبر اول سے تجھے دیکھ کے اے دوست
کیوں بےخبری ہے یہ خبر ہم نہیں رکھتے

اے حسن ترے ہاتھ میں غمزہ کی جو ہے تیغ
اس تیغ سے بچنے کی سپر ہم نہیں رکھتے

جب چاہیں اُڑیں اور ترے بام پہ پہونچیں
طاقت یہ پرندوں کو ہے۔ پر ہم نہیں رکھتے

دوزخ کو ترے رکھیں اس سینہ میں پنہاں
اتنی سکت اے سوزِ جگر ہم نہیں رکھتے

پنہاں ہے جو بازیگر اُسے دیکھتے ہیں ہم
ہنگامۂ عالم پہ نظر ہم نہیں رکھتے

ہم صحبتِ احباب کو گرما نہیں سکتے
گر دل میں نسبتِ شرر ہم نہیں رکھتے

کب تک رہیں یوں جھیلتے چوٹیں یہ تمھاری
اے حادثو! پتھر کا جگر ہم نہیں رکھتے

ہے ہم کو بنانا ہی بلندی پہ نشیمن
بجلی کے شراروں سے خطر ہم نہیں رکھتے

تا رگِ دل پہ سے پہونچی خبر اُن کی
پروا تری اے تارِ نظر ہم نہیں رکھتے

سورج ہیں کئی چاکِ گریباں میں نہاں
حاجت تری اے نورِ سحر ہم نہیں رکھتے

اصلاحِ سخن

سید محمد عبدالعلی صاحب شوق سندیلوی کی مرتبہ اصلاحِ سخن اربابِ سخن کے لیے دلچسپیوں کا ایک نادر مجموعہ ہے۔

فاضل سندیلوی نے اپنے کلام کو گل کشتی بنا کر مشاہیر شعرائے کرام کے ہاتھوں میں پہونچایا اور اُنکو تصرف کا بطور اصلاح کے موقع دیا۔ اُن حضرات کے محو و اثبات کا نام اصلاحِ سخن رکھا ہے۔ شوق صاحب کے اس ایثار کو محض انکسار نفسی پر محمول کر کے مدح و ستایش کرنا اُنکی ذہنیت اور ذہانت پر بڑا بھاری ظلم ہے بلکہ حقیقت میں کہنہ مشق شاعر سندیلوی نے شاعری کا ایک خفیہ ٹریننگ اسکول قائم کیا ہے اور اُس میں شرکت کی دعوت اُن شعرائے عظام کو دی ہے جو اُستاد مشہور ہو چکے ہیں، یا اُستاد بننے کے خواہشمند ہیں۔ تاکہ وہ اس امتحان مقابلہ میں اپنے ادعائے اُستادی کو حق بجانب ثابت کر کے صحیح طور پر ادب اُردو کی علمبرداری کا فخر حاصل فرمائیں۔ کام دشوار تھا، اور اُمید نہ تھی کہ اساتذۂ کرام اپنی شہرۂ اُستادی کو خود بخود کشمکش میں ڈالنا پسند کریں گے، لیکن شوق نے حسنِ تدبر سے اپنے آپ کو شاگردانہ حیثیت میں پیش کر کے اِس مشکل کو آسان کر لیا ؎ تھا کام تو مشکل مگر آسان نکل آیا۔ اپنی ۱۶ غزلوں پر حضرات موصوف کو تصرفاتِ اصلاح کا اختیار دیکر دنیائے شاعری میں اُنکی طبع گرامی کی جواہر ریزیاں نہایت سلیقہ سے ایک کشتی میں لگا کر پیش کر دیں۔ اربابِ ذوقِ سلیم اب نہایت آسانی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ناخدایانِ ادبِ اُردو میں کتنے حضرات ایسے ہیں جو اس ناؤ کو پار لگا سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اس مجموعہ کا صحیح نام امتحانِ سخن ہونا چاہیے تھا، شوق نے فرضی شاگردی و اُستادی کے احترام کے خیال سے غالباً اصلاحِ سخن نام رکھا ہے۔ چند مبصران فن اور نقادان سخن اس رسالہ کو اپنے اظہار رائے سے ممتاز فرما چکے ہیں اب کتاب کی اشاعت کے بعد مجھ ہیچمیداں سے بھی تبصرہ کی فرمایش کی گئی ہے۔ تبصرہ نگاری کے لیے جس اعلیٰ قابلیت کی ضرورت ہے وہ مجھ میں موجود نہیں ہے، مگر ادب اُردو کے ادنیٰ خادم کی حیثیت سے اپنی بساط کے موافق شوق کے ارشاد کی تعمیل کر رہا ہوں۔

تقریب — تقریب کے نام سے ایک دلچسپ عبارت مولانا نیاز فتحپوری نے ارقام

فرمائی ہے ۔ آپ رسالۂ نگار کے مُدیر ہیں اور اُردو نثر نگاری میں ایک خصوصی طرز کے موجد ہیں ۔ یہ تقریب بھی آپ نے اپنے مایۂ ناز رنگ میں تحریر فرمائی ہے ۔ فاضل مقرب نے عبارت کے ابتدائی جملوں سے قارئین کتاب کو جامع اصلاحِ سخن سے روشناس کرایا ہے ۔ بہتر ہوتا اگر مولانا نیاز کی تقریب، رسالۂ اصلاح سخن کی تقریب ہوتی تاکہ قارئین کتاب کے پڑھنے سے پہلے کتاب کے مالۂ وما علیہ سے کچھ خبردار ہو جاتے ۔

دیباچہ اصلاح سخن کا دیباچہ ہندوستان کے مشہور اوزیلمہ انشا پرداز مولانا عبدالحلیم صاحب شرر نے تحریر فرماکر اصلاح سخن کا پایہ بلند کر دیا ہے ۔ جناب شرر کی انشا پردازی لطافتِ زبان اور سلاستِ بیان کی وجہ سے تعریف و تحسین سے بے نیاز ہے ۔ مولانا نے شوق سندیلوی کی مساعی کی قدردانی فرماکر یہ توقع کی ہے کہ "ہمارے دوست (شوق) اگر ایسی ہی تھوڑی اور غزلیں اور اصلاحیں شایع فرمادیں تو اختلافِ زبان و مذاق کے صحیح اصول قائم کرنے میں اس امر پر بحث کی جاسکے گی کہ یہ اختلافات کیوں ہیں" دیباچہ کو اس دعائیہ جملے پر ختم فرمایا ہے "دعا کرتا ہوں کہ خدا انکو (شوق کو) اس طرف زیادہ توجہ فرمانے کی توفیق خیر دے" ۔ مولانا شرر میرے دیرینہ کرم فرما ہیں میں ان توقعات میں انکا ہمنوا ہوتا اور دعا پر آمین کہتا، لیکن التماس نواب اور مجموعہ اصلاحات، در اصلاحات کے پڑھنے کے بعد کوئی امید نہیں ہے کہ شوق صاحب آیندہ اس قسم کی کوشش میں کامیاب ہوسکیں گے ۔ ہاں ممکن ہے کہ انکی جدت طرازِ طبیعت اور خداداد ذہانت ادبِ اُردو کی کسی اور جدید و عجیب جوارش یا معجون سے مسیحائی کرے ۔

مقدمہ اصلاح سخن کا مقدمہ میرے عزیز دوست مولانا سلطان حیدر صاحب جوش نے تحریر فرمایا ہے ۔ مقدمہ حد سے زیادہ بلیغ ہے ۔ شعر اور اصلاحِ شعر پر عالمانہ اور محققانہ بحث فرمائی ہے ۔ اگر میں دیوان حالی اور شعر العجم کے مقدمات پڑھ کر دماغ کو عادی نہ کرچکا ہوتا تو ہرگز امید نہیں تھی کہ میرا کمزور دماغ جوش کے اس مقدمہ کو جذب کرسکتا ۔ الفاظ بھی وزنی ہیں اور مضامین بھی ٹھوس ہیں ۔ پھر دلائل و براہین کے بار نے انھیں اور بھی بھاری کر دیا ہے ۔ لذتِ شعری کو عربی ادبا، فارسی فصحا، یونانی حکما، اُردو شعرا، انگریزی پوئیٹس کے اقوال دانا دے بہت شیریں بنا دیا ہے ۔ گویا شہدِ عربی قندِ پارسی، شکرِ تیغال، شکرِ انگریزی، شکرِ دیسی، سب حلاوتیں ایک جگہ جمع کردی ہیں ۔ میری رائے میں اصلاحِ سخن کے مقدمہ کو

تھوڑے نمک کی بھی ضرورت تھی۔ شوق صاحب نے بھی غلطی کی اگر جوش صاحب کو اب نمک مرچ سے پرہیز ہے تو ایک دوسرا مقدمہ مسٹر جان بل۔ یا مسٹر ریفائیل سے لکھا لیتے تاکہ یہ بے نمکی کی شکایت رفع ہو جاتی۔ بہر حال جوش نے جو بلیغ اور وقیع بحث شعر اور ذوق شعر پر کی ہے وہ قدر کے قابل ہے، اسکے مطالعہ سے قارئین اصلاح سخن کے معلومات میں ایک کارآمد اضافہ ضرور ہو گا۔

التماس یہ مؤلف کا اپنا بیان ہے انھوں نے سب کچھ کہہ دیا ہے اور سب کچھ بتا دیا ہے۔ عبارت نہایت دلکش ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شوق کا قلم اردو نثر پر بھی اپنا کافی اقتدار قائم کر چکا ہے۔ فاضل جامع اصلاح سخن نے اُن دشواریوں کو بھی نہایت لطیف طرز میں بیان فرمایا ہے جو اساتذۂ کرام کے آستانہ ہائے گرامی پر لسبابِ اکتساب فیوض پیش آئی ہیں۔ چند دلکش جملوں میں اساتذۂ موصوف کے اُس طرز عمل کی طرف اشارہ کیا ہے جو انکشاف حقیقت کے بعد برتا گیا۔ فاضل سندیلوی نے اپنی معصومیت کو قائم رکھتے ہوئے ان اصلاحات پر ایک اجمالی تنقید بھی کی ہے گو وہ کہتے (یہ) ہیں کہ اصلاحات پر تنقید میری قدرت سے باہر تھی۔ میری کتاب میں سب سے زیادہ دلکش منظر یہ ہے کہ ایک شعر ایک جگہ قلمزد ہو جاتا ہے وہی دوسری جگہ اُستاد کی حوصلہ افزائیوں کا ہار پہنے پلٹتا ہے اور صاد پر صاد نظر آتے ہیں۔ کسی کی نظر کسی سقم پر پڑ گئی کسی کی کسی عیب پر سب کی اصلاحیں مد نظر رکھ کر اگر شعر پر نظر کی جائے تو شاید ہی کسی شعر میں کوئی نقص نظر آئے ـــــــ حضرت صفدر نے (مشاطۂ سخن میں) اصلاح درج کرنے کے بعد داد اصلاح دی مگر یہ کام میری قدرت سے باہر تھا۔ میں اپنے اُستادوں کی اصلاح پر قلم اُٹھانے کی جرأت کہاں سے لاتا، میں سب کے فیض سے مستفیض ہوا تھا۔"

ان خط کشیدہ جملوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شوق صاحب نے اساتذۂ کرام کو اصلاح معجز نظام پر داد بھی دے دی۔ شوق کہتے ہیں کہ "حضرت اقبال کے میکدہ کی خیر ہو جہاں سے میرا جام خالی پھرا" لیکن آپ کی فارسی غزل میں جو غالباً صرف اقبال سے اصلاح حاصل کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہے اقبال کی اصلاح موجود ہے۔ سبو ہو یا صراحی، جام ہو یا جرعہ۔ اقبال نے بھی حسب توفیق شوق کی تواضع کی، شکایت بے معنی ہے۔

اسکے بعد غزلیات اور انکی اصلاحات ہیں، جن پر میں آخر میں گزارش کروں گا۔

صفحات ۱۶۳ لغایت ۲۱۸ پر اساتذہ کرام کے خطوط درج کیے گئے ہیں۔ کتاب کا یہ حصہ نہایت دلچسپ ہے اگر قارئین میری طرح اس مراسلت کو شوق اور غور سے پڑھیں گے تو یقیناً بہت محظوظ ہونگے۔ ان خطوط کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادب اُردو کے علمبرداروں نے شوق کی شاگردی کو کس قدر تپاک سے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور کیسے کیسے پیارے القاب سے شاگرد کو مخاطب کیا ہے۔ عزیزی، عزیز من، مہربان عزیز، عزیزم، عزیز القدر، عزیز از جاں، محبوب لعام مخلصی، محبی، میرے پیارے دوست وغیرہ وغیرہ۔ یہ القاب اُس محبت اور خلوص کے مظہر ہیں جو ایک بزرگ کو ایک ساد مستند خورد کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ایسے موقع پر میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر بھی آ جاتا ہے کہ جب ان بزرگوں کو شوق صاحب کے اس عجز و انکسار کی اطلاع ملی ہوگی کہ اُنکو کسی آستانہ کی بھی جبہ سائی منظور نہیں ہے بلکہ شوق کے مشرب میں ہر شاگرد اُستاد ہے، اور ہر اُستاد شاگرد ہے تو ہمہ اوست کے اصول نے اساتذہ کرام کو کس قسم کی مایوسی سے ہمکنار کیا ہوگا اور اُنکی آرزوؤں کا کیا حشر ہوا ہوگا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اکثر شعرائے کرام شوق صاحب کی ملاقات کے مشتاق رہے۔ ثاقب، عزیز، محشر کا اشتیاق دید بالخصوص توجہ کے قابل ہے۔ آزاد ناطق کی رائے میں بھی ملاقات صوری شاگرد کے حق میں اُستاد بننے کا ایک مجرب نسخہ ہے لیکن جہاں تک کتاب سے پتہ چلتا ہے، شوق صاحب نے ان سب کو مایوس کیا اور محروم رکھا۔ اس نوجوان کی اس حرکت پر معلوم نہیں میں اُسے ستمگر، بیوفا، بے مہر، کیا کیا کہکر ملامت کرتا لیکن بطور سی آئی ڈی آفیسر کے وہ محکمۂ شاعری کی بصیغۂ راز ہمدردی کر رہا ہے۔ ملاقات صوری میں راز فاش ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے شوق بے وفائی اور بے اعتنائی کے جُرم سے بریت کے قابل ہے۔ سندیلہ کا لکھنؤ سے زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ لیکن مجھے تعجب ہے کہ ایک بڑی مُدت تک بزرگان لکھنؤ کو بھی اس شاعر یا ساحر نے مسحور رکھا۔ مولانا ثاقب، علامہ طباطبائی اور بعض دیگر حضرات کے بھی خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ استادی کے فیوض سے شوق کو بہرہ اندوز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ معلوم نہیں شوق نے کیا جادو کیا کہ اصلاحات کی لڑیوں میں اِن بزرگوں کی اصلاح کے جواہر بھی چمک رہے ہیں۔

مرزا محشر نے اپنے مراسلہ نمبر ۵ میں شوق کو تحریر کیا ہے " میں نے ایک دوست سے آپ کی نسبت یہ سُنا کہ آپ اپنے ایک ہی کلام پر مختلف شعراء سے امتحاناً اصلاح لیتے ہیں" پھر اپنی آزاد خیالی کا تذکرہ فرماکر مفصل الفاظ میں اظہار پسندیدگی بھی کیا ہے لبدکو نہایت بیتابی کے ساتھ تحریر فرمایا ہے۔ "مگر میں دریافت کرتا ہوں کہ کہاں تک یہ امر صحیح ہے اور اس کا اصل واقعہ کیا ہے۔ جواب ضرور لکھیے گا" پورا خط پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ میرزا صاحب کا اظہارِ پسندیدگی محض شرافت نفس اور وسعتِ اخلاق کی وجہ سے ہے۔ ناپسندیدگی کے اصرار وتکرار سے جو غلطی ہو چکی تھی وہ اور بھی زیادہ سنگین ہو جاتی۔

عزیز لکھنوی نے اپنے خط نمبر ۲ میں شوق کے اختراعی طریقۂ حصول اصلاح کو ناپسند فرمایا ہے۔ اور خط نمبر ۹ میں طرز نگارش بالکل ہی بدل گیا ہے۔ بہت سے حضرات جو سندیلہ سے دور و دراز مقامات پر تشریف رکھتے ہیں عرصہ تک بیخبر رہے اور اُستادی کے سُرور میں مخمور و مغرور رہے ہونگے۔ لیکن اصلاحِ سخن کی اشاعت نے اس راز کو طشت از بام کردیا۔ اب کون ہے جو خبردار نہیں ہے۔ معلوم نہیں اساتذۂ گرامی آجکل شوقؔ بیچارے کو کن القاب سے یاد فرماتے ہونگے۔

آرزو، محشر، شوق قدوائی مرحوم نے نہایت اخلاص سے شوق کو تبدیلی تخلص کا مشورہ دیا۔ جس طرح ہندولا میں تبنیت کے وقت پسر متبنّٰی کا نام سابق تبدیل کیا جاتا ہے غالباً اسی طرح اس رسمی شاگردی اُستادی میں تخلص کی تبدیل و تجدید ایک ضروری شرط ہوگی۔ شوق کی یہ شوخی ضرور قابل تعجب ہے کہ شوق قدوائی کے شاگردوں میں شامل ہونے کے لیے اپنے موجودہ تخلص کی معیت میں حاضر ہوگئے۔ مرحوم قدوائی اگر تبدیلی تخلص کا مشورہ نہ دیتے تو کیا کرتے۔ شاید شوق سندیلوی نے عارضی طور پر تبدیلِ تخلص کو منظور بھی کرلیا تھا۔ قدوائی کی اصلاح میں سندیلوی کا تخلص جابجا ساحل نظر آتا ہے، لیکن بفضلہ اب پھر وہی شوق ہیں۔ مجھے حق نہیں ہے کہ فاضل سندیلوی کے لیے کوئی نیا تخلص تصنیف کروں، اگر انھیں خود کبھی تبدیلِ تخلص کی ضرورت محسوس ہو تو شوق کے بجائے شوخ تخلص فرمائیں۔ اس تھوڑے سے تصرف میں یعنی صرف (ق) اور (خ) کے تبادلہ سے تخلص کو حضرت سندیلوی سے معقول نسبت ہو جائے گی۔

اسی سلسلۂ مراسلت میں بعض اساتذۂ کرام کے خطوط میں صراحتاً یا کنایتاً نقد و جنس کا طلب

تقاضا بھی پایا جاتا ہے۔ اکثر ہی خواہانِ ادب اُردو کی رسالے میں اس طرز و شعار سے شعر و سخن کے فن شریف کی تذلیل و توہین ہوتی ہے اور اُستادی کے نام کو بٹا لگتا ہے، لیکن ضرورتمند شعرا قرنِ اولیٰ میں بھی ایسا کرتے رہے ہیں۔ اس خصوص میں حضرت نوح رئیس نارہ قابلِ تذکرہ ہیں، جو ایک دولتمند شاعر ہیں۔ اُنکے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب نے شاگردی کا ٹکس بہت گراں مقرر فرمایا ہے، اور اسکے وصول کے قواعد بھی نہایت سنگین ہیں۔ مولانا نوح اگر مناسب سمجھیں تو تنسیخ یا ترمیم سے ان قواعد کو قابلِ برداشت بنا دیں۔

مولانا نیاز فتحپوری مدیر نگار کے بھی چند خطوط ہیں۔ آپ نے خط ۵ میں اپنے ہونہار شاگرد کو ایک قیمتی مشورہ دیا ہے، جسکے الفاظ حسب ذیل ہیں " اگر غزل کہنا ضروری ہے تو پہلے کہیں محبت کیجیے، اور اگر ہے، تو بڑا تعجب ہے کہ آپ غزلوں میں خالص جذبات محبت سے بحث نہیں کرتے، بلکہ لکھنؤ کی پامال اور افسردہ آرٹ کی شاعری کو آپ اختیار کیے ہوئے ہیں۔" از شرع نیاز صاحب کے اس مشورہ کو کسی نظر سے دیکھیں، نیاز اس سے بے نیاز ہے۔ میں صرف ایک شاعر اور تبصرہ نگار کی حیثیت سے گزارش کرتا ہوں کہ ہر شاعر کو جذبات پیدا کرنے والی زنانہ یا مردانہ مشین کا میسر آجانا آسان نہیں ہے، اس لیے جذباتی شاعری کے اس دورِ جدید کو مولانا نیاز اس ترکیب سے ہرگز کامیاب نہیں بنا سکتے۔

عرصہ تک حضرت شوق بطور ایک سعادتمند شاگرد کے استادوں سے خط و کتابت کرتے رہے اور بعض خطوط میں محاورات و مصطلحاتِ فن پر بھی رائیں حاصل کی ہیں، روپیہ بھی خرچ کیا، وقت بھی نذر کیا، اُستادوں کے احکام کی بھی تعمیل کی، تخلص کی تبدیلی کو بھی منظور کیا، مختلف بارگاہوں میں غلامی کا طوق بطورِ منت کے گلے میں ڈالا اور دنیائے شاعری پر واضح کر دیا کہ علمبردارانِ شاعری کون ہیں، کیا ہیں، کیا کرتے ہیں۔ اب خواہانِ ادب اُردو اس منظر کو دیکھکر عبرت بھی حاصل کر سکتے ہیں اور آیندہ کے واسطے اپنا دوسرا راستہ بھی تلاش کر سکتے ہیں۔ غالب کے ایک مقطع کو تصرف کرکے شوق کے حسب حال بنا دیا ہے۔

زمانہ میں ہم بے ہنر بنکے غالب   تماشائے اہلِ ہنر دیکھتے ہیں

تبصرہ نمبر (۱) ڈاکٹر عبد الستار صاحب صدیقی نے اُردو نظم و نثر کی تاریخ کو مختصراً دلکش طرز میں تحریر فرمایا ہے۔ شوق کی مساعی کو بدعت حسنہ کہکر سراہا ہے

اصلاح شعر پر کار آمد بحث فرمائی ہے، اساتذۂ کرام کی بعض بعض اصلاحوں کی داد بھی دی ہے، اصلاحات کے تاریک پہلو پر بھی ایک ہلکی سی نظر ڈالی ہے۔ ایسے موقع پر مصلحین کے احترام کو ملحوظ رکھا ہے اور غالباً اسی وجہ سے صرف کتاب کے صفحہ اور سطر کا نشان دیکر، صفحہ کی تلاش سطروں کا شمار قارئین کے حوالہ کیا ہے وہ اس زحمت کو گوارا فرما کر مصلح کا اسم گرامی معلوم کر سکتے ہیں۔ اور اگر صدیقی صاحب کی رائے سے متفق ہوں تو مصلح کے حق میں علیہ ما یستحقہ لکھکر تبصرہ کو مکمل کریں۔ بہر حال صدیقی صاحب نے اس مختصر تبصرہ میں جو کچھ کام کیا ہے بہت خوب ہے اور اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ قدرت نے اُنکو شعر فہمی کا ذوق سلیم عطا فرمایا ہے۔

صدیقی صاحب کا خط

شوق صاحب نے اس تبصرہ لکھنے کے بعد صدیقی صاحب کو پھر تصدیعہ دیا تھا کہ وہ اصلاح سخن کے اجزائے مستزاد پر تبصرہ فرمادیں صدیقی صاحب نے اس فرمایش کی تعمیل نہیں کی۔ لیکن میدان محشر کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق بڑے شد و مد سے کی ہے جو نہایت قابل عزت ہے۔

تبصرہ نمبر۲

تبصرہ مکرمی مولوی امیر احمد صاحب علوی نے تحریر فرمایا ہے جو نہایت لطیف اور نمکین ہے۔ آپ کا انداز تحریر اس قدر دلکش اور بلیغ ہے کہ ہر ہر جملہ تحسین و آفریں کا مستحق ہے۔ میں نے جوش سے دوستانہ شکایت کی تھی کہ اُنکے مقدمہ میں اعتدال سے زیادہ حلاوت ہے۔ مگر علوی صاحب نے شاعری کے سلسلہ میں مٹھائی کی بابت قطعی اور دوامی احکام امتناعی جاری فرما دیے۔ آپ کی رائے میں شاعر کو نذر و نیاز کے نام سے بھی مٹھائی کھانا مباح نہیں ہے۔ آپ کا منشا ہے کہ سندیلہ کے لذیذ و لطیف لڈووں سے بھی شاعر اپنے کام و زبان کی تواضع نہ کرے۔ آپ کی مرضی ہے کہ کسی شاعر کے پُرانے شاگرد بھی نئے شاگرد سے شیرینی کا مطالبہ نہ کریں۔ علوی صاحب کا یہ فتوائے اخلاقی اصول پر کتنا ہی وقیع ہو لیکن اگر اسپر عملدرآمد شروع ہو گیا تو آیندہ سے شعر بہت پھیکے ہوا کریں گے۔

علوی صاحب نے اصلاحی غزلوں کی تعداد سہواً بجائے ۱۶ کے ۱۰ تحریر کی ہے اور اساتذۂ مصلحین کی تعداد بجائے ۴۲ کے ۳۵ ارقام فرمائی ہے۔ ان ۴۲ میں سے تین ایسے بزرگ ہیں جنھوں نے اصلاح کی کشمکش میں پڑنا پسند نہیں فرمایا ہے۔ اس طور پر مصلحین کی تعداد شماری ۳۹ ہو سکتی ہے۔ مولانا شرر نے بھی دیباچے میں اساتذہ کی تعداد سہواً ۳۵ تحریر فرمائی ہے۔ اور غالباً اسی غلطی کا بہ ستدی اثر ہے کہ علوی صاحب سے بھی وہی غلطی ہوئی۔

اصلاحات شعر حقیقت یہ ہے کہ شعر کی اصلاح کرنا شعر کہنے سے زیادہ مشکل ہے۔ شعر کہنے میں شاعر کے سامنے ایک وسیع میدان ہوتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے جس تخئیل کو چاہے موزونیت کا جامہ پہنا سکتا ہے لیکن مصلح مجبور ہے کہ شاگرد کی تخئیل کو تبدیل نہ کرے ہاں مناسب تصرف سے اُسے بلند کر سکتا ہے۔ شاگرد کے شعر کو قلمزد کر کے دوسرا شعر دیدینا ایک قسم کی مرحمت ہے لیکن اسکو اصلاح سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ شعر میں سے اغلاط و اسقام کا رفع کرنا اُستاد کا فرض اولیں ہے اگر اصلاح کے بعد بھی شعر میں عیوب و نقائص باقی رہ جائیں تو شاگرد بری الذمہ ہوجاتا ہے اور اُستاد قصوروار ہے۔ انھیں وجوہ سے زمانہ قدیم میں اُستادی کا منصب اُن حضرات کے سپرد کیا جاتا تھا جو فی الواقع اپنی وسعتِ معلومات، علمی قابلیت، موزونیِ طبع سے شاگرد کے کلام میں صحیح طور پر اصلاح کرنے کی طاقت رکھتے تھے۔ یہ استادی و شاگردی کا رشتہ دوستانہ ہوتا تھا، اسکو پیری و مریدی کا رنگ نہیں دیا جاتا تھا۔ اب زمانۂ حاضرہ میں ہر شخص اُستاد بننے کا متمنی ہے۔ بعض حضرات خوش فکر ضرور ہیں لیکن فنِ شاعری کے اصول و قواعد سے ناواقف ہیں، بعض بزرگ اس فن خاص کی بابت کافی معلومات رکھتے ہیں لیکن طبیعت اس قدر بھدی پائی ہے کہ خود بھی اچھا شعر نہیں کہہ سکتے اور دوسرے کے بُرے شعر کو بھی اچھا نہیں بنا سکتے۔ بعض شخصوں میں یہ دونوں قابلیتیں موجود نہیں ہیں لیکن اُستادی کا بھوت اُن پر بھی سوار ہوگیا ہے۔ شوق سندیلوی نے اپنے حسنِ تدبّر سے ایک ہی غزل پر اساتذۂ اُردو کی اصلاحات حاصل فرماکر اربابِ ذوقِ سلیم کی نئے انداز سے ضیافت کی ہے۔ اور یقیناً شوق صد ہزار آفریں کا مستحق ہے۔ ان اساتذۂ کرام میں سے اکثر ایسے ہیں جن سے مجھے نیاز حاصل ہے، بعض ایسے ہیں جن کو اُنکے نام سے اور کلام سے جانتا ہوں، کچھ ایسے بھی ہیں کہ بدقسمتی سے قبل ازیں میں نے اُن کا نام بھی نہیں سُنا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ شوق کے ہر شعر اور اُن حضرات کی ہر اصلاح کی داد دوں، لیکن تبصرہ کی ضخامت یقیناً "اصلاحِ سخن" سے کہیں زیادہ ہوجاویگی۔ مجبوراً ہر غزل کے ایک دو شعر اور اُنکی اصلاح پر تبصرہ کر کے قارئین کی ضیافت طبع کرتا ہوں، اُنکے کرم سے اُمید ہے کہ اس مختصر اور روکھی پھیکی دعوت کو قبول فرماکر مجھے شکرگزاری کا موقع دیں گے اور "اصلاحِ سخن" کو اول سے آخر تک پڑھکر خود جامع کی محنت کی قدردانی فرمائیں گے۔ وہوہذا

صورتِ حال یہ آئینۂ رازِ دل ہے
رنگ چہرے کا سر بزم ہوا ہوجانا

باقیؔ، عزیزؔ، ناطقؔ کی رائے میں "رنگ چہرے کا ہوا ہو جانا" صحیح نہیں ہے۔ تابلؔ، یکتاؔ، وحشتؔ، نیازؔ، نوحؔ، مومنؔ، مضطرؔ، شوقؔ قدوائی، شادؔ، شہرتؔ، سائلؔ، دلؔ، جلیلؔ، جگرؔ، بیاکؔ، افضلؔ، آزادؔ، آرزوؔ ان سب حضرات نے اسکو صحیح تصور فرمایا ہے۔ اس قسم کے اختلاف رائے کو ادب اردو کی بدقسمتی سمجھنا چاہیئے۔ میری نظر سے "رنگ چہرہ کا ہوا ہو جانا" نہیں گزرا ہے۔ اس لیے من حیث المحاورہ میں کبھی اسے صحیح نہیں سمجھتا ہوں۔ اساتذۂ گرامی نے اصلاح کے رنگ کو بھی اتنا گہرا کر دیا ہے کہ شعر کے اصلی نقش و نگار بھی چھپ گئے ہیں

سائلؔ۔ صورتِ حال یہ آئینۂ رازِ دل ہے　　رنگ چہرے کا مرے تیرے ہوا ہو جانا

مولانا کے "مرے تیرے" کو دیکھیے۔ یک نشد دو شد

شوقؔ قدوائی۔ کیا بچیے عشق کہ کچھ سے کہے دیتا ہے　　رنگ چہرے کا سرِ بزم ہوا ہو جانا

مرحوم قدوائی کے "کہ کچھ" نے شعر کی حلاوت کو بالکل فنا کر دیا ہے۔ دیگر حضرات نے بھی جو کچھ اصلاح کی تکلیف گوارا فرمائی ہے وہ سندیلوی کی فکر سے اعلیٰ نہیں ہے۔

آخری وقت بھی کیا ساتھ نباہا دل نے
روٹھنا ان کا ادھر دم کا خفا ہو جانا

شعر اپنی جگہ پر مکمل ہے لیکن مولانا باقیؔ فرماتے ہیں "دل نے کیا ساتھ نباہا، دم کا خفا ہو جانا کیا" پھر مولانا نے خود شعر کی مرمت فرمائی ہے

باقیؔ۔ میرے پہلو سے نہ تھا آپ کا اٹھ کر جانا　　تھا مری روح کا یہ تن سے جدا ہو جانا

مطلع تو ہوا نہیں، دونوں مصرعوں میں "جانا" کی تکرار کو ہم کیا سمجھیں۔ دوسرے مصرعہ میں "میری" بلا ضرورت ہے۔ مصرعہ شاید یوں اچھا ہوتا: بلکہ یہ روح کا تھا تن سے جدا ہو جانا۔

نوحؔ۔ اُف وہ منظر بھی تھا کس قہرِ غضب کا منظر　　روٹھنا انکا ادھر دم کا خفا ہو جانا

ہماری کوتاہ نظری ہی سہی لیکن دوسرے مصرعہ میں ہم کو قہر و غضب کا منظر کہیں نظر نہیں آتا۔ وحشتؔ فرماتے ہیں کہ آخری وقت کون کس سے روٹھتا ہے، اسوقت تو ضرور رحم آ جاتا ہے۔ لیکن جذبات حسن و عشق کی خود ردی کسی اخلاقی اصول کی پابند نہیں ہے۔ جلیلؔ اور ریاضؔ کی ترمیم سے شعر اسقدر رکیک ہو گیا کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

جلیلؔ۔ کیا بگڑنے کی ادا تھی کہ قضا بنگئے ہی　　دوسرا مصرعہ بدستور۔

ریاضؔ: کیا برابر کا دیا ہے دم آخر نے جواب   روٹھنا اُنکا ادھر دم کا خفا ہو جانا
کیاؔ کی رائے میں دم کا خفا ہو جانا یعنی مرگ مستقل نہیں ہے۔ اس مختصر مضمون کو زیادہ طویل کرنے کا موقع نہیں ہے لیکن کمال افسوس کہا جاتا ہے کہ کیاؔ کی رائے غلط ہے۔

اب اپنا دل تنگ ہے زندانِ تمنا
اللہ رے یہ جوشِ فراوانِ تمنا

مولانا ریاضؔ فرماتے ہیں "جوشِ فراوانِ تمنا کے سبب سے دل تنگ کا زندان تمنا ہو جانا سمجھ میں نہیں آتا" دل تو پہلے ہی سے تنگ تھا فراوانیِ تمنا سے اس قدر گھچ پچ ہو گئی کہ وہی دل تنگ زندان تمنا بنگیا۔ سرکاری جیل تک خیال کو محدود نکرنا چاہیے بلکہ سراج الدولہ کے بلیک ہول کا بھی نقشہ مدنظر رکھنا چاہیے کہ اگلے زمانہ میں قید خانہ میں بیشمار قیدی ٹھونس دیے جاتے تھے۔

مولانا ناطقؔ فرماتے ہیں کہ "جوش کا مقتضا وسعت ہے نہ کہ تنگی" - آپ کا ذہن رسا بھی اس طرف گیا ہے کہ فراوانیِ تمنا کے جوش نے دل کو تنگ کر دیا۔ افسوس۔

مولانا نیازؔ فرماتے ہیں کہ "مصرعۂ اول میں فراوانیِ تمنا کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اگر دلِ تنگ زندان تمنا ہو گیا تو اس سے جوشِ فراوانِ تمنا کیونکر ثابت ہو سکتا ہے" آپ کا یہ نوٹ بھی گورکھ دھندا تھا، اصلاح میں بھی عجیب نُدرت ہے۔

نیازؔ۔ دل شق ہوا ہو گیا زندانِ تمنا   اللہ رے یہ جوشِ فراوانِ تمنا
پہلے مصرعہ کی بندش میں جو نقص ہے، معلوم نہیں نیازؔ کی نفاست طبع نے اسکو کیسے پسند کر لیا ہے۔ زندان تمنا سے در زندانِ تمنا مراد لیا ہے۔ شوق کا شعر بجائے خود مکمل ہے۔ دیگر مصلحین نے بھی بلا ضرورت اصلاح کی زحمت گوارا فرمائی ہے اور اصلاح بھی معمولی اصلاح ہے۔

کیا ڈالیں کسی آرزوئے تازہ کی بنیاد
نظروں میں ہے بربادیِ ایوانِ تمنا

شعر بے عیب ہے لیکن قدوائی مرحوم قلمزدگی کا فتوےٰ دیتے ہیں۔ کیاؔ، اطہرؔ، افضلؔ، بیباکؔ، صفیؔ، مضطرؔ، وحشتؔ نے صاد بنا کر شعر کی عزت افزائی کی ہے۔ اس اختلاف آرا پر ذوق سلیم فریاد کرتا ہے۔

مولانا باقیؔ کا اعتراض ہے کہ فارسی ترکیب میں واؤ کا گرانا ممنوع ہے"۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ باقیؔ صاحب اطہرؔ کا خط ۱۲ پڑھ کر اپنا اطمینان خاطر کرلیں۔ احسنؔ صاحب کی یہ رائے تو

صحیح ہے کہ دیتے ہوئے الفاظ موزوں نہ ہونے چاہییں لیکن جناب احسن نے اور حضرت آرزو نے جس طرح مصرعہ بنایا ہے "ڈالے کوئی کیا آرزوئے تازہ کی بنیاد" - یہ اپنی تقسیم و تنکیر کی وجہ سے دوسرے مصرعہ سے چسپاں نہیں - البتہ بیخود موہانی نے بندش کو بہت چست کر دیا اور خوب بنایا ہے -

بیخود موہانی - جب پڑنے لگی آرزوئے تازہ کی بنیاد — یاد آگئی بربادیِ ایوانِ تمنا

بعض دیگر مصلحین کے تصرفات بھی ملاحظہ کر لیجیے :-

سائل: کیا ڈالیں کسی آرزوئے تازہ کی بنیاد — مسمار ہوا جاتا ہے ایوان تمنا -

جناب نے اس مشہور مثال سے اختلاف کیا ہے (نیا کوٹھا بنتا ہے پرانا کوٹھا گرتا ہے)

شفق: ہونے لگا جب خانۂ دل پھر سے ویراں — یاد آگئی بربادی ایوان تمنا -

پہلے مصرعہ میں بہت آورد ہے -

محشر: کیا ڈالیں کسی آرزوئے تازہ کی بنیاد — وہ دل نہ رہا جو کہ تھا ایوان تمنا -

زحافت کے علاوہ "جو کہ" نہایت برا ہے -

اک نگاہِ یاس سے قاتل کے تیور بجھ گئے
ایک چھینٹے سے لہو کے کند خنجر ہو گیا

شعر نہایت اچھا ہے، مگر بیباک صاحب نامنظور فرماتے ہیں - اور بیخود موہانی کا عریض و طویل نوٹ بھی کچھ کم قابلِ تعجب نہیں ہے - حالانکہ دونوں مصرعے علیحدہ علیحدہ دو حقیقتوں کے مظہر ہیں - اس شعر کے ساتھ اکثر مصلحین نے اپنی کم توجہی سے بیدردانہ سلوک کیا ہے -

بیخود موہانی - اک نگاہِ یاس سے قاتل کے تیور بجھ گئے — تیر رکھے رہ گئے بیکار خنجر ہو گیا

(خنجر کیوں بیکار ہو گیا، پھر کام آئے گا) -

دل: " — ہاتھ کانپے قتل گہ میں کند خنجر ہو گیا

(قتل گہ میں برائے بیت ہے اور خنجر کیوں کند ہو گیا، اس کا ثبوت نہیں ہے)

سائل: " — چاٹ لینے سے لہو کے کند خنجر ہو گیا

(ہاں مٹھائی زیادہ کھانے سے بچے الکن ہو جاتے ہیں شاید دوسرے مصرعہ میں اسی طرف اشارہ ہے)

نوح: " — چند چھینٹوں سے لہو کے کند خنجر ہو گیا

(ایک چھینٹے کے بجائے چند چھینٹوں نے کیا حسن پیدا کیا؟)

آرزو۔ اے نگاہِ یاس بس قاتل کے تیور رکھ گئے خون میں تر ہوتے ہی بے آب خنجر ہو گیا
باقی۔ اک نگاہِ یاس قاتل کو پشیماں کر گئی ایک چھینٹے سے لہو کے کند خنجر ہو گیا

(ہم کیا کہیں)

ریاض۔ آپ ہی جاتی رہی سرخی لہو کی دیکھ کر خون میرا چاٹتے ہی کند خنجر ہو گیا
سرخی دیکھنے سے آپ کیوں جاتی رہی ؟

شفق۔ اُف رے قاتل پہ نگاہِ یاس بسمل کا اثر بات چل کر رک گیا شرمندہ خنجر ہو گیا

پہلے مصرعہ میں فارسی ہندی اضافتوں کا اجتماع ہے اور دوسرے مصرعہ میں شرمندہ کی ال دبتی ہوئی ہے۔

مضطر۔ اک نگاہِ یاس سے قاتل کی نظریں پھر گئیں ایک چھینٹے سے لہو کے کند خنجر ہو گیا

نظریں پھر جانا کچھ اور معنی رکھتا ہے جسکو موجودہ تخیل سے تعلق نہیں ہے۔ تیور چھُٹ گئے دوسری چیز ہے اگر اس خیال سے قطع نظر کیجائے کہ دونوں مصرعوں میں روایت کا اجتماع ہو گیا ہے، تو حسن صاحب نے جو شعر لکھا ہے وہ بجائے خود نہایت قابلِ تحسین ہے۔ موجودہ دور شاعری میں لکھنؤ دہلی کی زبان کی تفریق کا سوال باقی نہیں رہا ہے۔

حسن۔ اک نگاہِ یاس سے جلاد کا دل بجھ گیا ایک آہ گرم سے بے آب خنجر ہو گیا
دیکھ ظالم تیرے فریادی نے وقتِ بازپرس
وہ ہوا باندھی کہ سم میدانِ محشر ہو گیا

سم اور میدانِ محشر کی بابت مصلحین میں بہت اختلاف ہے۔ لفظ "سم" کے کچھ ہی معنی ہوں لیکن وہ اس قدر غیر مستعمل ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے مقلدین کی کثیر جماعت اسکے استعمال کی روادار نہیں ہے۔ اس لفظ میں اس قدر اجنبیت ہے کہ بعض حضرات اس سے واقف بھی نہیں۔ جن حضرات نے اسے صُم یا سَم (زہر) یا سُن پڑھ کر بغیر سوچے سمجھے بےضرورت اصلاح کی زحمت گوارا فرمائی ہے میں سوائے اظہار افسوس کے اور کوئی ہمدردی انکے ساتھ نہیں رکھتا ہوں۔ ایسا محاورہ جسے اب کوئی بولتا نہیں بلکہ سمجھتا بھی نہیں ہے لکھنے کی کیا ضرورت ہے اور اصلاح کی کیا ضرورت ہے۔ میدانِ محشر کو بوجہ اسکے کہ خود محشر میں ظرفیت موجود ہے بیخود دہلوی، نوح، آرزو، شوق قدوائی، عزیز، فانی، وحشت، غلط سمجھتے ہیں۔ اطہر، بیخود موہانی، ریاض، استاد جلیل میدانِ محشر کو یعنی میدانِ حشر استعمال کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ فی الواقع عربی، فارسی، اردو میں

محشر بمعنی حشر برابر استعمال ہوتا رہا ہے اور ابتک مستعمل ہے۔ نوحؔ اور وحشتؔ تو یہاں تک مرعوب ہوگئے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے محشر کو ہمیشہ بمعنی حشر لکھا ہے لیکن اب اپنی غلطی سے مطلع ہوکر تائب ہوگئے ہیں۔ افسوس۔ اصلاحِ سخن میں اُن حضرات کی طرف کثرت رائے ہے جو اسکے استعمال کو غلط سمجھتے ہیں۔ لیکن انکی رائے سطحی ہے اور اُس میں کوئی وزن نہیں ہے محشر کے لغوی معنی میں یقیناً ظرفیت موجود ہے۔ لیکن مصطلحین کے اختیارات وسیع ہیں۔ وہ اسم ظرف کو مصدر کے معنی دے سکتے ہیں، مصدر کو اسم فاعل کے معنی دے سکتے ہیں۔ اس قسم کے عام تصرفات کا انکو اختیار رہا ہے۔ محشر اصطلاحاً حشر کے معنی میں استعمال کرلیا گیا۔ عربی، فارسی، اُردو میں یہ استعمال جاری ہوگیا۔ اطہر کا خط نمبر۶ ۔ نیخو دموہانی کا خط نمبر۲ ریاض کا خط نمبر۲ صدیقی صاحب کا خط مشمولہ کتاب ہذا اسناد ملاحظہ کرنے کے بعد حضرات مانعین کا اطمینان خاطر ہو گیا ہوگا۔ اگر با اینہمہ وہ محشر بمعنی حشر استعمال کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔ ایسا ہی کریں لیکن انھیں یہ فتوے دینے کا حق نہیں ہے کہ محشر بمعنی حشر غلط ہے۔ اسکے واسطے دلائل و براہین کی ضرورت ہوگی۔ اس شعر پر جو کچھ اصلاحات کی گئی ہیں وہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی ہیں اور تبصرہ سے بے نیاز ہیں۔

زباں سے اُف نکرنا شمع ساں جل جل کے مرجانا
بالآخر رفتہ رفتہ حدِ ہستی سے گزر جانا

شفقؔ صاحب کا اعتراض ہے کہ شمع کے لیے مرنا صحیح نہیں ہے یہ جاندار کے لیے بولا جاتا ہے۔ مولانا کے اعتراض میں کوئی دم نہیں ہے اور آپ کا پیش کردہ کلیہ بھی صحیح نہیں ہے مولانا نظامی کا شعر غالباً انکے اطمینانِ خاطر کیلئے [illegible] کافی ہوگا ؎

شب از [illegible] چوں گوسفند برد — چراغے بیفروخت شمعے بمرد

شفقؔ صاحب اگر دیکھنا چاہیں گے تو کتب لغات میں شمع کشتن بمعنی مردن ہر جگہ ملیگا۔

شفقؔ صاحب کا دوسرا اعتراض ہے کہ بالآخر بروزن مفعولن آتا ہے یہاں فعولن کے وزن پر آگیا، الف ممدودہ گرگیا۔ یہ اعتراض صحیح ہے۔ افسوس ہے، بزمؔ، یکتاؔ، جلیلؔ، عزیزؔ، کوثرؔ، وحشتؔ نے اس طرف اعتنا نہیں کیا۔ باقی صاحب نے کسی لا معلوم خلاف ورزی کی جرم میں شعر پر جہلیت کا چارج شیٹ لگا دیا ہے لیکن اگر دیگر مصلحین کو اہل جوری کا درجہ بھی دیا جائے تو اس الزام سے شعر بری ہوسکتا ہے۔ میرزا محشر فرماتے ہیں "شمع ساں۔ ساں کا لفظ اب متروک ہے"۔ نوحؔ فرماتے ہیں "شمع ساں۔ یہ ترکیبیں اب بُری معلوم ہوتی ہیں"۔ لیکن ایک

صحیح لفظ کو یا صحیح ترکیب کو خواہ مخواہ متروکات کی فہرست میں داخل کرنا دائرۂ ادب اُردو کو تنگ کرنا ہے جس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ میری ناچیز رائے میں جل جل کے مرجانا حاسد کے لیے مخصوص ہے۔ اگر شوق صاحب جل بجھ کے مرجانا لکھتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ بالآخر کے نقص کو جگر صاحب نے بہت خوب رفع کیا ہے۔ اب دونوں مصرعے خاکسار کی اور جگر کی ترمیم کے بعد اس طرح شعر بناتے ہیں

(امیر) زباں سے اُف نکرنا شمع ساں جل بجھ کے مرجانا
(جگر) پھر آخر رفتہ رفتہ حد ہستی سے گذر جانا

بیخود دہلوی نے مطلع کے درست کرنے میں محنت کی ہے ؎

زباں سے اُف نکرنا شمع ساں گھُل گھُل کے مرجانا ترے عاشق کا آخر اپنی ہستی سے گذر جانا

لیکن گھُل گھُل کے مرنے میں اُف کرنے کا محل نہیں ہے۔ اُف شدید تکلیف میں (جل کر مرنے میں) زبان سے نکل جاتی ہے۔ شوق نے حد ہستی سے گزر جانے میں بھی ایک تکلف کو مدنظر رکھا ہے وہ ہستی سے گزر جانے میں نہیں ہے اسکے معنی صرف مرجانا ہیں جو پہلے مصرعہ میں ہو چکا۔

ستم ہے بڑھ کے گھٹنا ولولہ جوشِ محبت کا
قیامت ہے نظر پر چڑھ کے پھر دل سے اُتر جانا

شعر اس درجہ لطیف اور مکمل ہے کہ بار بار پڑھتا ہوں لیکن طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ بیباک کسی تنقیص معنوی کے جرم میں، نوح تقابل توانی کے گناہ میں، باقی مہمل ہونے کے تصور میں شعر سے بدمزہ نظر آتے ہیں۔ اطہر، بزم، عزیز، مضطر، شہرت، حد سے زیادہ پسند فرماتے ہیں۔ بیخود دہلوی، جگر، جلیل، دل، صفی، کوثر، محشر، وحشت، شعر کو بے عیب اور مستغنی عن الاصلاح سمجھتے ہیں بعض حضرات نے بغیر ضرورت کے بھی اصلاح کی زحمت گوارا فرمائی ہے اور کسی صاحب نے شوق کی تخئیل کو بدل دیا ہے۔ افضل صاحب نے لکھنؤ کے پارینہ اور فرسودہ طرز کو پھر زندہ کیا ہے

سمجھ کر کوئی آنچل رُخ سے سرکائے سرِ محفل نظر پر چڑھ کے پھر دشوار ہے دل سے اُترجانا

شوق قدوائی مرحوم نے شوق کے حسین مصرعہ کا بھدی ترکیب سے حلیہ بدلا ہے۔ "ستم ہے بڑھ کے گھٹنا ولولہ کا جوشِ الفت میں"۔ غرض۔ فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔

غضب ہوا دل صبر آزما نے لوٹ لیا
فریب دیکے مجھے رہنما نے لوٹ لیا

صبر آزما اور رہنما - ان قوافی میں ایطاے خفی ہے سوائے شفق کے اور کسی کا خیال ادھر نہیں گیا - اُن حضرات کی فہرست بہت طویل ہے جنھوں نے شعر کو بے عیب سمجھا ہے - تعجب ہے جناب آرزو نے بھی ادھر توجہ نہ فرمائی - دیگر مصلحین کی اصلاح معمولی ہے، قابل تذکرہ نہیں ہاں حضرت ریاض کی اصلاح میں جو ندرت ہے وہ ضرور قابل تحسین ہے -

وفا نما ترے طرز جفا نے لُوٹ لیا　　فریب دے کے مجھے رہنما نے لُوٹ لیا

غریب شوق کو مارا تری نگاہوں نے

ستم ہوا ستم ناروا نے لوٹ لیا

آرزو صاحب فرماتے ہیں "معشوق کی نگاہ ستم ناروا نہیں ہو سکتی" (کیوں؟) باقی صاحب فرماتے ہیں معشوق کی نگاہ کو ستم ناروا کیسے کہہ سکتے ہیں ہاں نگاہ قہر البتہ ستم ہے (حضرت نگاہ قہر کس کی نگاہ ہوتی ہے) نیاز صاحب فرماتے ہیں کہ ستم ناروا نے اگر لوٹ لیا تو ستم کیا ہوا - ہمیشہ یہی ہوا کرتا ہے - اور پھر مصرعۂ ثانی پر اصلاح کی مشق فرمائی ہے ؎ روا ہوا ستم ناروا نے لوٹ لیا میں عرض کرتا ہوں جب روا ہوا تو ستم ناروا چہ؟ غرض اساتذۂ کرام نے اسی قسم کے مکالمات سے دادِ سخن دی ہے - بعض حضرات نے صاد بنائے ہیں بعض مصلحین نے "تری نگاہوں" کے بجاے "ترے تغافل" بنایا ہے - بعض بزرگوں کی مرمت اصلاح ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے ان

مومن - تری نگاہ نے بیچارے شوق کو مارا...　　غریب کو ترے ناز و ادا نے لوٹ لیا

ڈاکہ معہ قتل کے واردات کی سراسیمگی میں "بیچارے" کی "ے" بھی گر گئی - ایں ہم غم بالاے الم -

نوح - غریب شوق کو مارا اسی نے الفت میں　　ستم ہوا ستم ناروا نے لوٹ لیا

نوح صاحب نے اشارہ قبل الذکر سے بندش میں عجیب اضطراب پیدا کیا ہے -

یکتا - غریب شوق کو مارا ہے کم نگاہی نے　　ستم ہوا ستم ناروا نے لوٹ لیا

مانا کہ کم نگاہی کے معنی بے التفاتی بھی ہو سکتے ہیں، لیکن ہم تو یہی دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے شوق صاحب کو آخر عمر تک کم بصری کی شکایت نہ ہو - شعر میں ذم کا پہلو ہے -

شوق کا مقطع زیادہ اچھا نہ سہی، لیکن خوش قسمت ہے کسی اصلاح کا منت پذیر نہیں ہوا - مصلحین کی مساعی رائیگاں ہوئیں -

کیوں اُلجھتے ہو سنورنے کی نہیں زلف دراز

کہیں یہ بھی مری بگڑی ہوئی تقدیر نہ ہو

آرزو کا اعتراض ہے "پہلا مصرعہ یقین ظاہر کرتا ہے اور دوسرا احتمال بتاتا ہے" لیکن پہلے مصرعہ میں یقین نہ سنورنے پر ہے اور احتمال اپنی بگڑی ہوئی تقدیر کے ہونے کا ہے محلِ یقین و احتمال ایک ہی چیز نہیں ہے - میری رائے میں شعر بے عیب ہے اور اچھا ہے - آرزو، احسن، جلیل کی اصلاحات سوارہ ہیں - پہلے مصرعہ کو بنایا ہے ؎ کیوں اُلجھتے ہیں سنورتی جو نہیں زلفِ دراز - اصلاح اچھی ہے لیکن نوح کی اصلاح زیادہ بہتر ہے - بندش بھی چست ہو گئی ؎ وہ اُلجھتے ہیں سنورتی جو نہیں زلفِ دراز؛ کہیں یہ [illegible]

شاد - کیوں اُلجھتے ہو سنورنے کی نہیں زلفِ دراز [illegible] کی بھی تقدیر نہ ہو

جنابِ محترم نے کنگھی اور زلف کی فرسودہ تخیل کو چھوڑ دیا [illegible] تو مہیں کنگھی کے بجائے شانہ کیوں نہ لکھا -

شہرت - کیوں اُلجھتے ہو سنورنے کی نہیں زلفِ دراز کہیں یہ بھی مری اُلجھی ہوئی تقدیر نہ ہو

مجھے خیال نہیں ہوتا کہ کسی اور نے بھی اُلجھی ہوئی تقدیر کہا ہے - غالباً یہ مولانا شہرت کی جدت ہے -

عشق کی ہے یہ کرامت مجھے ساکت پا کر
اُنکو دھوکا ہے کہ یہ بھی مری تصویر نہ ہو

شعر بے عیب ہے اور بہت کچھ تاثیر رکھتا ہے، مگر اساتذہ نے پھر بھی اصلاح سے تواضع فرمائی ہے - معلوم نہیں اصلاح نے شعر کو بنا دیا یا بگاڑ دیا -

آرزو - اپنے پرتو کے اثر سے مجھے ساکت پا کر اُنکو دھوکا ہے کہ یہ بھی مری تصویر نہ ہو

حسنِ پرتو کے اثر سے مجھے ساکت پا کر الیضاً

کیا آپ کی رائے میں پرتو یا حسنِ پرتو میں وہی اثر ہے جو سرمہ کھانے کا اثر مانا گیا ہے، ورنہ سکوت کیوں ہوا -

بیخود موہانی - دیکھا عشق کا اعجاز لگی چپ جو مجھے اُنکو دھوکا ہے کہ یہ بھی مری تصویر نہ ہو

ہم بھی چُپ لگاتے ہیں بیخود صاحب اصلی مصرعہ اور اصلاحی مصرعہ کا انصاف سے خود ہی مقابلہ کریں -

شوق قدوائی: اتحاد اتنا بڑھا ہے کہ مجھے چپ پا کر - اُنکو دھوکا ہے کہ یہ بھی مری تصویر نہ ہو

قدوائی مرحوم نے عشق کی کرامت کو چھو منتر کر دیا جو اس تخیل کی جان تھی -

ناطق - خامشی ہے مری آئینۂ جذبِ الفت اُنکو دھوکا ہے کہ یہ بھی مری تصویر نہ ہو

نوح۔ شکل آئینہ جو ساکت ہوں تو ساکت پاکر۔ ایضاً۔ بندش نہایت سست ہوگئی اور خواہ مخواہ عشق کی کرامت سے گریز فرمائی ہے۔

وحشت۔ ہوں مرقع اثرِ آئینۂ حسن کا میں۔ ایضاً۔ مرقع اور تصویر ایک ہی چیز ہے۔ پھر تصویر پر تصویر کا دھوکا۔ کیا معنی رکھتا ہے۔ اثرِ آئینۂ حسن کیا؟

اصلاح کی دیگر مصلحین کرام نے بھی جو زحمت گوارا فرمائی ہے بے ضرورت ہے شعر اصلاح کا حاجتمند نہیں تھا۔ اسی غزل میں شوق قدوائی مرحوم نے چند شعر اضافہ فرما کر غزل کو چار چاند لگائے ہیں۔ کم سے کم ایک شعر قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کرنا بہت ضروری ہے؟

نہ بلائی جو نگہ اُس نے تو میں نے پوچھا شہر ایسا بھی کوئی ہوگا جہاں تیر نہ ہو

قدوائی مرحوم ایک خوش فکر شاعر تھے، معلوم نہیں اپنے ہمنام شاگرد کے ساتھ ایسی بے توجہی کو کیوں روا رکھا۔

زباں نہیں کہ تجھے سوزِ عشق دوں میں دُعا عجب مزے کی تپش قلبِ بیقرار میں ہے

آرزو صاحب فرماتے ہیں کہ "فکر کی پستی نمایاں ہوتی ہے" شعر کو اس طرح بنایا ہے

یہی ہے عنصرِ آتش یہی ہے جزوِ حیات تپش ہی جو دلِ بیتاب و بیقرار میں ہے

آرزو صاحب نے شوق کی تخئیل کو بھی باقی نہیں رکھا۔ اور یہ اصلاح ہرگز اصلاح نہیں ہے پھر بھی پہلے مصرعہ کی بندش بہت ثقیل ہے۔

ازل سے دیکھ کر نا سازگاری اپنی قسمت کی میری نظروں میں تھی تصویر انجامِ محبت کی

آرزو فرماتے ہیں کیا انجام کی تصویر اب نظروں میں نہیں ہے۔ لیکن صاحبانِ ذوقِ سلیم شاید اس ریمارک کو قابلِ قدر نہ قرار دیں گے۔ "تھی" کا استعمال بالکل برمحل ہے۔ شعر اصلاح کی دست برد کے قابل نہ تھا۔ دیگر مصلحین بھی اچھا کام نہ کر سکے۔

سُنا موجِ ہوا سے تیرا دیوانہ اُلجھتا ہے اگر سچ ہے تو بس حد ہو گئی اب جوشِ وحشت کی

اکثر مصلحین نے پہلے مصرعہ سے "سُنا" کو نکالا ہے اور پہلے مصرعہ کو بجائے جملۂ خبریہ کے جملۂ انشائیہ بنایا ہے۔ لیکن افسوس ہے یہ خیال نہیں فرمایا کہ جملۂ انشائیہ کے بعد دوسرے مصرعہ کا "اگر سچ ہے"

کہاں جانے لگا۔ شوق قدوائی مرحوم نے اس شعر کو خارج کرنے کا مشورہ دیا ہے اور اسکے معاوضہ میں جو شعر مرحمت فرمایا ہے وہ ہدیۂ ناظرین ہے۔

جو آندھی خاک اُڑاتی آگئی تو مجھ سے بولا وہ   اُدھر دیکھ او سڑی ہو چال آئی تیری وحشت کی

بندش کی گوناگوں کیفیت کو چھوڑ کر ناظرین یہ بھی دیکھیں کہ شعر میں کسی قسم کا تغزل بھی ہے؟

کوئی رہ رہ کے ذوقِ بیخودی میں دل سے کہتا ہے   کہ کچھ تو پردہ داری چاہیے رازِ محبت کی

شعر اپنی جگہ پر نہایت اچھا ہے۔ افسوس ہے کہ مصلحین کی توجہ اصلاح سے شعر میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ پہلے مصرعہ کی اصلاح کے نمونے ملاحظہ ہوں

شوق قدوائی۔ "دبا کر حلق اپنا حشر میں یہ دل سے کہتا ہوں" مشورہ تو آپ نے حلق دبانے کا دیا ہے لیکن شعر کا بھی گلا گھونٹ دیا۔

فانی۔ "مری وحشت سے ذوقِ بیخودی رہ رہ کے کہتا ہے" ذوقِ بیخودی کو اگر پردہ داری کی فکر ہے تو وہ ذوقِ بیخودی نہیں ہے۔

یہ جذبِ تصور ہے یہ عالمِ محویت   ہر چیز میں تیری ہی تصویر نظر آئی

شعر بہت بلند نہیں ہے لیکن صاف ہے۔ مصلحین نے بلا ضرورت پہلے مصرعہ پر اصلاح کی مشق فرمائی ہے۔ کسی نے لطفِ تصور، کسی نے جوشِ تصور، کسی نے مصرعہ کے اجزا کو مقدم مؤخر کر دیا ہے اور جو کچھ کیا ہے اُسکے حق بجانب ہونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ شوق صاحب اگر پہلے مصرعہ میں خفیف ترمیم کو پسند فرمائیں تو مصرعہ زیادہ اچھا ہو جائیگا ؎ یہ جذبِ تصور ہے یا عالمِ محویت

کبھی ایسی وہ نگاہ ناز حسرت آفریں نکلی   کہ یاں حسرت نکل جانے پہ بھی حسرت نہیں نکلی

دوسرے مصرعہ میں "یاں" "پہ" ایسے الفاظ ہیں جو شستہ الترک کہے جاتے ہیں۔ معمولاً روزمرہ بول چال میں یہاں کی جگہ یاں نہیں بولا جاتا ہے اس لیے ترک اولیٰ ہے۔ "پر" کے بجائے "پہ" کا استعمال ہوتا ہے لیکن غیر فصیح ضرور ہے۔ حضرت وحشت فرماتے ہیں نگاہِ ناز کو حسرت آفریں نہیں کہہ سکتے وہ شوق آفریں ہے۔ آپکا دعویٰ بے دلیل ہے جس اصول پر وہ شوق آفریں ہے اسی اصول پر حسرت آفریں ہے۔ آپ یہ بھی کہتے ہیں

"حسرت نہیں نکلی" اس میں بھی کلام ہے۔ کیونکہ حسرت جب نکل گئی "نکل گئی" دوسرے مصرعہ میں حسرت کا لفظ دو جگہ آیا ہے اور دونوں جگہ ایک ہی معنی نہیں ہیں۔

اطہر صاحب نے شعر کو خوب بنایا ہے۔ سبحان اللہ

کچھ ایسی وہ نگاہِ ناز حسرت آفریں نکلی　　کہ حسرت دل کی نکلی اور کچھ حسرت نہیں نکلی

مُنہ اپنا پھیر کر رونے لگے سب دیکھنے والے　　مرقع ناامیدی کا نگاہِ واپسیں نکلی

منہ کی (ہ) دبتی ہوئی ہے، پھر بھی جلیل، بیباک، ریاض، شفق، عزیز، وحشت، نیاز نے شعر کو سادوں کا مرصع پارہ بنایا ہے۔ نوح صاحب نے پہلے مصرعہ کو بنایا ہے ؎ کلیجہ تھام کر رونے لگے سب دیکھنے والے۔ لیکن یہ اصلاح قبل از مرگ واویلا ہے۔ ناامیدی اور نگاہِ واپسیں پر نوح صاحب کی نظر نہیں رہی۔ بیمار کے سامنے اس طرح کلیجہ تھام کر چیخ پکار کرنا برمحل نہیں ہے۔ دل، اور شوق کی اصلاح متوارد ہے ؎ رُخ اپنا پھیر کر رونے لگے سب دیکھنے والے۔ ان حضرات نے وقت کی نزاکت کو تو ملحوظ خاطر رکھا ہے لیکن جو کچھ ترمیم کی ہے وہ نہایت ثقیل اور نامطبوع ہے۔ اطہر صاحب نے مصرعہ کو جس طور سے درست کیا ہے وہ غنیمت ہے ؎ جو آیا دیکھنے منہ پھیر کر رونے لگا آخر۔ لفظ آخر زائد اور حشو ہے ورنہ اصلاح نادر ہوتی۔

نگاہِ شوق کی گرمی سے اُڑ جاتا ہے رنگ اُس کا　　تری تصویر تجھ سے بھی زیادہ نازنیں نکلی

مقطع نہایت خوب ہے تمام اساتذۂ گرامی نے پسندیدگی کا خلعت عطا فرمایا ہے۔ لیکن شفق صاحب نے تخیئل کو بدل کر اصلاح کا فرض ادا کیا ہے ؎

کہے کیا شوق چپکے چپکے یہ کہ جاتی ہے سب کچھ　　تری تصویر تجھ سے بھی سوا ناز آفریں نکلی

تصویر کا چپکے چپکے کچھ کہ جانا محتاجِ ثبوت ہے اور دوسرے مصرعہ میں سوا بمعنی زیادہ غیر فصیح ہے۔

اُس شے پہ ناز کیا جو نہ ہو اختیار کی　　بنیاد دیکھ ہستی بے اعتبار کی

شعر اچھا خاصہ ہے۔ مصلحین میں سے بیباک، جگر، جلیل، کیفی نے "بے اعتبار کی جگہ" ناپائدار بنایا ہے، لیکن پہلے مصرعہ کو دیکھتے ہوئے "بے اعتبار" ہی اچھا ہے۔ بے اعتبار آدمی پر کسی کا قابو نہیں ہوتا۔ مولانا ناطق نے عجیب اصلاح کی ہے ؎

نہ وقع غرور کا نہ جگہ انکسار کی بنیاد کیا ہے ہستی بے اعتبار کی

حضرت انکسار کی جگہ کیوں نہیں ہے، اسکے لیے کیا درکار ہے۔ غرض مصلحین نے جو کچھ فکر کی ہے وہ شوق کی فکر کے بھی برابر نہیں ہے، اور زیادہ کیا عرض کروں۔

ہر ذرہ سے کہتی ہے حقیقت تجھ سا کوئی دوسرا نہیں ہے

شعر حقیقت میں بہت لبند پایہ رکھتا ہے۔ اکثر حضرات نے صاف بتاکر شوق کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ شوق قدوائی مرحوم معمولی بتاتے ہیں۔ لیکن مصلحین نے جو اصلاح فرمائی ہے وہ بھی قارئین کے واسطے باعث تفریح ہوگی۔

جگر۔ ذرہ میں چھپا ہے مہرتاباں ذرہ کوئی دوسرا نہیں ہے

مطلب تو شاید یہ ہے کہ ذرہ کوئی دوسری چیز نہیں ہے معلوم نہیں کہ الفاظ نے ادا کیا یا نہیں۔

دل۔ ہر ذرہ سے کہہ رہی ہے نخوت تجھ سا کوئی دوسرا نہیں ہے

شوق کی پاکیزہ تخئیل کو اس معمولی تخئیل نے عجیب صدمہ پہونچایا ہے۔

ذکیر۔ حقا کہ یہ کھل گئی حقیقت تجھ سا کوئی دوسرا نہیں ہے

حقیقت کیوں کھل گئی، اسکا ثبوت نہیں ہے اور حقا، حقیقت کی خاطر بڑی دقت سے لایا گیا ہے۔

شاد۔ ہر ذرہ کی ہے صدا چہک کر مجھ سا کوئی دوسرا نہیں ہے

صرف ذرہ کی خاطر سے (چہک کر) کہنا ایک آورد ہے جو مولانا کے ابتدائی دور شاعری میں مستحسن ہو، مگر اب پسندیدہ نہیں ہے۔

گیا۔ ہر ذرہ سے آتی ہے یہ آواز مجھ سا کوئی دوسرا نہیں ہے

مصرعہ حقیقت سے بہت دور ہوگیا۔ ذرہ کی آواز کو کسی طرح ثابت بھی کرنا چاہیے

اندازۂ شوق کیا بتاؤں بس حد ہے کہ انتہا نہیں ہے

شعر روح غزل ہے اسکو اصلاح کے نشتروں سے زخمی کرنا ایک ظلم عظیم ہے۔ اطہر نے تخئیل کو بدل کر اسی قافیہ پر ایک شعر لکھ دیا ہے۔ وہ بھی اپنی جگہ پر صدہزار تحسین کا مستحق ہے، لیکن اس شعر کی اصلاح نہیں ہے ؎

اندازۂ اضطراب کیسا جب شوق کی انتہا نہیں ہے

دل، شاد، یکتا نے پہلے مصرعہ پر اصلاح کی مشق فرمائی ہے جو حسب ذیل ہے:
دل - اندازۂ شوق کیا ہو ہمدم - شاد - اندازۂ شوق کچھ نہ پوچھو - یکتا - اندازۂ شوق کچھ نہ پوچھو -

مندرجہ ذیل حضرات نے دوسرے مصرعہ کو اصلاح سے زیر بار منت فرمایا ہے - دہو ہزا
بزم - اسکی کوئی انتہا نہیں ہے - بیباک - یہ حد ہے کہ انتہا نہیں ہے - جگر - یہ جان تو انتہا نہیں ہے -
دلیر - اتنا ہے کہ انتہا نہیں ہے - ریاض - یہ حد ہے کہ انتہا نہیں ہے - شفق - حد ہوگئی انتہا نہیں ہے -
شوق - اتنا ہے کہ انتہا نہیں ہے - فانی - حد یہ ہے کہ انتہا نہیں ہے - یکتا - بے حد ہے کچھ انتہا نہیں ہے -
مصلحین کرام انصاف کے ساتھ جواب دیں کہ اصلاح کی وجہ تحریک کیا ہے کیا وہی شاگردی کی غلامی کا طوق جسکو بطور حقیقت یا فرضیت شوق نے اپنے گلے میں ڈال لیا تھا، اصلاح کی زحمت کا باعث ہوا - اور ان اصلاحات کے بعد شعر اصلی شعر سے اچھا ہوگیا یا نہیں -

ہے اُسکا فراق جان لیوا جینے کا کوئی مزا نہیں ہے

شعر بہت معمولی تھا، لیکن مولانا شفق نے پہلا مصرعہ بدل کر شعر کو بہت بلند کر دیا:

مرنے کا نہ ہو جو لطف اے خضر جینے کا کوئی مزا نہیں ہے

دیگر مصلحین نے جو کچھ کام کیا ہے وہ ذکر کے قابل نہیں ہے -

یہ قطرہ بجائے خود ہے دریا کیا جانے جو آشنا نہیں ہے

شعر حد سے زیادہ لطیف و بلیغ ہے - شفق صاحب نے معلوم نہیں اصلاح فرما کر کیوں پست کر دیا

دریا کی ہے قطرہ میں سمائی کیا جانے جو آشنا نہیں ہے

مٹ کے ہم خاک ہوئے پھر بھی ہے ذروں میں چمک حد نہ کوئی تری اے سوزِ محبت دیکھی

مولانا باقی - ارشاد فرماتے ہیں "مر کے ہم خاک ہوئے لکھتے تو صحیح تھا، مٹنے کے بعد تو بے نشانی کا درجہ ہے - (معلوم نہیں، صاحبان ذوق سلیم مولانا کے اس مشورہ پر کیا کہتے ہونگے) سوز اور چمک میں تلازم نہیں ہے اس لیے ضروری نہیں کہ ذروں میں چمک ہے تو اُن میں سوز بھی ہو" (سوز اور چمک میں تلازم نہیں تناسب ضرور ہے - جب کوئی چیز جلتی ہے تو اُس میں چمک پیدا ہو جاتی ہے تطلع، تحرق کے معنی بھی آیا ہے و نار اللہ الموقدة التی تطلع علی الافئدہ -

ریاض صاحب نے جو ردیا کیا ہے وہ معنی خیز ہے لیکن جو اصلاح فرمائی ہے وہ دلآویز نہیں ہے۔ اکثر حضرات نے دوسرے مصرعہ پر اصلاح کی مشق فرمائی ہے وہ ہدیۂ ناظرین ہے شفق: شعلہ باری تری اے سوز محبت دیکھی۔ صفی: طرفہ تاثیر تری سوز محبت دیکھی۔ عزیز: انتہا تیری: اے سوز محبت دیکھی۔ یکتا: حد کوئی تیری نہ اے سوز محبت دیکھی۔

اس امر کا فیصلہ کہ اصلاح کا کیا درجہ ہے، ناظرین کے ذوق سلیم پر منحصر ہے۔

دل نے کی ہم سے دغا جھک کے ملی انکی نظر رنگ اپنوں کے وہ ہیں اور یہ بیگانوں کے

تخئیل میں کسی قدر جدت ہے لیکن شعر بھی معمولی ہے مصلحین نے بھی اصلاح کا کام بہت بیدلی اور بے توجہی سے کیا ہے۔ ریاض صاحب نے وہ کی جگہ یہ اور یہ کی جگہ وہ بنایا ہے۔ حالانکہ شوق نے اسم اشارہ بعید و قریب کا صحیح استعمال کیا تھا۔ بیخود موہانی کی اصلاح ملاحظہ ہو ؎

اپنا دل رک کے ملا انکی نظر جھک کے ملی رنگ اپنوں کے ہیں یہ انداز یہ بیگانوں کے

پہلے مصرعہ میں اپنا دل رک کے ملا سمجھ میں نہیں آتا۔ عاشق کا دل رک کے نہیں ملتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ (یہ) جس صورت سے دو جگہ رکھا گیا ہے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ شوکت مرحوم نے شعر بھی بنایا اور اپنی اصلاح پر اعتراض بھی کر دیا۔ فرماتے ہیں "دل بھی اک نظر بھی ایک مت سے یگانے بیگانے کہاں ہیں" مرحوم کے اعتراض میں کوئی وزن نہیں ہے۔

کس جلے دل سے یہ اف کی ترے دیوانے نے شمع ساں جلنے لگے خار بیابانوں کے

شعر بھی معمولی ہے اور اصلاحات بھی حسب معمول ہیں۔ لیکن اسی اصلاح سخن کے صفحہ ۴۰ پر اس مصرعہ کی اصلاح کے سلسلہ میں ؎ زباں سے اف نہ کرنا شمع ساں جل جل کے مر جانا۔ مولانا نوح شمع ساں کی ترکیب کو ناپسند فرما چکے ہیں۔ مجھے تعجب ہے کہ اس شعر کی اصلاح میں مولانا کو اپنے اصول کا خیال نہیں رہا۔ اب اصلاح اس طور پر فرمائی ہے

انکے وحشی نے جلے دل سے جو آہیں کھینچیں شمع ساں جلنے لگے خار بیابانوں کے

نوح صاحب نے اپنے مجوزہ قاعدہ کے خلاف ورزی کی ورنہ اصلاح غنیمت ہے۔

اک آہ سرد تپش کے دکھلا جو رنگ دہر افسردگی سی چھائی ہوئی انجمن میں تھی

مولانا آقی فرماتے ہیں "معلوم نہیں افسردگی کیوں چھائی ہوئی تھی - آہ سرد کیوں کھینچی - کیا آہ سرد کھینچنے کے سبب سے افسردگی چھاگئی - آخر کیوں - کچھ سمجھ میں نہیں آیا " اسکے بعد شعر کو سزائے موت (قلمزدگی) دیدی گئی -

مولانا آقی کے اکثر سوالات ہم نے حل کیے ہیں جسکو قارئین کرام ملاحظہ فرما چکے ہیں - اب یہ تبصرہ کا کام ختم ہونے کے قریب ہے اس لیے نامناسب ہوگا اگر باقی صاحب کے شکوک رفع نہ کیے جائیں - مولانا سنیئے - افسردن کے معنی ہیں ٹھٹھر جانا - اور سردی کا اثر ہر چیز پر پڑتا ہے یہاں تک کہ آدمی کے بھی ہاتھ پاؤں ٹھٹھر جاتے ہیں - اس لیے آہ سرد کی وجہ سے انجمن دہر کا افسردہ ہو جانا بڑا لطیف مضمون ہے - اگر ممکن ہو تو سزائے موت (قلمزدگی) کی نظرثانی فرمائیے - ورنہ آپ جانیں اور آپ کے شاگرد جناب شوق -

---

کہتے ہیں واقعی جسے یکسوئی خیال یا دشت نجد شوق کے دیوانہ پن میں تھی

اس شعر پر صرف چھ اساتذۂ گرامی نے اصلاح کی مشق فرمائی ہے - انکے سوا باقی حضرات نے شعر کو پسند فرمایا ہے -

آرزو - حاصل ہے جسکا ہوش وہ یکسوئی خیال یا دشت نجد شوق کے دیوانہ پن میں تھی

آرزو صاحب نے خود اپنی اصلاح کی داد دی ہے لیکن بدقسمتی سے مجھے پسند نہیں آئی -

بیخود موہانی - کیا ذکر اہل ہوش کہ یکرنگی خیال -

مطلب یہ ہو گیا کہ جب شوق کے دیوانہ پن میں یکرنگی خیال موجود ہے تو اہل ہوش میں اسکا ہونا لازمی ہے - شعر بہت پست ہو گیا -

جگر - وحشت جو دشت نجد میں حاصل تھی قیس کو

پہلے مصرعہ کا تقاضا ہے کہ دوسرے مصرعہ میں بجائے 'تھی' کے 'ہے' ہونا چاہیے وحشت ہر دیوانہ پن میں ہوتی ہے - بات کیا ہوئی ؟

مضطر - مجنوں کے جوش خاطر ناشاد کی جھلک -

خاطر ناشاد کے جوش کی جھلک واقعی نئی بات ہے -

نانی - کہتے ہیں اہل دل جسے یکسوئی خیال

مصرعہ یہ بھی اچھا ہے لیکن شوق کے مصرعہ میں زیادہ وسعت ہے -

اطہر صاحب نے صرف دوسرے مصرعہ میں خفیف تصرف فرمایا ہے یعنی (کے) کے بجائے وہ بنا دیا ہے ۔ یادش بخیر شوق ۔ وہ دیوانہ پن میں تھی شوق کا مصرع تو ترمیم کا ضرورت مند نہیں تھا، لیکن جو ترمیم کی گئی ہے وہ کسی طرح بری بھی نہیں ہے۔

شوق صاحب نے اُردو کی غزلوں میں ایک فارسی کی غزل کو بھی شامل فرمادیا ہے ۔ اساتذہ گرامی میں سے اکثر بزرگوں نے اپنی اصلاح کی مقراض سے اس غزل میں بھی قطع و برید فرمائی ہے مصنف اور مصلحین کی جانکاہی و دماغ کاوی کی داد کوئی ایرانی شاعر دے سکتا ہے ۔ اس پر تنقید کرنا میرے نارسا ذہن کی دسترس سے باہر ہے ۔ میں اس ناچیز تبصرہ کو ختم کرتا ہوں ۔ میں نے اساتذۂ عظام کی طبع آزمائی اور ناقدین کی کارفرمائی پر نہایت دیانت اور صداقت سے اظہار رائے کیا ہے ۔ میرے خیال میں جس اُستاد کی اصلاح میں کوئی نقص تھا اُسے ظاہر کیا ہے اور اگر اصلاح قابل قدر تھی تو ستائش سے بھی دریغ نہیں کیا ہے ۔ معبرین و ناقدین کی بھی بیجا تعظیم یا تنقیص نہیں کی گئی ہے ۔ با ایں ہمہ اگر حق و صداقت کی تلخی سے کوئی صاحب بدمزہ ہوں تو میں گناہ گار نہیں ہوں ——

فقیر امیر بدایونی

وارداتِ قلب

کھل جائے ابھی راز تری جلوہ گری کا
پردہ جو اٹھا دوں میں جمالِ نظری کا

وحشت میں نہیں ہوش مجھے جامہ دری کا
دیکھے کوئی انداز مری بے خبری کا

دم بھر میں کیا راز محبت سے خبردار
قائل ہوں بہت آپ کی جادو نظری کا

پھر آج ہے اک لطفِ خلش دل کو میسر
ہر سانس میں اعجاز ہے بادِ سحری کا

اللہ ری تری شوخیِ رفتار کا عالم
انداز ہے کل موجِ نسیمِ سحری کا

جب دیکھیے ہے پیشِ نظر و رُخِ انور
احسان بہت مجھ پہ ہے دردِ جگری کا

آغاز میں آتی ہے نظر سرحدِ کونین
کیا جانیے انجام ہو کیا بے خبری کا

بادِ سحری کے لیے پیغام تھا گل کا
گل کے لیے پیغام تھا بادِ سحری کا

ظاہر میں تو دلشاد ہوں اشعار سے لیکن
چلتا ہے پتہ کچھ مری حرماں نظری کا

آزاد ہے ہر قید سے پروازِ محبت
بیکار جلیل عذر ہے بے بال و پری کا

ٹالسٹائے

روس کی تاریخ جلیل القدر بادشاہوں اور نامور بہادروں کے کارناموں سے لبریز ہے۔ اُنکے حالاتِ زندگی پڑھکر آنکھیں کُھل جاتی ہیں۔ دارا اور جمشید کی شان و شوکت، افلاطون اور سقراط کا فلسفہ، ہرقل اور رستم کی جوانمردی کا اگر دوبارہ تماشہ دیکھنا ہو تو روس کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ تاریخ کس طرح اپنے آپ کو دوہراتی ہے،، اور یہ مقولہ کہاں تک صحیح ہے۔

تاریخ عالم میں ۱۵۔ مارچ ۱۹۱۷ء کا دن انسانی آزادی کی یادگار رہیگا۔ روس کا انقلابِ عظیم اسی روز سے شروع ہوتا ہے۔ اسی دن آزادی کا جھنڈا مملکتِ روس میں بلند کیا گیا۔ لیکن یہ کام ایک دن کا نہ تھا۔ بلکہ یہ نتیجہ تھا سالہا سال کی اُس کوشش کا جسکا مواد عرصۂ دراز سے پک رہا تھا؛ اور آخر کار ایک دن پھوٹ نکلا۔ اس مادّہ کے پیدا کرنے اور رفتہ رفتہ مواد کو پکانے کے ذمہ دار دراصل روس کے زبردست ادیب و انشا پرداز مثل ٹالسٹائے، گورکی، و گوگل وغیرہ کے تھے جنھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ بالشویزم کی پوری پوری تعلیم ملک و قوم کو دے دی تھی۔ شخصی حکومت سے انحراف کا جذبہ، جمہوریت کی خوبیاں، مساوات کی تعلیم تمام روس میں پھیلا دی گئی تھی۔ اور اس نئی روشنی کے پیدا کرنے اور پھیلانے میں سب سے نمایاں حصہ ٹالسٹائے نے لیا۔ یہی نہیں کہ ٹالسٹائے مثل یورپ کے مشہور انشا پردازوں وکٹر ہیگو، روسو، والٹیر، شیکسپیر، گیٹے، مزینی، گریبالڈی وغیرہ کے ایک زبردست صاحب قلم تھا بلکہ روس کا سب سے بڑا ولی اور پیغمبر وقت مانا جاتا ہے۔ اِسکی زندگی اجتماعِ ضدّین کا ایک نمونہ ہے جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوگا۔ ہم اسوقت سرسری طور پر اُسکی ابتدائی زندگی سے لیکر آخر تک کے کچھ حالات مختصراً درج کرتے ہیں۔

اوائل عمر ہی سے اُسکو گھومنے پھرنے اور سیر و شکار کا بیحد شوق تھا اور پڑھنے کی طرف وہ بہت کم توجہ کرتا تھا۔ جب تک اسکول میں رہا بہت معمولی طالب علموں میں اس کا شمار کیا جاتا تھا۔۔۔ بدشوق سمجھا جاتا تھا۔ اسکول سے نکل کر کالج میں پہونچنے تک یہی رنگ رہا۔ یہاں اُسنے علوم مشرقیہ کی طرف زیادہ توجہ کی، مگر جب ان میں بھی اسکا دل نہ لگا تو پھر قانون کا مطالعہ

شروع کر دیا۔ لیکن کب تک۔ اسکی تلون مزاجی نے کچھ دنوں کے بعد قانون بھی چھوڑا دیا۔ اور آخر کار یونیورسٹی کو خیرباد کہہ کے اُس نے کوہ قاف کی راہ لی۔ اور اپنے بھائی کے ہمراہ جو ایک کوسک سپاہی تھا فوج میں بھرتی ہو گیا۔ چونکہ وہ ہمیشہ سے نفس کا بندہ تھا اس لیے خراب صحبت کے اثرات جو ایک سپاہی کی زندگی پر ہو سکتے ہیں اُن کا بہت جلد شکار ہو گیا۔ شراب خواری، قماربازی، وغیرہ کی بھی عادت پڑ گئی۔ جنکو وہ خود بعد میں اپنی کتابوں، ،بائی چائلڈہڑ.................. یوتھ ہڈ اینڈ یوتھ.................. میں بیان کرتا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے

میں اب اپنے گذشتہ واقعات کو یاد کر کے تھرا اُٹھتا ہوں اور اُنکو بیان کرتے ہوئے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب میں سوچتا ہوں کہ میں نے کتنے انسانوں کو جنگ میں قتل کیا۔ دوسروں کو مارنے کے لیے کتنوں سے کشتیاں لڑیں۔ جُوا کھیل کر کتنی رقم اور قدر کی سے برباد کی۔ اپنے کسانوں پر کس کس طرح کے مظالم کیے، اور اُن سے اُنکی وہ حلال کمائی جبراً حاصل کی جسکو اُنھوں نے اپنے جسم کو عرق عرق کر کے زمین سے پیدا کیا تھا۔ نا حشہ عورتوں سے برسوں اُلجھا، اور نہ معلوم کس کسکو دغا..... اور دھوکے دیے..... جھوٹ، قزاقی، ہر قسم کی بدکاری، شراب خواری، طرح طرح کی ایذا رسانی، قتل و غارتگری، اور دنیا بھر کے دیگر جرائم میں سے ایک بھی نہیں چھوڑا جسکا میں مرتکب نہ ہوا ہوں۔ اور میری زندگی کے دس سال یک لخت اس حالت میں گذرے"۔ آج میں جس وقت اپنی زندگی کے سیاہ اوراق کو پلٹ کر دیکھتا ہوں تو دوزخ کی آگ یاد آ جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ یہ خیالات بس دماغ میں ایک بار گذر جاتے ہوں، بلکہ وہ بقیہ زندگی میں زہر ملا نے دیتے ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ عام طور پر لوگ متاسف ہوتے ہیں کہ موت کے بعد اُنکی شخصیت فنا ہو جاتی ہے۔ مگر کس قدر خوش قسمتی کی بات ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ میرے لیے کتنا غمناک ہوتا اگر کہیں مجھکو اس موجودہ زندگی میں وہ شرمناک واقعات یاد آ جاتے جو مجھ سے ماضی میں سرزد ہو چکے ہیں"۔

دس بارہ برس تک ٹالسٹائے کو فوج میں رہنا پڑا۔ اسی اثنا میں ۱۸۵۵ء میں جنگ کریمیہ میں وہ شریک ہوا۔ لیکن فوراً لڑائی کے بعد اُسکی روح پھر ایک بار قالب میں بیتاب ہو گئی اور انسانی ہمدردی و رحم کا جذبہ اُسکی رگوں میں دوڑنے لگا جس نے اُسکو اس لاجواب کتاب کے

تصنیف کرنے پر آمادہ کر دیا جس سے اسکا نام اور شہرت تا قیامت قائم رہے گی۔ یعنی "سواسٹیبول اور دوسری کہانیاں" تیار ہوگئی۔

فوج کو چھوڑ کر ٹالسٹائے سینٹ پیٹرس برگ کو واپس آیا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ روس بھر میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ سیاسی، ملکی، اخلاقی و معاشرتی ہر قسم کی اصلاح کے لیے غل مچ رہا تھا اور پیٹرس برگ ہی ان تمام تحریکات کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ٹالسٹائے نے اس ہنگامہ میں شرکت سے احتراز کیا کیونکہ یہاں جو کچھ ہو رہا تھا اس سے وہی یورپ کی مادیت زور پکڑ رہی تھی جسکی بابت ٹالسٹائے کو ہمیشہ سے اندیشہ تھا کہ اگر مغرب کی تباہی کا باعث کوئی تحریک ہوئی تو وہ یہی اُسکی انتہائی مادیت پرستی جو اسکے باشندوں کی روح کو بالکل فنا کر دے گی۔ اسکے نقطۂ نظر سے روس ایک مشرقی ملک تھا، نہ کہ مغربی، اور اس لیے یہاں جس نوع کی اصلاح کی ضرورت تھی وہ بالکل دوسری ہی تھی بجائے سیاسی اصلاح کے روس کو اسوقت مذہبی، معاشرتی و اقتصادی اصلاحات کی حاجت تھی۔ سینٹ پیٹرس برگ کی فضا کو اپنے ناموافق پاکر ٹالسٹائے نے براعظم یورپ کی سیاحت کا قصد کر دیا ۱۸۵۷ء میں روانہ ہوا۔ تھوڑے ہی دن گھوما تھا کہ یورپ سے متنفر ہوکر واپس آگیا اور ماسکو میں تین سال خاموشی سے گذارے اور یہاں کی دیہاتی زندگی سے بخوبی واقفیت حاصل کرتا رہا۔ ان حالات کو دیکھ کر شوق پیدا ہوا کہ بقیہ یورپ کے ممالک کے کسانوں کی مصیبتوں کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہیے چنانچہ دوبارہ یورپ کا سفر کیا۔ سال بھر بعد واپسی ہوئی تو وہ ایڈیٹر آف پیس یعنی ثالث مقرر کر دیا گیا جس سے اسکو عوام الناس سے ملنے جلنے کا .... اور زائد موقع مل گیا۔

اپنی عمر کے تیسویں سال ۱۸۶۲ء میں اس نے مس سوفیا کے ساتھ عقد کر لیا۔ اور اسکے بعد کے پندرہ برس بالکل خانگی معاملات میں دلچسپی لیکر بسر کیے۔ علمی و ادبی سلسلہ بھی اس زمانہ میں بند رہا۔ قومی خدمت سے بھی کچھ عرصہ کے لیے بے تعلقی اختیار کر لی۔ اعزازی عہدے جو ملک کی خدمت کے لیے پائے تھے اُن سے بھی سبکدوش ہو گیا۔ اور یکسوئی کی غرض سے خاموش زندگی بسر کرنے لگا۔ مگر اس زمانہ میں اما کرینیا .... اور وار اینڈ پیس .... لکھڈالیں۔ اسکی تمام تصانیف میں یہی دو کتابیں چوٹی کی سمجھی جاتی ہیں اور اسکے ملک و قوم کے لٹریچر کا بہترین سرمایہ شمار کی جاتی ہیں۔ پندرہ برس اس طرح گذارنے کے بعد

پھر علمی جدوجہد شروع کردی اور اب یونانی و جرمن زبان سیکھی۔
عمر کی پچاسویں منزل پر پہونچ کر ایک بار پھر مذہبی جوش کو فروغ ہوا۔ ملک میں معاصی ممنوعات، نا انصافی و تکالیف کی کثرت دیکھ کر اسکو مجبوراً اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔ زمانہ زبانِ حال سے اپنی ہلاکت پر نوحہ خواں ہورہا تھا۔ زندگی کی کشمکش، اسکی اصل غایت، اس کے قوانین کی جکڑ بندیاں، یہ سب مسائل غور طلب تھے۔ ان گتھیوں کا سلجھانا کوئی آسان کام نہ تھا اور نہ خود ٹالسٹائے کے ذہن میں اسوقت ان کا کوئی حل موجود تھا۔ لہذا وہ اسی سوچ بچار میں ہر وقت مستغرق رہنے لگا کہ کس طرح سے انسانی زندگی کی ترقی کی صورت نکالی جائے۔ بعد غور و خوض کرتا رہا۔ عیسائیت، اسلام، بدھ و دیگر مذاہب کی کتنی ہی مقدس کتابیں چھان ڈالیں۔ طرح طرح کی ریاضتیں کیں، جسمانی سختیاں برداشت کیں۔ ایک بار کا واقعہ ہے جو فی نفسہ بہت معمولی ہے مگر اس سے اسکی سیرت پر ایک خاص قسم کی روشنی پڑتی ہے، اس لیے بیان کردینا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں وہ مذہبی کتابوں کا مطالعہ کررہا تھا تو اس نے یہ بھی اپنا معمول کرلیا تھا کہ چند گھنٹے کے لیے ایک وزنی لغت ہاتھ پھیلا کر لیے کھڑا رہتا تھا۔ اور اس طرح سے گویا ہر ہر قدم پر اپنے آپ کو جسمانی تکلیف پہونچاتا اور برداشت صعوبت کی مشق کرتا تھا۔ ایک طرف عمل کی یہ شدت تھی، دوسری جانب علم کے حاصل کرنے میں اس نے کوئی کوشش نہیں اٹھا رکھی۔ افلاطون، سقراط اور شوپنہار کا فلسفہ اور انکی اعلیٰ اخلاقی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ چونکہ طبیعت نہایت دشوار پسند واقع ہوئی تھی۔ لہذا ہر چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ کی پوری صحت کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے ملک کے جید علما و فضلا سے لیکر معمولی سے معمولی شخص کی رائے ان مسائل پر دریافت کرتا رہا۔ کوئی مذہبی پیشوا، سیاح، جاتری، زائر اور غیر ملکی سیاح ایسا نہ بچا ہوگا جس سے اس نے اصلاح نہ لی ہو، اور اپنے اطمینان کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ غرضکہ دنیا بھر کی طرف وہ صلاح و مشورہ کی غرض سے رجوع کرتا رہا مگر کسی طرح تسلی و تشفی نہ ہوئی تو اس نے پھر غور و خوض شروع کردیا۔ نفس کشی اور چلہ کشی کی مشق کرنے لگا۔ خود ہی ممتحن بنتا اور اپنا امتحان لیتا اور سقراط کی طرح سے .... "پہچان اپنے آپ کو" کا درس دینے لگا۔
آخرالامر نجات کی صورت اس سادہ فلسفہ میں نظر آئی جو فری مسکن۔
پروگرام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جسکی جستجو میں وہ ابتک حیران و سرگردان تھا۔ چنانچہ دنیا کی دولت، قوت، عیش و عشرت کو جسکا کبھی وہ غلام تھا خیرباد کہہ کر غربت، عجز، ایثار د

قربانی کو اپنا اصول زندگی قرار دیا اور خدمت خلق اللہ کو اپنا نصب العین بنایا۔ دنیوی چیزوں سے بیرخی اختیار کی۔ اور جس دن یہ تغیر ظہور پذیر ہوا معاملات دنیوی سے بدرجہ اتم کنارہ کشی کرلی، حتیٰ کہ اپنی جائداد کا انتظام تک چھوڑ دیا۔ روپیہ پیسہ سے بے پرواہ ہوگیا۔ کھانے پینے کا مطلق ہوش نہ رہتا، جو ملجاتا موٹا جھوٹا اناج تک کھا لیتا۔ اور ۱۸۸۵ء کے قریب بالکل بھگت ہوگیا۔ گوشت کا استعمال چھوڑ دیا۔ شکار وغیرہ کی تمام دلچسپیاں، سگریٹ اور شراب کے تمام شوق سرے سے ترک کردیے۔ اور یہ طے کرلیا کہ باقیماندہ عمر دہقانوں کے مانند بسر کرے گا۔ کھانا پینا ملبوس اور ساری بود وماند کسانوں ہی کا سا ہوگیا۔ رفتہ رفتہ جب غلو میں اور اضافہ ہوا تو اپنی موروثی جائداد سے محروم الارث ہونا چاہتا تھا اور اپنی تصانیف کے حقوق بھی چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ مگر بالآخر ہوشمند زوجہ کے اصرار کرنے پر اُسکے نام منتقل کردیا۔ اور اپنے سخت منطقی کلیہ پر کہ "جائداد کا رکھنا قتل کرنے کے برابر ہے" ایک حد تک عمل کرنے سے باز رہا۔

اسی دوران میں کلیسا کی متشکک زندگی اور مسیحیت کی اخلاقی حالت کو روز بروز تنزل پذیر دیکھ کر اصلاح کی نیت سے اختلافات کرنا شروع کردیے۔ کٹر اور متعصب پادریوں اور مذہبی پیشواؤں پر بحیثیت ایک ایماندار خدا پرست عیسائی کے سب تعصبی کے ساتھ اعتراضات کیے چونکہ مذہبی رنگ بیحد غالب تھا اس لیے سختی سے کتب اناجیل کی پابندی کرتا تھا اور مُصر رہتا تھا کہ بجائے لغو رسوم کے خانقاہوں　　　　اور را ہبہ گا ہو ں
میں احکاماتِ الٰہی پر لفظ بلفظ عمل کیا جائے۔ پادریوں کے ملاطب اور دیگر فضولیات کو ترک کرنے پر شدت کی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ہاک کی ارتھوڈاکس پارٹی (مذہب مروجہ پر مضبوطی سے قائم رہنے والی جماعت) نے سنہ ۱۹۰۱ء میں روسی کلیسا سے اس کا تعلق منقطع کرادیا۔ اب وہ بالکل آزاد ہوگیا اور اپنا مذہب و فلسفہ لیکر از سرنو دنیا میں نمودار ہوا اور ایک عالم کو اپنا مرید بلکہ اپنی امت بناکر پیغمبر روس کے خطاب سے ملقب ہوا۔

اب تک جو کچھ کاونٹ لیو ٹالسٹائے نے کیا وہ معاشرتی و مذہبی اصلاح کے تحت میں زیادہ تر آتا ہے۔ اس طرح سے گویا اس نے انقلاب روس کی بنیاد ڈالی۔ او قبل اسکے کہ سیاسی ہیجان پیدا ہو معاشرتی، مذہبی و اخلاقی اصلاح کرکے روس کے دہقانوں اور زراعت پیشہ لوگوں کو بیدار کردیا جو چھ چھ مہینے اندھیری راتوں میں بےخبر سونے کے عادی تھے، غلامی کے طوق پہنے، زمینداروں اور سرمایہ داروں کے ناجائز مظالم و تشدد برداشت کررہے تھے، زبان

اُف نہ کر سکتے تھے اور دل ہی دل میں شہنشاہِ وقت اور حکومت کو گالیاں دے رہے تھے انکو انکی قوت کا احساس دلا دیا۔ بتا دیا کہ روس جو ایک زراعتی ملک ہے اسکی حکومت کا انحصار محض زراعت پیشہ لوگوں پر ہے۔ خود زار ( ) روس حقیقت میں اسی غریب پرور طبقہ کا محتاج ہے جو اپنی محنت کا ۱/۴ حصہ بھی نہیں پاتے حالانکہ وہ اس سے کہیں زیادہ کے مستحق ہوتے ہیں۔ ملک کی فوج، ملک کے ہتھیار، ملک کا خزانہ اور ملک کی ساکھ جو کچھ ہے اُسکے مرادف اصلی وہی لوگ ہیں اور سب کچھ اُنھیں کے دم سے ہے بشرطیکہ وہ اس پر کامل عقیدہ کے ساتھ یقین رکھیں۔ (کاش ہندوستان میں بھی آج کوئی اس عقیدہ کو اتنا ہی پختہ کرا دیتا تو ہماری قوم بھی اتنی ہی جلد آزادی کا دم بھرنے لگتی اور جمہوریت ہندوستان کا خواب ہمارے کسان بھی دیکھنے لگتے جس طرح آج بالشویک کسان خواب سے ترقی کرکے ایک حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں) ایسی مستحکم بنیاد پر جس انقلاب کی عمارت کھڑی کی گئی اُسکی کامیابی یقینی تھی۔ ۱۹۰۵ء میں بالاعلان ٹالسٹائے نے خود مختار شخصی حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اُسکی شمشیر برہنہ تحریروں نے گورنمنٹ کے ہر پہلو کو مجروح کر دیا۔ تمام سچے واقعات عریاں ہو کر منظر عام پر آ گئے۔ کاکیشس (کوہ قاف) میں زار کے مظالم اور "دوکھابوروں" کے قتل عام کے افسانے واقعات کی حد تک پایۂ ثبوت کو پہونچا دیے گئے۔

قومی سپاہ کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے اس نے اپنی ساری بچی کھچی پونجی وقف کر دی۔ یہی نہیں جب اس سے بھی کفالت نہ ہو سکی تو اپنی "بہترین تصنیف" "ریسرکشن" کا حق تالیف فروخت کر ڈالا۔ مختصر یہ کہ دامے، درمے، قدمے، سخنے، ہر صورت سے اس نے ملک و قوم کی خدمت کی اور حقیقی معنوں میں فنا فی القوم و ملت ہو گیا۔ سنہ ۱۹۱۰ء تک اسی جد و جہد میں مصروف رہا۔ لیکن اسی سال ایک دن یہ خبر تمام روس میں پھیل گئی کہ ولی اللہ اور پیغمبرِ [illegible] روپوش ہو گیا۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ جنوب کی جانب کسی گاؤں کو ہجرت کرکے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ بعد نقاہت و کمزوری بڑھتی بیماریوں نے آ دبایا اور بہت جلد بمقام اسٹاپوو ۲۰- نومبر سنہ ۱۹۱۰ء کو [illegible] کا ولی کامل صبح چھ بجے راہی ملک بقا ہوا۔

مظہر اطہر علوی بی اے (علیگ)

اسیر الفت

ٹالسٹائے کا روزنامچہ

ماسکو۔۲۰۔اگست ۱۸۶۲ء | دو دن سے میں نے کچھ نہیں کھایا۔ دانت کے درد سے سخت بے چین رہا، رات ورس سے ملاقات ہوئی۔ عجیب لڑکی ہے۔ بچوں کی طرح بھولی۔ بالکل ایک بچی۔ لیکن اُس نے میرے دل میں ایک خلش پیدا کر دی۔ جو بڑھ رہی ہے۔ اگر ایک مستقل مرکزِ محبت مل جائے تو۔ زار کو ایک خط لکھا۔ میں اُسکے خاندان سے مانوس ہو گیا۔ اور میں اپنے آپ سے خوفزدہ ہوں۔ کیا یہ خواہش محبت ہے۔ یا محبت۔

ماسکو۔۱۰۔ستمبر ۱۸۶۲ء | میں نے میدانِ محبت میں قدم رکھ دیا۔ اگر میری مایوسیوں کا یہی عالم ہے تو میں اپنے گولی مار لوں گا۔ آج شام کا وقت رُون ورس کے ساتھ گذرا۔ کس قدر دلربا لڑکی ہے۔ اور میں کتنا بدصورت ہوں۔ مجھے محبت کی ابتدا ہی میں احتیاط کرنی چاہیے تھی۔ اب تو جو قدم اُٹھ چکا، پھیرا نہیں جا سکتا۔ خواہ میں حبشی کی طرح بدرُو ہی کیوں نہ ہوں۔ محبت مجھ کو حسین بنا دے گی۔

اظہارِ محبت کے بہت سے موقعے ملے، لیکن میں نے سب کھو دیے۔ میں اظہارِ الفت سے شرماتا ہوں۔ میرا جذبۂ محبت تو اس کا خواہاں ہے کہ میں سب کے سامنے اعترافِ محبت کر لوں اے خدا۔ میری مدد کر!

۲۷۔ستمبر ۱۸۶۲ء | لیجیے۔ میں خود اپنے آپ سے ناواقف تھا۔ میری تمام غلطیاں میرے سامنے ہیں۔

میری مجنونانہ محبت کی وہی حالت ہے۔ نہ کچھ کم نہ زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔

آج کا منظر بھی عجیب تھا۔

میں اس بے رُخی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ہمارے باہمی تعلقات ویسے ہی ہونے چاہئیں جو عام طور پر ہوا کرتے ہیں۔

میں نے اُس سے صفائی سے کہہ دیا کہ اُس نے میرے دل کو صدمہ پہنچایا۔ ...

کہتے ہوئے رو پڑا۔ وہ کس قدر دلکش ہے۔
میں اُس سے اور بھی زیادہ محبت کرنے لگا۔ کیا ہے! اگر اُس میں خلوص کی کمی ہے۔
۱۵۔ اکتوبر | میں اس عرصہ میں بہت مشغول رہا۔ میری مشغولیت بھی عجیب تھی۔ یہ محبت تو اب جگر دوز ہوتی جاتی ہے۔ اسی کو ابدی محبت کہتے ہیں۔ میرا شیرازۂ حیات پریشاں ہو رہا ہے۔ میں تو اب اُس سے بھی بے تعلق ہونے لگا۔
میں پھر کارآمد بننے کی کوشش کروں گا۔

'راز و نیاز'

۸۔ جنوری ۱۸۶۳ء | اُس نے میرے طرز لباس پر نکتہ چینی کی۔ میں بھی اسکا معترف ہوں۔ وہ میرے لباس کو ناپسند کرتی ہے۔
چند بوسے، چند آنسو، چند توجیہات۔ مجھے تو یہ باتیں کبھی مطمئن نہیں کرتیں۔ بالخصوص بوسے وہ عموماً اندھے ہوتے ہیں۔ ....
کھانے کے وقت چند اور آنسو۔ تھوڑی ہیجان آمیز گفتگو۔
میری محبت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ میں اُس سے بد دل نہیں ہوتا۔ اُس کی بے التفاتیوں سے بیزار نہیں ہوتا۔ اُس کا طرز عمل کتنا سخت ہے۔ کتنا دلشکن ہے۔ اُس بدخو سے نباہنا آسان نہیں۔
آج گھر میں کوئی سلسلۂ گفتگو نہیں نکلا۔ اُسکے ساتھ زندگی بسر کرنی واقعی مشکل ہے۔ لیکن میں اُس سے شکوہ نہیں کرسکتا۔ میں کتنا غیر متیقن ہوں۔ وہ ترکِ محبت کو دکھی کر دے۔

'عالمِ بیخودی'

۱۸۔ جون ۱۸۶۳ء | میں اب کہاں ہوں۔ جو کبھی خود پسند، خودنما اور خوددار تھا، اب کس قدر حقیر ہو گیا۔ میں قابلِ نفرت ہوں۔ ساری مصیبت کا باعث یہ ہے کہ میں نے اُس عورت سے شادی بھی کرلی جس سے میں محبت کرتا تھا۔ اس نے مجھے خوار کر دیا۔
اس روزنامچہ میں جو کچھ میں لکھ رہا ہوں سب غلط ہے۔ وہ اسوقت میرے کندھوں پر جھکی ہوئی ہے اور میری تحریر کو پڑھ رہی ہے۔ اُس نے مجھے صداقت کے راستے سے ہٹا دیا۔ میں متزلزل ہو رہا ہوں

میرے خیالات میں انقلاب ہو رہا ہے - میری اخلاقی قوت پھر تازہ ہو رہی ہے - اُسکی زیادہ باتیں کرنے کی عادت اور توجہ مائل کرنے کی کوشش ہی میری بزدلی کا باعث ہو جاتی ہے شب کی مجنونانہ حرکتیں بھی اس تبدیلی خیال کا باعث ہیں -

رشک و رقابت کے جذبات، میری بزدلی، ذلتِ نفس، ۹ ماہ میں نے ان احساسات کے ساتھ گزار دیئے -

کس قدر عجیب خیال ہے میں ایک جواری اور شرابی ہوں - میں خانگی زندگی میں ایک ناکارہ انسان کی طرح پھنس گیا -

میری زندگی کے یہ نو ماہ بدترین طور پر صرف ہوئے - جو بہترین اشغال میں بھی صرف ہو سکتے تھے -

---

تیسری بار پھر لکھنے بیٹھا ہوں - کس قدر ہیبت ناک، کس قدر خوفناک خیال ہے - اپنی زندگی کی حقیقی لطافتوں کو مادی مسرتوں کی نذر کر دینا - بیوی، بچے، اور فارغ البالی، الٰہی - مجھ پر رحم کر

اُس کا اخلاق دن بدن پست ہو رہا ہے - میں اُسکے منہ سے اپنے عزیز دوستوں کے متعلق نہایت بُرے الفاظ سنتا ہوں اور کچھ نہیں کہہ سکتا -

نرم و نازک الفاظ کے پردہ میں میری طرف سے ایک نفرت اور دلی بیزاری چھپی ہوئی ہے - زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے -

اگر اُسکے متعلق یہ تمام خیالات محض غلط فہمیاں ہیں، تو کتنی خوفناک غلط فہمیاں ہیں -

اہل و عیال کے لیے زندگی کی تمام شعریت، بنی نوع انسان کی بہتری کے خیالات سب فنا کر دیے جائیں

محض اس لیے کہ اُنکے بجائے آتشدان کی راحتیں میسر ہیں - تمام عالم سے قطع تعلقی اور اپنے کنبہ پر تمام توجہات کو محدود کر دینا - گھر کی اندرونی کاوشوں اور ذمہ داریوں کو سر لینا کیا عقلمندی ہے -

بچوں کی نگہداشت، کھانے پکانے کے متعلق چند کتابیں [illegible] پڑھنے کے [illegible]

زندگی میں عظمت پیدا کرتی ہے۔

بغیر محبت اور وقار آمیز خودداری کے۔ ہاں صرف ایک نرمی اور اختلاط پر قناعت کرلینا۔ میں اب بھی اُسکو پورے طور پر نہ سمجھ سکا۔ میں اب خاموش ہو جاؤں بے نفس ہو جاؤں، یہ رُخ بہت سخت ہے۔

میں تو اس تمام روداد محبت کو حقارت و نفرت سے دیکھتا ہوں۔ اسکے جوابات کیا ہونگے۔ ممکن ہے وہ اپنے الزامات کو صاف کرے اور تعلقات میں خوشگواری پیدا ہو جائے۔

۶۔ اکتوبر | رفت و گذشت۔ پچھلے واقعات فراموش ہوگئے سب خیالات صحیح نہ تھے۔

میں اب اُسکے ساتھ مطمئن ہوں لیکن میں اپنی ذات سے مطمئن نہیں۔

مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں ایک پہاڑی سے گرا جا رہا ہوں اور رُکنے کی بھی قوت نہیں۔

میں ابدیت کا متلاشی ہوں، اور وہ مجھے ملیگی۔ فنون اور علوم کی زندگی یا کنبہ داری اور اہل و عیال کی پرورش، اور اُسکا احصل کاہلی کر دی۔

میں نے دوسری چیز کو انتخاب کرلیا۔ اور یہ میری دشمن ہوگئی۔

محمود احسن صدیقی بی۔ اے (علیگ)

نظم خیالات

ہمیں کچھ کہ نہیں آتا ہے باتیں ہم بناتے ہیں
جنھیں کرنا کچھ آتا ہے وہ باتیں کم بناتے ہیں
قیامت دیکھیے کس کس پہ آتی ہے زمانہ میں
سُنا ہے آجکل وہ گھر میں بیٹھے بم بناتے ہیں

میر صاحب بناتے ہیں جوتے
حال اُنکا بہت خراب ہوا
پہلے سیّد تھے اب ہوئے موچی
کیا زمانہ کا انقلاب ہوا

قبالی جب ہوئے مشائب میں
کھو دیا دل نے جب سکون و قرار
ہم کو نسرآں نے مشورہ یہ دیا
سمجھو اپنا لعشق والا بکار

ابو عصمہ

ایک فقیر

(ترجمہ از ترجنیف)

میں سڑک پر جا رہا تھا .... ایک ضعیف العمر نحیف الجثہ فقیر نے مجھے یکایک روک لیا۔ میں نے دیکھا کہ اُسکے چہرے پر پریشانی تھی، اُسکی آنکھیں آنسوؤں سے پُر تھیں۔ اُسکے لبوں پر نیلا پن تھا، اُسکے جسم پر پھٹے پُرانے کپڑے تھے اور اُسکے زخموں سے ایک قسم کی سڑاہند نکل رہی تھی ....

"آہ مفلسی تیرا بُرا ہو۔ تو نے اس غریب بیکس کو کیسا ستایا اور پریشان کر رکھا ہے" (میرے دل میں یہ خیالات پیدا ہو رہے تھے) اُس نے اپنا ناتوان اور گرد آلود ہاتھ میری جانب پھیلا دیا۔ اور نہایت ہی دردناک آواز میں مجھ سے سوال کیا۔

میں نے اپنی جیبیں ڈھونڈھنا شروع کیں۔ اپنی تمام جیبوں میں ہاتھ ڈالا .... نہ جیب میں بٹوا تھا، نہ گھڑی۔ حتیٰ کہ دستی رومال بھی اُس میں نہ تھا۔ ..... آہ میرے پاس کچھ نہ نکلا۔ وہ بڈھا فقیر میرے سامنے خاموش کھڑا ہے۔ اسکا دستِ سوال ناتوانی اور ضعفِ پیری کے باعث تھرتھرا رہا ہے۔

میں پریشان، سراسیمہ، مجسمۂ ندامت بنا ہوا تھوڑی دیر تک اسکے سامنے کھڑا رہا آخر میں نے اُسکا مرتعش ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

"بھائی خفا نہ ہونا میرے پاس اسوقت کچھ بھی نہیں ہے"

وہ فقیر بہت دیر تک عالم تحیر میں اپنی سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اُسکے نیلے ہونٹوں پر ایک طرح کی مسکراہٹ کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے پھر میرے ہاتھ کو پکڑ لیا اور کہا "میرے عزیز بھائی۔ کچھ مضائقہ نہیں۔ تمہاری اس ہمدردی کا شکریہ۔ یہ بھی گویا خیرات ہے۔ مجھے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ میرے بھائی نے مجھے بہت ہی عمدہ تحفہ دیا ہے"

کلیم الدین علوی

ماتمِ شاد

کیا یہ سچ ہے اُٹھ گئے محفلِ جہاں سے شاد؟ — کیا نظر نہ آئے گی پھر جبینِ اوستاد؟
رحمتِ اللہ باد در لحد روئے او! — پایہ گاہِ مغفرت متکائے شاد باد!
کیوں نہ روئیں زار زار تجھ کو فن کے جاں نثار — شب تھی تیری عمر کی۔ پر سخن کی بامداد
تیری گلفشانیوں سے وطن تھا گلکدہ — معنی آفرینیوں پر کمال کا تھا صاد
تیرا ہر قیاس و وہم تھا قبولِ عقل کو — مانتا تھا ہر سلیم ذوق تیرا اجتہاد
تیرے عفو و لطف سے گردن عدو بھی خم — تیرے آگے رام تھے، لاکھ دل میں ہو عناد
اب مشاعروں میں وہ وضعداریاں کہاں — مسکرانا اُنکی داد، خامشی ہیں انتقاد
کس سے جا کے حل کریں ہم نکاتِ شاعری؟ — کس کے قول سے کریں بحثِ فن میں استناد؟

شاہدِ سخن ہے آج اشکبار و دلفگار — ہیں یتیم ہرزہ گرد آج تیرے طبعزاد
گوہرِ یتیم کے ہونگے وارث اب بہت — پٹنہ میں گلی گلی اب پھریں گے اوستاد
تیرے ساتھ ہائے ہائے لُٹ چلی یہ جنس بھی — تیرے رنجِ مرگ پر یہ قلق ہے مستزاد
کچھ تو چھپتے اپنے اشک تیرے یادگار سے — تو نے بزمِ دہر کو گر کہی تھی خیر باد
محفلِ سخن مگر غم ترا نہ بھولے گی — لب پہ ہوگا تیرا ذکر، دل میں ہوگی تیری یاد

تھے حریفِ چشم و گوش، اک قلم رفیق تھا — یا دماغ تھا۔ اگر تھا کسی پہ اعتماد
پیرکس مپرس و زار، نورِ چشم ہیچکار — رنجِ جورِ روزگار۔ پھر مرض کا اشتداد

دل نے دی تسلی یوں موت کا بتا کے سن
چھوٹے قیدِ عمر سے شاد جا بسا وطن

۱۳۳۵ھ

مُسلم عظیم آبادی

دوراہہ

نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے   عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لیے

کل حضرت ذوقؔ کے دیوان کا مطالعہ کر رہا تھا، ناگہاں اس شعر پر نظر پڑی ؎ نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے + عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لیے - اس شعر میں خدا جانے کیا کشش تھی کہ پڑھتے ہی طبیعت بےچین ہو گئی - دل نے کہا آخر وہ کیا چیز ہے جس میں حضرت موسیٰ کے عصا کے سے اعجاز ہیں - اور میں دریائے فکر میں غلطاں ہو گیا - اسی دُھن میں دیوان بند کر کے الماری میں رکھا اور چادر اوڑھ کر لیٹ گیا تو طرح طرح کے خیالات نے آکر پریشان کیا - ایک خیال سوال کرتا کہ "راستی کیا شے ہے، کون سے خطہ میں ملتی ہے؟" دوسرا خیال جواب دیتا تھا کہ "دُنیا کے ہر گوشہ میں ہر شخص کے پاس موجود ہے مگر کسی خاص دشمن سے زبان ہر شکست کھائی ہے اور شرم سے اپنے منہ پر نقاب ڈالے رہتی ہے" - ایک اور خیال سنجیدگی سے بولا "راستی ایک صفت ہے جو بنی نوع انسان کے اقوال و افعال کو موصوف کر کے روشن کرتی ہے اور اُسکو ہزاروں بلاؤں سے نجات دلاتی ہے" - ایک خیال اور آیا اور کہنے لگا کہ "ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے، راستی کو بھی بغیر اسکی ضد کے پہچاننا ممکن نہیں" خیالات اسی قیل و قال میں مصروف تھے مگر کوئی کسی خاص نتیجہ پر نہیں پہونچتا تھا - میں بھی انکے ساتھ اسی اُدھیڑبن میں لگا رہا، یہاں تک کہ نیند آگئی -

خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں گھر سے نکلا اور آنِ واحد میں ایک ایسے پُرفضا میدان میں جا پہونچا جسکی ابتدا اور انتہا سوائے خدا کے اور کسی کو معلوم نہیں - میں عالم تنہائی میں آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ کچھ فاصلہ پر ایک سڑک کے آثار نمودار ہوئے، اور اس پر جہاں تک نظر کام کرتی تھی برابر آدمیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی - میں اس بھید کو معلوم کرنے کے لیے آگے بڑھا - جب قریب پہونچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہزاروں آدمی ایک ہی سمت میں چلے جاتے ہیں اور کچھ ایسی دُھن لگی ہے کہ کوئی کسی کی طرف مخاطب نہیں ہوتا - اپنے اپنے خیالات میں مست قدم اُٹھاتے ہوئے چلے جاتے ہیں - "آخر یہ کہاں جا رہے ہیں اور ایسی کیا کشش ہے جو انھیں اپنی طرف کھینچے لیے جاتی ہے؟" اس خیال سے میں نے آگے بڑھا کہ جاؤں اور

......کسی سے دریافت کروں - ایک شریف صورت بزرگ کو مخاطب کرکے پوچھا جناب آپ کہاں جاتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ "بھئی دُنیا جاتی تھی ہم بھی ساتھ ہولیے" یہ کہکر آگے بڑھ گئے - دوسرے سے دریافت کیا مگر یہی جواب ملا، تیسرے سے سوال کیا مگر جواب مفقود تھا - آخر تنگ آکر میں بھی اُنھیں میں شامل ہوگیا اور اُسی سمت کو روانہ ہوا -

اس سڑک کے دونوں جانب کچھ دُور تک تو سبزہ زار رہا - قریب قریب صاف و شفاف پانی کے چشمے ملے - چھوٹی چھوٹی سبزہ سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں پر سر فلک درخت اپنی بہار دکھا رہے تھے - آسمان پہ ابر چھایا ہوا تھا اور کبھی کبھی ترشح بھی ہو جاتا تھا - مگر یہ مرغزار جلد ہی ختم ہوا اور ایک دشت پُرخار آیا جس میں حد نگاہ تک کہیں سبزہ کا نام نہ تھا - صحرائی جانور خورد و نوش کی تلاش میں کہیں ایسے گئے کہ اپنا نام و نشان تک پیچھے نہ چھوڑا - سورج کی تمازت سے ایک درخت بھی اس قابل نہ رہا تھا کہ اُسکے سایہ میں ذرا دم لے لیں - بادِ سموم کے جھونکے منہ جھلسے دیتے تھے - تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ مارے پیاس کے سب بیچین ہوگئے اور دھوپ کی تیزی سے پناہ مانگنے لگے -

کچھ آگے بڑھ کر سڑک کی دو شاخیں ہوگئیں - ایک سڑک دائیں طرف اور دوسری بائیں سمت میں جاتی تھی - جب سہ راہہ پہ پہونچے تو سب کو یہ تشویش ہوئی کہ کونسی سڑک اختیار کرنی چاہیے - وہاں ایک راہنما بھی نصب تھا - جس پہ دائیں جانب لکھا ہوا تھا "راستی موجب رضائے خدا است" اور بائیں طرف یہ کندہ تھا "گلستانِ کذب" - گلستاں کا لفظ پڑھتے ہی ہزاروں کے مردہ جسموں میں جان آگئی اور خشک اور پژمردہ لبوں پہ مسکراہٹ نمودار ہوئی - اور جب اُنھوں نے اُدھر جانے کا قصد کیا تو قریب ہی بہت سے درخت دکھائی دیے اور جگہ جگہ پانی کے چشمے نظر آئے - یہ دیکھتے ہی بیچارے تشنہ لب صبر نہ کرسکے، اور گلستانِ کذب کی سڑک پر لمبے لمبے ڈگ مارتے ہوئے روانہ ہوئے -

ان میں بہت سے صابر بھی تھے وہ وہیں کھڑے ہوئے سوچتے رہے کہ کدھر جائیں - ایک طرف "خدا کی رضا" تھی دوسری طرف کذب کا باغ - بہت سوچ بچار کے بعد سب نے یہی فیصلہ کیا کہ بھوک اور پیاس کی تو عارضی تکلیف ہے اسکی پرواہ نہیں کرنا چاہیے - خدا کی رضا جوئی مقدم ہے - بس یہ خیال کرکے اُنھوں نے داہنی سمت کا رُخ کیا - میں بھی سب سے پیچھے حیران و پریشان کھڑا تھا - جب سب چلے گئے اور میں تنہا رہ گیا تو دل کی بیچینی اور بھی

بڑھی - اتنے میں ایک بزرگ نورانی صورت سبز پوش میرے پاس آئے اور میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کے فرمایا "تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے عرض کیا کہ "جناب میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ سب کہاں گئے اور انکا مطلب کیا ہے"۔ انھوں نے کہا کہ "چل تجھے بھی سیر کرا لاؤں - پہلے گلستان کذب کی سیر کر لے پھر صداقت خاتون کے محل کو بھی دیکھ لیجیو - مگر میرے کہنے پر عمل کرنا ہوگا ورنہ کہیں ایسا دھوکا کھائے گا کہ عمر بھر پچھتائے گا"۔

یہ کہکر اُس رہنماے کامل نے میرا ہاتھ پکڑا اور گلستان کذب کی سمت لیچلا - کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک پر دورویہ سایہ دار درخت لگے ہیں - انکے بیچوں بیچ ایک نہر جا رہی ہے جسکا پانی آئینہ سے زیادہ صاف تھا - اشجار پھلوں سے لدے ہوے ہیں اور قسم قسم کے جانور اُن کی ڈالیوں پر بیٹھے اپنے راگ بیفکری سے الاپ رہے ہیں - انواع و اقسام کے پھول اپنی بھینی بھینی خوشبو سے مست کیے دیتے ہیں - نہر کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر نشستگاہیں بنی ہیں اور اُنپر خوبصورت خوبصورت پریاں زرق برق پوشاک پہنے بیٹھی ہیں - بعض نہر کے کنارے زمین پر بیٹھی آپس میں چھینٹے اُڑا رہی ہیں - یہ سماں دیکھ کر پیاس بجھ گئی تکان بالکل جاتا رہا، چہرہ پر راہ کی افسردگی کا نام نہ رہا - بدن بالکل ہلکا ہو گیا تاہم دل خوش نہ تھا - پیاس کی وہ شدت، صحرا کے وہ خوفناک کانٹے یاد آ آ کر دل کی آنکھوں کو ہیبتناک صورتیں دکھا رہے تھے - میں نے کہا "اے رہنماے کامل یہ کیا اسرار ہے - یہ تو بہار ہے مگر دل ہے کہ بیزار ہے"۔ اُس نے جواب دیا "ہاں سچ کہتے ہو یہاں سے کذب کا باغ بالکل قریب ہے - ابھی دیکھا ہی کیا ہے - جب باغ میں پہونچوگے اور بھی حیران ہوگے"۔

غرض اسی طور سیر کرتے چلے جاتے تھے کہ یکایک ایک عظیم الشان عمارت نمودار ہوئی جسکی چمک دمک نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا - جب قریب پہونچے تو دیکھا کہ تمام دیواریں خالص سونے کی بنی ہوئی ہیں اور اُس پر جگہ جگہ جواہرات کی پچی کاری اس آب و تاب سے چمک رہی ہے کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی اور اُسکے سر بفلاک دروازہ پر یہ کتبہ زائرین کو اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے "گلستانِ کذب"۔

میں نے بہ شوق تمام دروازے میں قدم رکھا اور جلدی جلدی چلنا شروع کیا - ایک بوڑھا شخص لپکا ہوا آیا اور کہا کہ داخلہ کا پاس بھی لے لیا ہے؟ میں نے رہنما سے دریافت کیا کہ حضرت یہ کون ہے اور کیا کہتا ہے؟ فرمایا "یہ اس باغ کا داروغہ ہے جو شخص اس باغ

داخل ہونا چاہتا ہے وہ پہلے داروغہ سے مل کر پاس حاصل کرتا ہے۔ یہ پاس اسکے قول و فعل کا گواہ ہوتا ہے"۔ غرض میں بھی اُسکے پاس گیا۔ اُس نے مجھے ایک پرچہ دیا جس پر بار بار "واللہ" اور بہت سی مختلف قسم کی قسمیں لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے وہ پاس لیا اور باغ میں داخل ہوا (مجھے تو اس پاس سے ایسی نفرت آئی کہ وہیں ایک جھاڑی میں پھینکدیا۔ رہنما نے بھی کہا "اچھا ہوا جو پھینک دیا")

باغ میں کیا داخل ہوا گویا جنت میں پہونچ گیا۔ جوانان چمن وہ خوبصورت زیور پہنے تھے کہ نظر اُدھر جاتے ہی فریفتہ ہوگئی۔ وہاں سے ہٹی تو تختۂ گل کی ہو رہی۔ برابر برابر نہروں میں پانی کا بہنا، عنادل کا جوش مسرت سے گانا، غنچہ کا مسکرانا، پپیہے کا کوکو کی صدا لگانا، نرگس کا منہ تکنا، لالہ کا آتش بازی کرنا، فواروں سے پانی کا اُچھلنا، کس کس کی تعریف کیجائے قلم میں اتنی طاقت نہیں کہ بہار کے اس منظر کا ایک شمہ بھی رقم کرسکے۔ ایک ایک چیز کو دیکھتا تھا اور خوشی میں پھولا نہ سماتا تھا۔ سامنے ایک پھول نظر آیا، دل نہ مانا۔ فوراً بڑھا اور توڑ لیا۔ دیکھتا ہوں تو کاغذ کا، سونگھتا ہوں تو بو نہیں۔ دوسرا توڑا وہ بھی ایسا ہی۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ آخر حیران ہوکر رہنما سے پوچھا۔ کہا "چلے چلو سب کھل جائیگا"۔ یہ کیفیت دیکھکر طبیعت پژمردہ ہوگئی دل بجھ گیا ہائے یہ بہار بالکل مصنوعی ہے۔ کاش جو کچھ میں دیکھتا ہوں اصلی ہوتا!

یہ مصنوعی اور ناریخی بہار دیکھتے ہوے آگے بڑھے یہاں تک کہ ایک عالیشان بارہ دری نظر آئی۔ دیکھا تو وہاں ایک بھیڑ لگی ہوئی ہے مگر کبھی داخلہ کا دروازہ نہیں کھلا تھا۔ میرے رہنما نے کہا چلو اندر کی بھی سیر کرلیں۔ چنانچہ ہم ایک خفیہ راستہ سے اندر پہونچے اور ایک گوشہ میں پوشیدہ کھڑے ہوکر تماشہ دیکھنے لگے۔

کمرہ بہت بڑا اور سجا ہوا تھا۔ بیچ میں ایک مرصع تخت طاؤس پر ملکہ کذب زمانی لباس شاہانہ پہنے منہ پر نقاب ڈالے نہایت آن بان سے جلوہ گر تھی۔ تاج میں بجاے جواہرات کے بجلی کے بلب ٹکے تھے جسکی دھیمی دھیمی روشنی نے کمرے کو روشن کردیا تھا۔ تخت کے سامنے دو رویہ کرسیوں پر دس شہزادیاں لباس فاخرہ پہنے اور منہ پر نقاب ڈالے بیٹھی تھیں قیاس یہ کہتا تھا کہ شاید ملکہ کی بیٹیاں یا کم از کم قریبی رشتہ دار ہیں۔ انکے بعد کرسیوں پر تین خاتونیں اور بیٹھی تھیں ان میں سے ایک کا نام عیب پوش خاتون، دوسری کا شیخی خور زمانی، اور

تیسری کا نام خوشامد بانو تھا۔ کمرے کے دو دروازے تھے ایک اندر داخل ہونے کا دوسرا باہر آنے کا۔ باہر آنے والے دروازہ پہ ایک چوبدار کھڑا تھا جسکا نام بے شرم زنگی تھا اور اسکے سامنے چھوٹی بڑی پوٹلیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

اتنے میں شایقین کی آمد شروع ہوئی۔ پہلے ایک گروہ آیا۔ اس میں بچے، جوان، بوڑھے، عورتیں، غرض سبھی تھے۔ آتے ہی ملکۂ کذب کے قدموں پر گر پڑے اور گڑگڑا کر طلب براری کی التجا کی۔ ملکہ نے شفقت سے ہر ایک کو خلعتِ سرفرازی عطا کیا۔ پھر وہ اُن دسوں شہزادیوں کو مجرا کرتے ہوئے عیب پوش خاتون کے سامنے آکر مؤدب کھڑے ہو گئے وہ بھی شاید اُن کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ ہر ایک کے عیبوں پر جالی کا پردہ ڈال دیا۔ اور کہا کہ جاؤ بدی کرو اور اس پردے میں چھپا لو۔ وہ سب خوش خوش وہاں سے باہر جانے والے دروازے پر آئے یہاں بے شرم زنگی چوبدار نے کہا "بھائیو اپنی اپنی شرم کی پوٹلی یہاں ڈالتے جاؤ"۔ سب اپنی اپنی پوٹلیاں پھینک کر باہر آئے اور خوشی میں ناچتے کودتے جدھر سے آئے تھے اُدھر روانہ ہو گئے اسکے بعد دوسرا گروہ آیا۔ پہلے ملکہ سے خلعت لیکر شہزادیوں کی خدمت میں آداب بجا لایا۔ پھر شیخی زنانی کے قدموں پر سر رکھا۔ وہ بھی بہت محبت سے پیش آئی اور ہر ایک کو لن ترانی اور زبان درازی کی سند عطا کی۔ اور ہر ایک کی پیٹھ ٹھونک کر کہا "جاؤ ہمارے گیت گایا کرو"۔ یہ بھی شرم کی پوٹلیاں پھینک اُسی طرف روانہ ہوئے۔ پھر ایک اور جماعت آئی۔ آتے ہی ملکہ کو ہزاروں دعائیں دیں وہاں سے شہزادیوں کے پاس پہونچے۔ کسی نے قصیدہ پڑھا، کسی نے چاپلوسی کی، کسی نے عقیدت کی نذر گزرانی۔ آخر خوشامد بانو کے سامنے آئے، ہاتھ باندھ کر سر جھکائے بُت کی صورت بنے کھڑے ہو گئے۔ خوشامد بانو نے کسی کو طبع موزوں عطا کی کسی کو چرب زبانی مرحمت کی۔ غرض ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دیکر کہا "جاؤ انکی بدولت اپنا کام بناؤ"۔ وہ بھی اپنی شرم کی پوٹلیوں سے سبکدوش ہو کر گاتے ہوئے کسی طرف کو چلے گئے۔

ملکۂ کذب کی یہ عنایات، شہزادیوں کی یہ خوش اخلاقی، اور خاتونوں کی یہ بخشش دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اپنے رہنما کے کان میں کہا "اگر اجازت ہو تو میں بھی ملکہ کے غلاموں میں داخل ہو کر خاتونوں سے بخشش کا طالب ہوں"۔ وہ مسکرایا۔ اور دانش و دور اندیشی کی عینک دیکر کہا "اسے لگاؤ اور قدرتِ خدا کا تماشہ دیکھو"۔ میں نے وہ عینک لی اور بسم اللہ کرکے آنکھوں پر لگائی۔ اب جو دیکھتا ہوں تو نہ وہ بارہ دری ہے نہ وہ تختِ طاؤس۔ بلکہ ایک خوفناک

اور تاریک غار ہے۔ کانٹوں کے تختے پر ایک دیو کالا کلوٹا لنگوٹا باندھے بیٹھا ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی، ہیبتناک، مگر نیچے جھکی ہوئی، ناک جڑ سے کٹی ہوئی۔ گھبرا گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے کہ کوئی مجھے دیکھتا تو نہیں۔ جب ذرا اور غور سے دیکھا تو ٹانگیں بھی گھٹنوں کے پاس سے کٹی ہوئی نظر آئیں۔ اس نظارہ سے اس قدر کراہیت پیدا ہوئی کہ منہ پھیر کر شہزادیوں کی طرف نگاہ کی۔ وہ دلہنوں کی طرح کانٹوں پر بیٹھی تھیں اور صورت شکل میں اپنے سردار دیو سے کچھ کم بدقوارہ نہ تھیں۔ عیب پوش نازک کو دیکھا تو سراسر عیب۔ دنیا بھر کی برائیوں کے داغ سارے جسم پر لگے ہوئے اور ہر داغ سے پیپ اور لہو ٹپکتا ہوا۔ شیخی زمانی کو دیکھا تو سوکھا کانٹا سا جسم، آنکھیں اندر کو بیٹھی ہوئیں مُردے کی صورت کانٹوں پر پڑی ہے۔ خوشامد بانو کی طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ تمام جسم پر منہ ہی منہ بنے ہوئے ہیں۔ کوئی کچھ گیت گا رہا ہے، کوئی ہنس ہنس کر چاپلوسی کر رہا ہے۔ غرض ہر ایک کچھ نہ کچھ بڑبڑا رہا ہے۔ ابھی خوب سا نہ دیکھ سکا تھا کہ یکایک گرم گرم متعفن ہوا آئی اور دماغ کو پریشان کر دیا۔ میں گھبرا کر غار سے باہر آیا تو دیکھتا ہوں کہ بجائے باغ کے دشت پُر خار ہے، بجائے درختوں کے چھوٹی چھوٹی کالی پہاڑیاں ہیں۔ جنہیں دیکھ کر میرا دل دہل گیا۔ بجائے چشموں کے سراب اور بجائے پھول کے خار ہیں۔ بلبل، کوئل، پپیہا، اور دیگر مرغانِ چمن کی جگہ بدیاں غول بیابانی کی طرح ادھر اُدھر دوڑتی پھرتی ہیں۔ یہ دوزخ کا نمونہ دیکھ کر میں کانپ اُٹھا اور اپنے ہمدم سے بمنت التجا کی کہ برائے خدا مجھے اس قہرِ الٰہی سے جلد نجات دو۔ وہ تو منتظر تھا ہی، میرا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف کو لے چلا۔ تھوڑی دُور چل کر ایک دروازہ ملا۔ جب اُس سے باہر آئے تو جان میں جان آئی۔

چلتے چلتے کچھ فاصلہ پر ایک چھوٹا سا نخلستان نظر آیا۔ جب قریب پہونچے تو دیکھا کہ چھوٹے سے خوشنما بنگلے کے سامنے آدمیوں کی بھیڑ لگی ہے۔ رہنما نے کہا "دیکھ یہ اعتماد الدولہ کی محلسرائے ہے۔ کذب دیو کے مرید سب یہاں ہو کر گذرتے ہیں، سوائے اسکے اور کوئی راستہ نہیں۔ جب آگے بڑھے تو دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی ستر اسی برس کا سفید براق داڑھی، نورانی چہرہ، مسند پر بیٹھا ہے۔ چار پانچ خادم ہاتھوں میں لوہے کی سلاخیں لیے کھڑے ہیں۔ قریب ہی بہت سی آگ روشن ہے۔ اتنے میں ایک گروہ اندر داخل ہوا۔ اور اعتماد الدولہ کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ اعتماد الدولہ نے اپنے خادموں سے کہا کہ یہ سب کذب دیو میرے دشمن جانی کے شاگرد ہیں۔ انکی پیشانی پر داغ لگا دو۔ بس خادموں نے سلاخیں سرخ کر کے اُن کے ماتھوں پر

ایک ایک داغ لگا دیا اور کہا "جاؤ دُنیا میں ذلیل و خوار رہوگے۔ تمھارے قول و فعل کا کوئی اعتبار نہ کرے گا۔ اس داغ سے نجات ملنی ناممکن ہے۔ ہاں اگر اس داغ سے کوئی چھٹکارا پانا چاہتا ہے تو ہمارے سردار اعتمادالدولہ کی عزیز ملکہ صداقت کے دربار میں جائے۔ سوائے اُسکے کوئی اس داغ کو مٹا نہیں سکتا"۔ اسکے بعد ایک اور غول آیا۔ اور اسی طرح ماتھوں پر داغ لگائے گئے۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے بہت سے گروہ آئے اور تکلیف سے روتے پیٹتے واپس چلے گئے۔ مگر اس نخلستان میں پہرہ کا معقول بند و بست نہ تھا۔ اسی وجہ سے بہت سے آدمی بغیر داغ کھائے چوری چھپے نکل بھاگے۔ (اور میرے رہنما نے میرے کان میں کہا کہ "یہ لوگ جو بے داغ کھائے بھاگ گئے ہیں کبھی نہ کبھی ضرور یہاں پکڑے آئیں گے اور داغ کی چاشنی چکھیں گے)

اتنے میں آخری گروہ کے ساتھ میرا نمبر بھی آگیا۔ ڈرتے ڈرتے اندر پہونچا۔ اعتمادالدولہ نے سر اٹھا کر ہماری طرف نظر کی۔ میں اُنکی رعب دار صورت دیکھ کر کانپ اُٹھا مگر اُس نے مسکرا کر مجھ سے کہا "تمھیں تو میں جانتا ہوں تم کذب پور کے مُرید نہیں ہو" پھر خادموں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ اسے جانے دو اور باقی آدمیوں کے داغ لگاؤ"۔ میں فوراً اسلام کر کے خوش خوش باہر آیا اور اپنے رہنما کے ساتھ صداقت خاتون کے محل کا راستہ لیا۔

کچھ دُور آگے چل کر ایک سڑک ملی۔ رہنما نے کہا کہ "یہ وہی سڑک ہے جو سہ راہے سے "راستی ....." کی سمت پھٹی تھی"۔ میں بہت خوش ہوا کہ اب دوسری منزل کا حال بھی ظاہر ہو جائے گا ــــ سڑک کے دونوں جانب طرح طرح کے منظر نظر آئے۔ خود رو پھولوں کی بہار نے آنکھوں کو تر و تازہ کیا۔ شمیم جاں بخش نے بدن میں تازہ روح پھونک دی۔ ایک طرف سبز پوش درختوں کے جھُنڈ میں آبشار کی گڑگڑاہٹ دھیمی دھیمی نسیم کی سرسراہٹ سے مل کر ایک نغمۂ روح افزا پیدا کر رہی تھی، دوسری جانب سرو سہی قد اسے سُن سُن کر سکتے کے عالم میں دم بخود کھڑا تھا۔ ایک طرف نرگسِ حیران لالہ زار کو دیکھ کر حیران تھی، دوسری طرف بہار رنگا رنگ کی مشاطہ نے باغ کا سنگار کیا تھا۔ بلبل غنچوں کے تبسم پر خوشی کے مارے طرح طرح کے ترانے اُڑا رہا تھا سبز مخمل کا فرش ہر طرف بچھا تھا اور اُس پر اوس کے قطرے کیا پڑے تھے گویا موتی جڑے ہوئے تھے۔ میرے ہمدم نے چلا کر کہا "دیکھ، یہ بہار کہاں دیکھنے میں آتی ہے۔ فانی ہاتھ کب یہ سمان پیدا کر سکتا ہے۔ قربان ہو اُس باغبانِ قدرت کے جسکے ہاتھوں نے یہ باغ لگایا اور اس سادگی سے سجایا ہے"۔ دل کی مسرت کا حال کیا بیان کروں، بلّیوں اُچھل رہا تھا۔ الغرض

اسی طور پر مناظر قدرت دیکھتے بھالتے، راستی کے باغ کے دروازہ پر پہونچے۔ دروازہ کی محراب پر زریں حروف میں لکھا تھا " اے آمدنت باعث آبادی تو" میں نے رہنما سے کہا کہ شاید لکھنے والے نے یہ مصرعہ غلط لکھ دیا ہے۔ میرے خیال میں یہ یوں ہے "لے آمدنت باعث آبادی ما" وہ میرے بھولے پن پر ہنس دیا اور کہنے لگا "تم خود دیکھ لوگے کہ لکھنے والے نے ٹھیک لکھا ہے یا غلط۔ بھلا یہاں غلطی کا کیا کام؟ بناوٹ سے کیا غرض؟ جو کچھ ہے نپا تُلا۔ نہ کم نہ زیادہ۔

باغ کا دروازہ کھُلا ہوا تھا۔ دہلیز پر قدم رکھنا چاہتا ہی تھا کہ خوف سے روح تھرا گئی۔ سکتہ کا سا عالم طاری ہوگیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ دروازہ میں دور تک خار مغیلاں بچھے ہوئے ہیں۔ جا بجا فولادی نشتر سر اُٹھائے چمک رہے ہیں۔ ہر طرف سے کڑوی کڑوی افیون کی سی بو آرہی ہے۔ میں کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ لکھ دی، اقت کا باغ اور بسم اللہ ایسی۔ میرا رہنما پیچھے کھڑا ہنس رہا تھا۔ اور میں تھا کہ جی ہی جی میں کُڑھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک متبرک صورت خوش رُو جوان استقلال نامی نمودار ہوا۔ کوئی پچیس چھبیس برس کا سن ہوگا۔ ہاتھ میں تلوار۔ کاندھے پر کمان۔ ترکش میں تیر بھرے ہوئے۔ ڈھال کمر سے بندھی ہوئی۔ سر پر خود فولادی۔ چار آئینہ لگائے۔ طاقت۔ شہزوری اور بہادری کے نشہ میں چُور میرے پاس آیا اور کڑک کے کہا "بسم اللہ کہکر قدم کیوں نہیں رکھتے ہو۔ خوف و ہراس کو دل سے نکالو۔ حوصلہ و ہمت کو جگہ دو"۔ اور ساتھ ہی میرے بازو پر ہمت کا تعویذ باندھ دیا۔ استقلال کی اس ہمت افزائی اور تعویذ کی برکت سے دل میں اک جوش پیدا ہوا۔ گر ڈرتے ڈرتے قدم رکھا۔ قدم کا رکھنا تھا کہ خوفناک کانٹے نہایت ملائم مخمل کے قالینوں میں مبدل ہوگئے۔ گو شکل بظاہر وہی رہی گر پیر کہتے تھے کہ ایسے فرش فروش شاید فریدوں کے قصر میں بھی نہ ہونگے۔ جوں جوں آگے بڑھتا جاتا تھا دل کی فرحت بھی بڑھتی جاتی تھی۔ یہاں تک دروازہ ختم ہوا اور باغ شروع ہوا۔

یہ باغ کذب دیو زاد کے باغ کی طرح نہ تھا بلکہ اسکا ڈھنگ ہی کچھ نرالا تھا۔ نہ وہ بہار نہ وہ رونق نہ وہ سجاوٹ۔ صحن گلشن میں چاروں طرف زرد زرد خشک پتوں کا فرش۔ درخت ننگے۔ چاروں طرف ہاتھ پھیلائے ہوئے۔ مرجھائی ہوئی شاخوں پر گُل تو کیا پتوں کا نام نہیں۔ نہریں خشک۔ حوض میں بجائے پانی کے پژمردہ پتوں اور مردہ شاخوں کا ڈھیر۔ بلبل کو دیکھا تو نالاں۔ قمری کو دیکھا تو چشم نم۔ یہ حالت دیکھکر مجھے بھی رونا آگیا۔ رہنما سے پوچھا اے پیرو مرشد یہ کیا راز ہے جدھر دیکھو خزاں کا راج ہے۔ لاکھ گلستاں میں بیاباں دیکھتا ہوں

مگر دل ہے کہ خدا جانے کیا دیکھ رہا ہے۔ آپ ہی آپ بشاش ہے۔ جواب دیا کہ اسلئے کہ وہ اگر اس اسرار سے واقفیت چاہتا ہے تو وہی عینک لگائے۔ عینک لگا دی تھی کہ کایا پلٹ گئی۔ دنیا وہ سہانا نظر آیا کہ سبحان اللہ۔ کبھی خیال کی آنکھوں نے بھی نہ دیکھا تھا نہ کانوں نے سنا تھا۔ میں ہمہ تن چشم بن بُت کی صورت کھڑا یہ عجائبات دیکھ ہی رہا تھا کہ رہنمائے کامل نے کہا چلیں اب محل بالکل قریب ہے وہاں کوئی خطرہ نہیں۔

دُور سے صداقت خاتون کا محل نظر آیا۔ قصر کسریٰ سے زیادہ وسیع۔ رفعت وشان میں تاج محل سے بہتر۔ مگر سادگی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ بجائے زر و جواہر کے دروں پر قرآن پاک و انجیل مقدس کی آیات، وید و گرنتھ کے اشلوک لاتعداد کندہ تھے۔ یہاں بھی آدمیوں کی بھیڑ لگی تھی۔ جب قریب پہونچے تو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ اس بھیڑ میں بعض ایسے شخص بھی تھے جنکی پیشانی پر اعتمادالدولہ کے قہر کا داغ لگا ہوا تھا۔ اور تکلیف سے چلا چلا کر آہ وزاری کر رہے ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ بیچارے اس داغ کو برداشت نہ کر سکے ملکہ صداقت کے پاس مرہم لینے آئے ہیں۔ میرے ہادی نے میرا ہاتھ پکڑا اور پیچ در پیچ راستہ سے اس خاص کمرے میں لیگیا جس میں ملکہ صداقت خاتون کا دربار لگا ہوا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی عجب سماں دیکھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بادِ صبا اٹکھیلیاں کرتی ادھر اُدھر چکر لگا رہی تھی۔ عطریات کی مہک مشک و عنبر سے کہیں زیادہ دماغ کو فرحت بخش رہی تھی۔ عین وسط میں ایک مسند پر ملکہ صداقت خاتون سادہ لباس پہنے عجب آن بان سے بیٹھی تھی۔ حسن کا وہ عالم جسے دیکھ کر ایک عالم قربان ہو۔ رُخ روشن کی چمک دمک سے سارا کمرہ منور ہو رہا تھا۔ سر پر پسند عام کا تاج دھرا تھا۔ دستِ راست میں کامیابی بیگم اور دست چپ میں خوشی ساد تہ بیٹھی ہوئی ملکہ کی بلائیں لے رہی تھی۔ مسند کے سامنے نیکیاں ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑی تھیں۔ ملکہ صداقت خاتون کو بدیوں چڑیلوں سے سخت دشمنی تھی۔ اُنکے لیے بڑے بڑے قفس بنوائے تھے اور کمرے کے گوشوں میں رکھوا دیے تھے تاکہ اپنی آنکھوں کے سامنے انکو زد و کوب کرائے۔ ان قفسوں میں ہزاروں ایسی ایسی چڑیلیں قید تھیں۔ دروازہ کے باہر برآمدہ میں درجنوں فلاسفر بیسیوں مذہبی پیشوا کھڑے تھے اور سب اس بات پر متفق الرائے تھے کہ ملکہ صداقت خاتون دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت اور نیک خاتون ہے [illegible]

اب دیدار کے طالبوں کی آمد شروع ہوئی۔ ایک گروہ اندر داخل ہوا۔ انکی چال ڈھال میں سنجیدگی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ متانت قدم قدم پر ظاہر ہوتی تھی۔ لبوں کی مسکراہٹ کہہ رہی تھی کہ استقلال جو بہار نے دلوں میں ہمت بھر دی ہے۔ آتے ہی سب سے پہلے قفسوں کے پاس گئے اور جس جس کے پاس جو کچھ بدی تھی وہاں پھینک ملکہ کے روبرو آکر قدموں پر گر پڑے۔ اُس نے نہایت لطف و کرم سے اُٹھا کر سینے سے لگایا اور ہر ایک سے اپنے پیارے ہاتھوں پر بیعت کرائی۔ کامیابی بیگم نے اُٹھ کر اپنے نازک نازک ہاتھوں سے سب کے جسموں پر اسلحہ سجائے اور سینے پر کامیابی کے سنہری تمغے لگائے۔ اسکے بعد خوشی صادقہ مسکراتی ہوئی اُٹھی اور سب کے سروں پر مسرتِ دوام کا مرصع تاج رکھا۔ جب سب سج سجا کر لوٹے ہوئے تو وہ حسن باطن تھا کہ نیکیوں سے نہ رہا گیا۔ بڑھ کر ہر ایک کے قربان ہوئیں اور چاروں طرف پھر پھر کے دعائیں دینے لگیں۔ بالآخر سب کو ایک ایک سنہری انگوٹھی جسپر قیمتی نگ جڑے تھے بطور نشانی دی اور پیرہن کو مشک عنبر میں بسایا۔ وہ بھی ان پر ہزار جان سے قربان ہوئے اور انگوٹھیوں کو آنکھوں سے لگا کر پہن لیا۔ اور کہا "جب تک جان میں جان ہے اسے جدا نہ کرینگے"۔ اسکے بعد دوسرے دروازہ سے ہنستے کودتے چلے۔ اس طرح کہ اسلحہ اور تمغوں کی چمک سے آگے آگے روشنی ہوتی جاتی تھی۔ اور عطریات کی مہک پیچھے ہوا کو معطر کرتی جاتی تھی۔

اسی طرح گروہ پر گروہ آتے رہے اور سب اسی طور سے سرفراز ہو کر جاتے رہے۔ سب سے اخیر میں ایک جماعت داخل ہوئی۔ رنج و غم سے چہرے پژمردہ۔ دُکھ اور تکلیف سے حالت دگرگوں۔ پیشانی پر داغ لگے ہوئے۔ مسند کے پیچھے سے غیرت آئی اور چلا کر کہا "دیکھتے ہو تمہارے ہاتھوں پر یہ ٹیکے کیسے لگے ہیں؟" ان بیچاروں نے شرم کے مارے ہاتھوں سے اپنے چہرے چھپا لیے دوڑ کر قفس کے پاس پہونچے۔ بدیوں اور کذب دیوزاد کے دربار کے تحفہ و تحائف کو گناہوں کے بوجھ کی طرح سر سے اتار پھینکا۔ اور ملکہ کے قدموں پر سر رکھ کر رونے لگے۔ ملکہ خاموش بیٹھی انکی آہ و زاری سُناکی۔ مگر جب بہت کچھ فغان و فریاد کر چکے اور ملکہ کی بے اعتنائی حد سے گذر چکی تو رحم نے آکر ملکہ سے دست بستہ عرض کی "حضور یہ بیچارے آفت کے مارے دنیا کے بُرے برتاؤ سے تنگ آکر دربار میں حاضر ہوئے ہیں انکی طرف نظر التفات کیجیے اور اس عذاب سے نجات دیجیے"۔ یہ سُن کر ملکہ کا دل بھر آیا۔ ہاتھ پکڑ کر اُٹھا لیا۔ صندوقچی سے مرہم نکال کر داغوں

پر لگایا۔ مرہم کا لگانا تھا کہ سب داغ مٹ گئے۔ سب کلفتیں دور ہو گئیں۔ پھر حسب دستور اپنے ہاتھ پر بیعت کرائی۔ کامیابی بیگم نے اسلحہ سجائے مگر تمغے چند لگائے اور وہ بھی چاندی کے۔ خوشیِ صادقہ نے تاج پہنائے مگر ویسے چمکدار نہیں۔ نیکیوں نے انگوٹھیاں پہنائیں اور عطر لگایا مگر ویسی قیمتی انگوٹھی تھی نہ ویسا خوشبودار اور تازہ عطر۔ جب سب مل چکے تو دل کو تسکین حاصل ہوئی۔ کذب دیو زاد کے غلیوں سے نجات ملی۔ اعتماد الدولہ کے قہر کا داغ دھل گیا۔ غرض خدا کا شکر کرتے روانہ ہوئے۔

اب میری باری تھی۔ میں نے اپنے ہادی سے پوچھا اگر اجازت ہو تو جاؤں اور ملکہ صداقت خاتون کے ہاتھ پر بیعت کروں اور دربار سے فیضیاب ہو کر اپنے گھر جاؤں۔ اُس نے کہا "در کارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست۔" میں بڑھا اور ملکہ کے پیر چومے۔ اُس نے مسکرا کر کہا "آخر تو آ گیا۔ بھلا پہلے ہمارے دشمن کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا ہم پر اعتماد نہ تھا" میں نے کہا "حضور خیال کہتا تھا کہ ہر ایک چیز اپنی ضد سے خوب پہچانی جاتی ہے۔ نیز میرے ہمدم و ہادی نے بھی پہلے وہیں جانے کی صلاح دی تھی۔ اس لیے وہاں چلا گیا۔ مگر شکر ہے کہ کہیں لغزش نہ ہونے پائی۔" ملکہ بہت خوش ہوئی اور اپنا ہاتھ بڑھایا۔ میں نے بیعت کی۔ کامیابی بیگم نے اسلحہ اور تمغے سجائے۔ خوشیِ صادقہ نے سر پر تاج رکھا۔ نیکیوں سے انگوٹھی اور عطر لیا۔ بدیاں تو تھی ہی نہیں۔ ہاں نفس کے پاس جا کر حقارت کی نظر سے پہلے ہی دیکھ آیا تھا۔ خوشیِ صادقہ کے تاج نے کچھ ایسا اثر کیا کہ میں خوشی سے اُچھل پڑا۔ آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا ہوں کہ صبح صادق ہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ اور قریب ہی چمن میں چنبیلی کی بھینی بھینی نکہت نسیم سحری کو معطر کر کے چہار طرف روانہ کر رہی ہے۔ میں کلمہ پڑھتا ہوا اُٹھ بیٹھا اور سجدۂ شکر میں گر پڑا کہ ملکہ صداقت خاتون کا دربار دیکھا اور اُنکے دستِ حق پرست پر بیعت کرنا نصیب ہوا۔

صغیرا احمد جان

ننھی سایہ پوش لیڈی

اس وقت وسیع ہوادار ہال میں بڑی سردی تھی اور ننھی سایہ پوش لیڈی جسکے بھاری سیاہ [illegible] کو زرد بنا دیتے ہوئے تھے، کچھ کچھ کانپ رہی تھی اور چاہتی تھی کہ وہ بار بار آسمانی شال جو اسکے شانوں پر پڑی ہوئی تھی اپنے جسم پر اچھی طرح لپیٹ لے۔ اسکے ایک نازک اور چینی کے سے سفید ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا، اور دوسرا ہاتھ چھوٹی چھوٹی حنائی انگلیوں میں آسمانی شال دبائے ہوئے سینے پر نرمی سے رکھا ہوا تھا۔ ہال کے سیاہ شاہ بلوط کے دروازوں کے مقابل وہ نازک نازک پیاری پیاری اور اداس اداس سی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا چھوٹا سا خوبصورت سر گورے گورے شانوں پر سے ابھرا ہوا تھا۔ اسکے بال ننھے ننھے جنگلی گلاب کے سے دو حلقے ہلکے گلابی رخساروں کے دونوں طرف پڑے ہوئے تھے۔ اسکی نیلی [illegible] تاریکی میں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔ ایسی ساکن تھیں کہ پلک بھی نہ جھپکتی تھی اور ان سے اداسی ٹپک رہی تھی۔

گھڑی نے کہیں رات کے بارہ بجائے۔ ننھی سایہ پوش لیڈی نے ایک آہ کی۔ اف! کیسی ننھی سی دلخراش آہ تھی جو اسکی ننھی چینی ہستی کے دل سے نکلی تھی، اور اس سے اسکے فراک کا سخت ریشم ہلتا ہوا معلوم ہوا، کیونکہ اس میں ایک خفیف سی سرسراہٹ ہوئی، گویا ایک ہلکی سی ہوا نے اسے جنبش دی ہے۔ ایک سکنڈ کے لیے سرخ گلاب کا پھول بھی کانپ گیا، اب کوئی دم میں قفل کھلنے کی آواز آیا ہی چاہتی ہے، اور سامنے کا بڑا دروازہ رات کی سرد ہوا اور صاحب خانہ کو داخل کرنے کے لیے کھلا ہی چاہتا ہے۔ ممکن ہے وہ سیدھا اندر چلا آئے اور ہیٹ اور کوٹ کھونٹی پر لٹکا کر اسکی طرف سے بے پروائی کرتا ہوا زینے کی راہ لے، یا ممکن ہے وہ ذرا پس و پیش کرے، کسی قدر لڑکھڑائے، کھونٹی ڈھونڈنے میں اسکو کچھ دقت ہو، اور تذبذب کی حالت میں اپنے کمرے تک چڑھ جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جیسا اس نے ایک کبھی نہ بھولنے والی رات کو کیا تھا وہ اسکی طرف سے گزرتے وقت اسے چھوئے اور کوئی پیار کا فقرہ کہے، گویا وہ وہی جاندار لڑکی ہے جو وہ دل سے ہونا چاہتی ہے۔

اسکے انتظار میں اسکی نگاہیں سامنے کی طرف اس تاریکی میں جم گئیں جو اسکو چاروں طرف

سے گھیرے ہوئے تھی اور جس میں ایک پر دہ پوش لیمپ نے جو ساری رات ہال میں جلا کرتا تھا ہلکی سی روشنی کر دی تھی - دادا کے وقت کی پرانی گھڑی سنجیدگی سے کھٹ کھٹ کیے جا رہی تھی ایک بد قطع مورت کا بھدا چہرہ اندھیرے سے اُسکو ڈرا رہا تھا - مہیب شکلیں اور سائے پُراسرار طریقے سے اُسکے چاروں طرف چل پھر رہے تھے اور ننھی سایہ پوش لیڈی اُسکی آمد کا انتظار کر رہی تھی جس سے اُسکو محبت تھی -

آخر کار دروازے پر آواز ہوئی، قفل میں کُنجی لگی، اور دروازہ کُھل گیا - صاحب خانہ اپنے پیچھے دروازے بند کرتا ہوا داخل ہوا - ننھی لیڈی کا دل دھڑکنے لگا گویا اُسکا دم گھُٹ جائیگا - جس ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا وہ کانپ گیا اور اُس نے محسوس کیا کہ وہ اسکو ہلتا ہوا ضرور دیکھ لیگا - اُس نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اُسکو ہیٹ اور کوٹ ٹانگتے ہوئے دیکھا - آج کی رات تو وہ ذرا ہوش میں تھا - اُسکی اُنگلیوں نے اپنی شال دبائی، اس زور سے کہ اُسکے چینی ناخن باریک کپڑے میں گھس گئے - وہ اگر اسکی طرف کبھی التفات کرتا تھا تو اُسوقت جب وہ خوب پیے ہوتا تھا - اور اسی حالت میں اُس نے ایک دفعہ اُس سے باتیں بھی کی تھیں ...... اور اس وقت وہ اس آرزو میں چشم براہ تھی کہ وہی موقع پھر آئے - اس سے اُسکی تسکین تو کیا ہوتی کہ وہ کبھی کبھی اُسکی طرف دیکھ لیتا تھا، کچھ نہ ہونے سے تو یہی بہتر تھا، بلکہ بے انتہا بہتر تھا -

وہ سیڑھیوں کی طرف آہستگی سے چلا اور جب وہ لیمپ کے قریب سے گذرا تو اس ننھی لیڈی نے اُسکے خوبصورت چہرے کی جھلک دیکھ لی — دیکھیے، وہ پیچھے پھر کر اُسکی طرف دیکھتا بھی ہے کہ نہیں - اور جس طرح کُتے کو ہڈی پھینکدیتے ہیں اُس طرح بھی وہ اُس کی طرف کوئی لفظ پھینکتا ہے کہ نہیں - دیکھیے وہ کیا کرتا ہے -

اُس کی سانس رُک گئی، اُسکی چینی نیلگوں آنکھیں اُس پر اس طرح جم گئیں کہ پلک تک نہ جھپکتی تھی، اُس کا دل شال کے نیچے دھڑک رہا تھا، سرخ گلاب کا پھول اُسکے ہاتھ میں کانپ رہا تھا - کاش وہ گلاب کا پھول ہی اُسکے سامنے یہ ظاہر کرنے کے لیے پھینک سکتی کہ ہے تو وہ ایک چینی کی گڑیا! مگر اُس سے عشق رکھتی ہے! کاش وہ اُسکو کچھ سمجھا سکتی، اُسکو اپنی طرف دیکھنے پر مائل کر سکتی، اور اُسکو وہ دل دکھا سکتی جو اُسکے لیے دھڑک رہا تھا، اور وہ ننھا سا سرد ہاتھ جو اُسکے ہاتھ میں پہونچنے کا آرزومند تھا اُسکو چھو سکتا - اُسکی صرف ایک مسکراہٹ ہی ..... لیکن اُسکو کیونکر معلوم ہوتا کہ وہ سچ مچ کی عورتوں کی طرح دیکھتی ہے، احساس کرتی ہے، محبت

(۲) ڈے اسکالر (مقامی طلبہ) تناسب سے بہت زیادہ ہو گئے،

کمیٹی نے رائے دی تھی کہ

"طلبا کی تعداد گھٹا دینی چاہیے اور صرف اتنے طلبا رکھے جائیں جنکو ہم عمدہ طور پر تعلیم دے سکتے ہیں"

لیکن جس طرح آنکھیں بند کر کے داخلے کیے جاتے رہے اندیشہ ہے کہ پرو وائس چانسلر صاحب اس تجویز کو بھی عملی صورت میں نہ آنے دیں گے۔

کمیٹی کی رائے تھی کہ

"ایک کمرہ میں دو سے زیادہ طالب علم نہ رکھے جائیں"

مگر دو نوجوانوں کا ایک کمرہ میں رکھنا مناسب نہیں۔ اسی لیے پرو وائس چانسلر صاحب کے خواہش کی گئی کہ سرسید کورٹ یا ایسے دوسرے ہوسٹلوں میں تین سے زیادہ طلبا ایک کمرہ میں نہ رکھیں، مگر انھوں نے اسکی تعمیل یوں کی کہ اب بورڈنگ کے ہر کمرہ میں چار طالب علم رہتے ہیں۔ حالانکہ کمرہ میں چار یا پانچ طلبہ رہتے ہوں تو اکثر خود طلبا شکایت کرتے ہیں کہ وہ پوری طرح مطالعہ نہیں کر سکتے۔

تعداد طلبا کے بارے میں پرو وائس چانسلر صاحب کی خطرناک روش ہی کا نتیجہ ہے کہ ڈے اسکالر (سکونت نہ رکھنے والے طلبا) کی تعداد حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ڈے اسکالر دو قسم کے ہیں۔ ایک تو اساتذہ و دیگر یونیورسٹی کے ملازمین کے لڑکے یا عزیز، جو یونیورسٹی میں یا کہیں قریب رہتے ہیں۔ دوسرے وہ طلبا جو باہر سے آتے ہیں اور یونیورسٹی میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے شہر میں یا شہر کے قریب کرایہ کے مکانات میں رہتے ہیں۔ پہلی قسم کے طلبا پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ شق ثانی کے ڈے اسکالرس کی تعداد جس قدر ممکن ہو کم کر دینی چاہیے کہ یہ صرف یونیورسٹی کے سکونتی درس گاہ ہونے کے منافی ہی نہیں بلکہ اُن نوجوانوں کے لیے بھی سخت خطرناک ہے جنکو ایسے ناقابل اطمینان ماحول میں رہنے کی اجازت دی جائے اور صاحبزادہ صاحب کی قطعی رائے ہے کہ اُن طلبہ کے علاوہ جو اپنے والدین یا نہایت قریبی رشتہ داروں کے ساتھ رہتے ہوں کسی بیرونی طالب علم کو شہر میں رہنے کی اجازت نہ دینی چاہیے۔

کمیٹی کی رپورٹ اور اُس کے ہمراہ جو تحریر صاحبزادہ صاحب نے بھیجی تھی اور جسکے متعلق اُنھیں توقع تھی کہ پرو وائس چانسلر صاحب کی جانب سے سرگرمی کے ساتھ لبیک کہی جائے گی اُسکے متعلق ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے ۱۱۔ اکتوبر کو ایک طولانی خط بھیجا، جسکے مطالعہ سے عیاں ہو جاتا ہے

کہ صاحب موصوف نے

"اتنی طویل خامہ فرسائی پر بہت کم التفات کیا۔ وہ مطلب کی بات ہر جگہ بچا گئے، اور تقریباً میری ہر ہدایت کو انھوں نے پس پشت ڈال دیا۔ حالانکہ میں اپنے اختیاراتِ خصوصی سے کام لے رہا تھا اور انکو مطلع کرچکا تھا کہ میں ایسا کر رہا تھا۔ یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ اپنے خط کے صفحات ۱۰-۱۳-۱۴-۱۵-۱۹-۲۰-۲۲-۲۵-۲۶-۲۸-۲۹-۴۰ و ۴۱ وغیرہ میں کمیٹی کے بعض مشوروں کے نسبت نیز آرڈیننس اور اکیڈمک رگولیشنز کی بعض دفعات کے متعلق میں نے صریح ہدایت کردی تھی کہ انکو بحث اور فیصلہ کے لیے اکیڈمک کونسل میں پیش کردیا جائے، لیکن پرو وائس چانسلر نے توجہ بھی نہ کی اور پیش نہیں کیا۔ اسکے علاوہ اکیڈمک ریگولیشنز کی بعض دفعات کے متعلق میں نے کچھ رپورٹ اور اطلاع طلب کی تھی، اپنے خط کے صفحات ۳۶-۴۱ میں قانون کی بعض نہایت ضروری دفعات کے بارے میں انکو میں نے صریح ہدایت لکھی تھی مگر انھوں نے کوئی توجہ نہ کی اور انکی بابت مجھکو کوئی جواب نہ دیا۔ .... اس یونیورسٹی میں قوانین کی پابندی جس طرح کی جارہی ہے وہ ان واقعات سے ظاہر ہے۔"

باب ہشتم۔ انٹرمیجیٹ کالج۔

اسٹیٹوٹس کے فقرہ ۱۶ ضمن ۵ کے بموجب ایگزیکیٹو کونسل انٹرمیجیٹ کالج کی منتظم جماعت متصور ہوتی ہے، لہذا عام انتظامات میں وائس چانسلر کو کچھ اختیارات حاصل ہیں اور اسی سبب سے اس شعبہ کو ترقی دینے میں ایک حد تک صاحبزادہ صاحب کو کامیابی ہوئی۔ انھیں کی تجویز پر مسٹر قریشی کا تقرر بطور پرنسپل کے ہوا۔ اور انھوں نے بہت عمدہ کام کیا۔ تعداد طلبا میں (اگرچہ صاحبزادہ صاحب کے نزدیک وہ چنداں اہمیت نہیں رکھتی) اتنا اضافہ ہوا کہ ۲۴ء میں ۷۳۰ تھی اور اب ۱۰۴۹ ہے۔ جب تک اساتذہ۔ دارالاقامے اور لکچر روم کافی تعداد میں نہ ہوں طلبہ کی تعداد بڑھانا غلطی تھی، لہذا ان ضروریات کی فراہمی پر حتی الامکان توجہ کی گئی۔ اساتذہ کی تعداد ۲۸ سے ۳۶ ہوگئی۔ ایک نیا بورڈنگ نصر اللہ ہوسٹل بنا، جس میں سو سے زائد طلبہ کی گنجائش ہے اور ایک نئی عمارت جو بچہ اسکول کے نام سے مشہور ہے کالج کو دیدی گئی۔ تین اور ہوسٹل زیر تعمیر ہیں جن میں سے دو کے متعلق امید ہے کہ دو تین مہینے میں تیار ہو جائیں گے۔

کالج کے کتب خانہ کی حالت بہت ترقی پذیر ہوئی، اور وہاں بہت سی نئی انجمنیں قائم

ہوئیں۔ مثلاً منطق سوسائٹی، شیکسپیر سوسائٹی، تاریخی سوسائٹی، انجمن دینیات اور فارسی و عربی کی سوسائٹیاں۔ ان جماعتوں کے منتظمین پہلے دو سال بہت سرگرم کار رہے مگر بعد کو جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ صاحبزادہ صاحب کے اثر کی وجہ سے ہی ان انجمنوں کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوئی سال اول میں یہ عام خواہش تھی کہ جدید اخلاقی دو ولی تجاویز پیش کریں گے صاحبزادہ صاحب کی منظوری حاصل کی جائے مگر ایسے نہیں جب مخالفت فوقیت کا اثر پھیلا تو کافی موقعہ مل گیا۔ حالات میں بہت تغیر ہو گیا۔

جس طرح سے بحیثیت اگزیکیٹو کونسل کے معتمد کالج کی عام نگرانی وائس چانسلر سے متعلق ہے اسی طرح علمی شعبہ پرو وائس چانسلر سے تعلق رکھتا ہے جو انٹرمیڈیٹ اگزامنیشن بورڈ کے عامل ممبر ہونے کی وجہ سے خاص اختیار رکھتا ہے۔ ورزش اور امتحان کے معاملات میں صاحبزادہ صاحب کو کسی قسم کی اصلاح کا اختیار نہ تھا اگر کالج میں رہنے کے طریقہ کی اصلاح کی خاطر انھوں نے کوشش کی مگر پرو وائس چانسلر نے آگے چلنے نہ دی۔

باب ششم - یونیورسٹی اسکول۔

اسکول ایگزیکیٹو کونسل کے زیر انتظام سمجھا جاتا ہے اور صاحبزادہ صاحب اس انتظام کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اصلی حالت یہ نہیں ہے کیونکہ اسکول کا انتظام بمطابق فقرہ ۲ باب پنجم قواعد انتظامی ایک مستقل کمیٹی موجود ہے جس کا نظام یہ ہے

(الف) ممبران بلحاظ عہدہ

۱۔ پروفیسر تعلیم یا جب تک اس عہدہ دار کا تقرر نہ ہو پرو وائس چانسلر

۲۔ جملہ ہیڈ ماسٹر صاحبان ان مدارس کے جو یونیورسٹی کے زیر انتظام ہوں۔

(ب) ایک انٹرمیڈیٹ کالج کا پرنسپل جسے وائس چانسلر نامزد کرے گا۔

(ج) چار منتخب اراکین اگزیکیٹو کونسل کے نامزد کردہ جن میں سے ایک اکیڈیمک کونسل کا نمائندہ ہوگا۔

فقرہ ۳ کے مطابق پروفیسر تعلیم کے تقرر تک پرو وائس چانسلر کو صدر کمیٹی ہونا چاہیے اسلیے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب ابتدا سے لیکر اسوقت تک اسکول کمیٹی کے صدر رہے۔ ان حالات میں اسکول جو افسوسناک حالت میں تھا اُسکی اصلاح کرنے میں شروع ہی سے مختلف مشکلات صاحبزادہ صاحب کو پیش آئیں۔

حالت پر تھی۔ اسکول کا اپنا ہیڈ ماسٹر ہی نہ ہوتا تھا۔ ٹریننگ کالج کے پرنسپل اس کا کام بھی کرتے تھے۔ سامان بھی نہایت ردی حالت میں تھا۔ چند بچے ہوئے نقشے تھے۔ [illegible] ایک بنچ تھا۔ میز پر [illegible] نہایت خراب حالت میں تھیں۔ اساتذہ کے لیے [illegible] شکستہ میزیں تھیں۔ دارالاقامہ بھی ایسی ہی ابتر حالت میں [illegible] نہ کوئی نہانے کا سامان [illegible] چالیس طلبا میں صرف دس پیالے تھے۔ انگلش ہاؤس کی حالت تو نہایت ہی بھیانک [illegible] تھی۔ ایک خاتون [illegible] تنخواہ اور باغ کی دیکھ ریکھ کے لیے دو سو روپے [illegible] یونیورسٹی سے دیئے جاتے تھے۔ [illegible] انگلش ہاؤس پر کئی قرض کا ایک بڑا بار تھا۔

[illegible] پورا وقت دینے والا ہیڈ ماسٹر پانے میں کامیاب [illegible] اسکول کی خراب حالت کی اصلاح کر سکیں۔

اسکول کے لیے [illegible] ایک نئی عمارت کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی [illegible] لاؤنسل کے عہد میں [illegible] اس کام کے لیے ایک امداد ملی۔ پھر سرہارکورٹ بٹلر [illegible] امداد ملی مگر [illegible] شروع نہ ہوا۔ [illegible] میں صاحبزادہ صاحب [illegible] عمارت کی ابتدا کی، اور اب اسکول کے لڑکے مدرسہ کی نئی، خوبصورت اور آرام دہ عمارت میں پڑھتے ہیں۔ اب اسکول میں آلات اور فرنیچر کافی تعداد میں [illegible] طلبا کی تعداد [illegible] ہو گئی ہے۔ [illegible] دارالاقاموں میں طلبا کے آرام و آسائش کی تمام ضروریات مہیا ہو گئی ہیں۔ انگلش ہاؤس [illegible] اچھی حالت میں ہے اور [illegible] یونیورسٹی سے دو سو روپیہ ماہوار [illegible] نہیں دینا پڑتی۔

صاحبزادہ [illegible] انگلستان میں [illegible] بچوں کے خاص [illegible] سائنس وغیرہ پر توجہ کی۔ چنانچہ اس اسکول میں بھی ماننٹی سوری کلاس کھل گیا ہے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کو مدرسے کی [illegible] ظہور حسین وارڈ اور دوسرے دارالاقاموں کی درستی میں پوری مدد دی گئی۔ پہلے اسکول کے طلبا کا کھانا یونیورسٹی کے مطبخ میں تیار ہوتا تھا، اب اسکول کا مطبخ علیحدہ ہے اور وہیں کھانا تیار ہوتا ہے۔

باب دہم - یونیورسٹی [illegible] زندگی۔

صاحبزادہ صاحب نے یکم جنوری [illegible] کو اپنے عہدہ کا جائزہ لیا۔ صبح کو پانچ بجے یونیورسٹی کی مسجد میں پہونچے اور خود ہی اذان کہی۔ موذن صاحب کتب خانہ میں پڑے

خراٹے لے رہے تھے۔ طلبا کی تعداد نماز فجر میں ایک درجن سے زائد نہ تھی۔ معلم و اتالیق ایک بھی نہ تھے۔ دوسرے روز طلوع آفتاب سے قبل انٹرمیڈیٹ کالج میں صاحبزادہ صاحب گئے تو "مسجد میں نہ کسی طالب علم کو پایا نہ اُستاد کو، حتیٰ کہ پیش امام تک غیر حاضر تھے البتہ صرف مؤذن صاحب تشریف رکھتے تھے"۔

گذشتہ تین سال میں حسب ذیل اصلاحات اس شعبہ میں ہوئی ہیں:۔

(الف) کلام مجید پڑھانے کے لیے مسجد میں جو کمرے مخصوص تھے وہ بے غوری کی حالت میں تھے اُسکے ایک کمرہ میں مہتمم دینیات اور مؤذن کا باورچی خانہ تھا۔ اس بے حُرمتی کا انسداد کرنے کے لیے مکتب کے دالان میں اینٹیں چنوادی گئیں اور دروازے لگادیے گئے اور اب یہ عمارت خوب صاف ستھری رہتی ہے۔

(ب) پہلے صرف چھ پیش امام تھے جن میں سنی اور شیعہ مہتمم دینیات بھی شامل تھے۔ اب مہتممین کے علاوہ ۱۳ پیش امام ہیں اور تقریباً سب کے سب حافظ ہیں اور بعض اچھے قاری بھی ہیں۔

(ج) صاحبزادہ صاحب نے کلام مجید کے متعدد زائد نسخے تینوں مسجدوں میں رکھوا دیے ہیں۔

(د) نئی جانمازیں کثیر تعداد میں صاحبزادہ صاحب نے اپنی پسند کے مطابق منگا دی ہیں۔

(ہ) کونسل سے منظوری حاصل کی گئی ہے کہ مہتمم دینیات کے واسطے باورچی خانہ اور موذنوں کے لیے کمرے مسجد کے شمال میں بنوا دیے جائیں۔

(و) قرأت سیکھنے والے طلبا کی ہمت افزائی کے خیال سے سالانہ امتحان میں خاص دلچسپی لی گئی۔ پہلے چھ وظیفے پانچ پانچ روپیہ کے اور چار تین تین روپیہ ماہوار کے تھے۔ اب ۴ سات سات روپیہ کے ۴ چھ چھ روپیہ کے اور ۰ پانچ پانچ روپیہ ماہوار کے ہیں۔

صاحبزادہ صاحب کی رائے ہے کہ "جب تک اتالیق و اُستاد مسجدوں میں آکر فریضۂ نماز ادا نہ کریں گے، طلبا کی مسجدوں میں باقاعدہ حاضری کی توقع رکھنا فضول ہے" اس لیے انتظام دینیات کے شعبہ میں انھوں نے ایک قاعدہ بنا دیا ہے جسکی رو سے ٹیوٹروں کا فرض ہے کہ وہ اس بات کی نگرانی رکھیں کہ طلبا التزام کے ساتھ نمازمیں شریک ہوتے ہیں"۔ مگر یہ قاعدہ بھی محض کاغذ کی زینت بنا ہوا ہے۔

ٹیوٹر براہ راست وائس چانسلر کے ماتحت نہیں بلکہ انکی سفارش و انتخاب پرو وائس چانسلر کرتے ہیں اس لیے جب تک پرو وائس چانسلر صاحب انکی مؤثر نگرانی نہ کریں گے اس شعبہ میں کسی

قسم کی ترقی ہونا ناممکن ہے۔

مگر صاحبزادہ صاحب کو "اس معاملہ میں پرو وائس چانسلر صاحب سے کچھ مدد نہیں ملی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ جملہ انتظامات متعلق نماز اور دیگر امور متعلق تربیت مذہبی، حقیقت سے کوسوں دور رہیں"۔ اگرچہ اس شعبہ پر کافی روپیہ خرچ ہوتا ہے اور اس کی ظاہری نمود موجود ہے!

باب یازدہم - طلبا کی صحت -

یکم جنوری ۱۹۲۴ء کو نماز کے بعد صاحبزادہ صاحب اسپتال پہونچے تو عمارت کے اندر اور باہر کہیں صفائی نہ نظر آئی۔ صاحبزادہ صاحب اکثر اسپتال جاتے اور مریضوں کی آسایش اور تفریح کے ذرائع مہیا کرنے کی کوشش فرماتے رہے۔ اسپتال کے جنوب و مغرب میں آپ نے پھولوں کے چمن لگا دیے، سب کمروں پر قلعی کرادی، ہر کمرے میں آرام کرسیاں اور چھوٹی میزیں مہیا کیں اور غسل خانہ وصفائی کا خاص اہتمام کیا۔ اور اگر اپنی خرابی صحت کے باعث اُنھیں علیگڈھ سے غیر حاضر نہ رہنا پڑتا تو "آج ہر کمرے میں آسان اور دل بہلانے والی کتابوں کا کافی ذخیرہ نظر آتا"۔ بہرحال ایگزیکیٹو کونسل نے فرنیچر اور دیگر سامانِ آسایش کی منظوری دیدی ہے، جو اس سے بہت پہلے آجانا چاہیے تھا۔

صاحبزادہ صاحب نے یہ بھی انتظام کیا کہ "میڈیکل افسر طلبا کی تندرستی کی رپورٹ روزانہ دیا کریں .... ۱۹۲۵ء میں طلبا کا ڈاکٹری معائنہ شروع کردیا" لیکن یہ کوششیں بھی زیادہ کامیاب نہ ہوئیں۔

ڈاکٹر بٹ میڈیکل آفیسر نے ۱۹۲۴ء کے آخر میں یورپ سے واپس آنے اور علم میں اضافہ کرنے اور اپنی تنخواہ اور گریڈ بڑھانے جانے کی درخواست کی۔ صاحبزادہ صاحب نے اپنی رپورٹ میں میڈیکل آفیسر کی تجاویز سے اختلاف کیا۔ اور اُنکی ترقی کی بھی سفارش نہیں کی کیونکہ "وہ اُن شرائط کے خلاف تھی جن پر انکو یورپ جانے کے لیے خاص رخصت دی گئی تھی"۔ اس لیے ڈاکٹر بٹ کو اُن سے موافقت کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اُس پر مستزاد یہ ہوا کہ جون ۱۹۲۵ء میں پرو وائس چانسلر صاحب نے اُنھیں عارضی طور پر شعبۂ علم الحیوانات کا اعزازی معلم بنا دیا۔ اس اعزازی عہدہ کی بنا پر پہلے وہ اس صیغہ کے صدر منتخب ہوئے اور بعد کو اکیڈمک کونسل کے رکن ہوگئے۔ اور یہیں سے کورٹ کے رکن بنا دیے گئے۔" اور یہ سب کچھ وائس چانسلر سے بالا بالا ہوگیا" حالانکہ میڈیکل آفیسر براہِ راست اُنھیں کے ماتحت سمجھے جاتے ہیں۔

اپریل سنہ ۲۶ء میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر بٹ نے شہر میں ایک دواخانہ کھولا ہے جہاں روزانہ صبح و شام مطب کرتے ہیں۔ اُنکی ترقی کی درخواست کی فنانس کمیٹی نے اس شرط پہ تائید کی کہ وہ شہر میں مطب نہ کریں۔ جب معاملہ ایگزیکیٹو کونسل کے سامنے گیا تو اُس نے وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر اور خازن (شیخ عبداللہ صاحب) تین اصحاب کی ایک مجلس بنا دی کہ ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر رحمٰن اور ڈاکٹر سید الظفر خاں کی رائیں حاصل کرکے اس بات کا تصفیہ کرے کہ ڈاکٹر بٹ کو شہر میں مطب کرنے دیا جائے یا اس سے باز رکھا جائے۔ اور اسی کمیٹی کے فیصلے سے مشروط کرکے اُنکے گریڈ میں ترقی منظور کی۔

تحقیق واقعات کی غرض سے ۱۸- اپریل سنہ ۲۶ء کو ڈاکٹر بٹ کا بیان لیا گیا تو انھوں نے شہر میں مطب کرنے اور ایک گھنٹہ کے لیے صبح اور ۲۰ منٹ کے لیے سہ پہر کو وہاں جانے کا اقبال کیا۔ ساتھ ہی اُنھوں نے کہا کہ اُنکا کوئی دواخانہ وہاں نہیں ہے، بلکہ دواخانہ حاجی صالح خاں صاحب (رکن ایگزیکیٹو کونسل مسلم یونیورسٹی) کی ملک ہے جس میں وہ اپنے نسخے بھیجتے اور شہر کے دوسرے دواخانوں کی طرح اُس سے کمیشن پاتے ہیں۔ اس دواخانہ کے منیجر خواجہ غلام احمد ڈاکٹر صاحب کے خالہ زاد بھائی ہیں اور اُنھیں کی سفارش پہ حاجی صالح خاں صاحب نے اُنکو مقرر کیا ہے۔ کچھ عرصہ تک ڈاکٹر صاحب میڈیکل ہال کے لیے دوائیں منگانے میں مشورہ دیتے رہے۔ یونیورسٹی کے اسپتال کے لیے اس دواخانہ سے دوائیں خریدی گئیں جنکی مجموعی قیمت ستمبر سنہ ۲۵ء سے فروری سنہ ۲۶ء تک ۸۴۰ روپیہ تھی۔ میعادی بخار کے ٹیکہ لگانے کا سامان جرمنی سے اس میڈیکل ہال نے ڈاکٹر بٹ کی تحریک پہ منگایا۔

اب ضرورت محسوس کی گئی کہ حاجی صالح خاں صاحب کا بھی بیان لیا جائے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین اور شیخ عبداللہ دونوں اراکین مجلس سے خواہش کی گئی کہ ڈاکٹر بٹ اور حاجی صاحب کا بیان لیتے وقت موجود رہیں۔ ڈاکٹر صاحب تو کسی موقع پہ شریک نہ ہوئے البتہ شیخ عبداللہ صاحب کی موجودگی میں حاجی صاحب کا بیان ہوا جسکا خلاصہ یہ ہے:-

اورینٹل فارمیسی کے نام سے میڈیکل ہال میں نے کھولا ہے۔ ڈاکٹر بٹ کا مطب اس میڈیکل ہال سے پہلے کا کھلا ہوا ہے۔ اُنکو میری دوکان سے کوئی کمیشن نہیں ملا۔ میڈیکل ہال کا منیجر پہلے یونیورسٹی کا ہیڈ کمپونڈر عظیم الدین مقرر کیا گیا تھا جبکہ وہ رخصت پہ تھا۔ بعد کو غلام احمد جو ڈاکٹر بٹ کا عزیز ہے مقرر کیا گیا۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اُسکی سفارش نہیں کی۔ مسٹر [illegible]

کے دفتر میں ملازم ہیں انکے برادر نسبتی عبدالحی شام کو آکر دوکان جانچ لیتے ہیں۔ مگر اس کام کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ ڈاکٹر بٹ نے عبدالحی کی سفارش مجھ سے نہیں کی۔ ڈاکٹر بٹ کے نسخے میرے یہاں بندھتے ہیں اور میرا منیجر ضرورت کے وقت دواؤں کے منگانے میں اُن سے مشورہ کرلیتا ہے باقی وہ کوئی کام میرا نہیں کرتے۔

جن اصحاب کی رائے حاصل کرنے کی اس مجلس کو ہدایت کی گئی تھی اُن میں سے ڈاکٹر انصاری نے باوجود یاددہانی کے صاحبزادہ صاحب کو جواب نہیں دیا۔ ڈاکٹر سعید الظفر خاں نے یہ رائے دی کہ اگر یونیورسٹی کا میڈیکل آفیسر یونیورسٹی [illegible] کا ملازم ہے تو اُسے شہر میں مطب کرنے کی اجازت نہ دینا چاہیے۔ برطانیہ عظمیٰ کی میڈیکل کونسل ایسی اجازت نہیں دیتی گو ہندوستان کی میڈیکل کونسل اس بارے میں چشم پوشی کرتی ہے۔ خانگی مطب کی اجازت کا مفہوم یہ ہے کہ ڈاکٹر اپنے گھر پر یا اپنے نجی مطب میں بیٹھ کر لوگوں کو طبی مشورہ دے نہ یہ کہ دواساز کی دوکان پر بیٹھ کر کام کرے۔ جو تنخواہ یونیورسٹی دیتی ہے اُس پر کوئی قابل آدمی زیادہ دنوں قانع نہیں رہ سکتا۔ اس لیے دیگر مراعات کے ساتھ اسے خانگی مطب کی اجازت ہونا چاہیے مگر ایسے قواعد بنا دیے جائیں جنکے باعث میڈیکل آفیسر کے ساتھ فیاضانہ سلوک ہوتا رہے نیز وہ اپنے حقیقی فرائض یا طبی اصولوں کو نظر انداز نہ کرسکے۔

ڈاکٹر رحمٰن نے یہ رائے ظاہر کی کہ "یونیورسٹی کے میڈیکل اسٹاف کے لیے مناسب قواعد بنائے جائیں۔ میڈیکل آفیسر معقول تنخواہ پاتے ہیں، اس لیے مناسب شرائط کے ساتھ خانگی مطب کے سوا شہر میں مطب کا دفتر رکھنے کی اجازت نہ ہونا چاہیے اور نہ کسی دوا خانہ سے انکا تعلق ہونا چاہیے۔ یونیورسٹی کے لیے جو دوائیں خرید کی جائیں اُنکی منظوری کوئی افسر مجاز دیا کرے۔"

جب صاحبزادہ صاحب کی رپورٹ مع ڈاکٹروں کی مندرجہ بالا تحریری رایوں کے اکزیکیٹو کونسل میں پیش ہوئی تو انھوں نے چاہا کہ ڈاکٹر بٹ پر ایسی قیود عائد کردی جائیں کہ وہ اپنی ساری توجہ یونیورسٹی کے کام [illegible] صرف کریں کیونکہ بعض طلبا نے اُنکے عدم التفات کی شکایتیں بھی کی تھیں مگر ڈاکٹر ضیاءالدین [illegible] نے اُس سے مخالفت کی اور مسٹر حمید الدین خاں نے ترمیم پیش کی کہ ڈاکٹر بٹ [illegible] پائے کہ ان ڈاکٹروں کے سامنے جنکی رائیں اس رپورٹ میں درج ہیں وہ اپنا معاملہ [illegible] پیش کریں اور اراکین نے جنمیں اساتذہ اور حاجی صالح خاں شامل تھے کثرت رائے سے اس ترمیم کو منظور کیا۔

باب دوازدہم - یونیورسٹی ڈائننگ ہال -

صاحبزادہ صاحب نے کام شروع کرنے سے پہلے ہی روز ڈائننگ ہال اور باورچیخانہ کا معائنہ کیا اور اُنکو ناقابل اطمینان حالت میں پایا - دسمبر ۱۹۳۳ء میں ایک کمیٹی ڈائننگ ہال کی حالت کی تحقیقات کرنے اور مناسب اصلاحات تجویز کرنے کی غرض سے قائم کی گئی تھی صاحبزادہ صاحب کی صدارت میں اس کمیٹی نے کام کیا اور کچھ تجویزیں پیش کیں - ان تجاویز پر ایک سال تک عمل ہوا مگر بعد کو وہی قدیم طریقہ رائج کر دیا گیا - اور جو ٹھیکہ دار علیحدہ کیا گیا تھا وہی پھر بلا لیا گیا - یہاں بھی پرو وائس چانسلر کی حسب امداد کی ضرورت تھی وہ نہیں ملی -

صاحبزادہ صاحب اسے مناسب نہیں سمجھتے تھے کہ وہی ٹھیکہ دار جو یونیورسٹی کو سامان مہیا کرتا ہے اُن لوگوں کو بھی سامانِ خوراک مہیا کرے جو ڈائننگ ہال کے نگراں ہیں - اور یونیورسٹی کا ایک ملازم جو عملۂ تعلیمی کا رُکن ہے، یونیورسٹی، ور کالج کے باورچی خانوں کو دودھ مہیا کرے - چنانچہ انھوں نے اس طریقہ کو روک دیا تھا مگر بعد کو پھر اسی پر عملدرآمد ہونے لگا -

باب سیزدہم - ورزشی کھیل -

اس سلسلہ میں صاحبزادہ صاحب زیادہ کام نہیں کر سکے - تاہم اسکول اور کالج میں بوائے اسکاؤٹنگ رائج کرنے کی اور ڈرل کو جو بند کر دی گئی تھی از سرنو جاری کرنے کی کوشش کی - رائڈنگ اسکول پر خاص توجہ کی - چنانچہ پہلے کے مقابلہ میں ۴ کے بجائے اب ۱۴ گھوڑے ہیں - نیز بنوٹ اور بانک کے قدیم مردانہ فن رائج کیے گئے اور انکے سکھانے کے واسطے ایک اُستاد مقرر کیا گیا -

باب چہاردہم - عمارات -

گذشتہ تین سال کے اندر جو خاص عمارتیں تعمیر ہوئیں اُنکی تعداد اُن عمارات سے زائد ہے جو گذشتہ پندرہ بیس سال کے عرصہ میں بنائی گئیں -

سائنس لیبوریٹری میں احاطہ تعمیر ہونے کے علاوہ عثمانیہ ہوسٹل کے شمالی حصہ کے اوپر پانچ جدید وسیع لکچر روم تعمیر کیے گئے - ۱۹۳۵ء میں اسکول کی عمارت شروع کی گئی اور اب درمیانی ہال کے سوا باقی عمارت تیار ہے - اور اسی احاطہ میں پرائمری جماعتوں اور انٹی ساری کلاسوں کے لیے لکچر روم بنائے گئے ہیں -

عثمانی ہوسٹل کا شمالی حصہ مکمل ہوگیا اور جدید کمرے اضافہ کیے گئے - نصر اللہ خاں ہوسٹل

الناظم مسلم یونیورسٹی

تعمیر ہو چکا ہے۔ تین اور ہوسٹل عنقریب تیار ہو جائیں گے جن میں ۴۰۰ طالب علم رہ سکیں گے۔"

ہندو طلبہ کے لیے ایک جدید ہوسٹل زیر تعمیر ہے۔

ایک مکان ایسے اساتذہ کے لیے بنایا گیا ہے جو یورپین طرز معاشرت رکھتے ہیں سرسید کے زمانہ کی ایک عمارت تھی جسکی صرف کرسی اُٹھی تھی اور ۳۰ سال سے یوں ہی پڑی ہوئی تھی اب اُنھیں پُرانی بنیادوں پر تین کمرے بن گئے ہیں۔

اسسٹنٹ میڈیکل آفیسر کے لیے ایک نیا مکان تعمیر کیا گیا ہے جو چند روز میں تیار ہو جائے گا۔

۸- جدید مکان بنائے گئے ہیں جن میں سے چھ یونیورسٹی کے لکچراروں کے لیے ہیں اور دو انٹرمیجیٹ کالج کے اساتذہ کے لیے۔

انگلستان کے دلوچ کالج کے اسلحہ خانہ کے نمونہ پر ایک اسلحہ خانہ بنایا گیا ہے، جسکے ساتھ ہی یورپین سارجنٹ کا مکان ہے۔

سائنس کالج کا سنگ بنیاد گذشتہ نومبر میں نواب صاحب بھوپال نے رکھا۔ یہ عمارت دو سال میں امید ہے کہ تیار ہو جائے گی۔

ورزش خانہ کے لیے ایک مناسب نقشہ مرتب کیا گیا ہے اور جگہ منتخب کرلی گئی ہے۔

ملازمین کے رہنے کے واسطے کئی مکانات وغیرہ تعمیر کیے گئے۔

تندرستی کے واسطے نیا خطرہ - گذشتہ ۲۰ سال میں یونیورسٹی کے گرد و نواح کو بھٹوں وغیرہ کی خراب ہوا سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی اور جن لوگوں نے بھٹے کھولے یونیورسٹی کے لیے انکی اینٹیں خرید کرنے سے انکار کیا گیا۔ مگر اب یہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے منٹو سرکل کے قریب ایک قطعہ زمین ٹھیکہ پر لیا اور اُنکے بھائی نے تنہا یا اور کسی کی شرکت میں وہاں بھٹہ جاری کیا ہے۔ ایگزیکیٹو کونسل نے اگرچہ یہ تجویز قرار دی ہے کہ اس بھٹہ کی اینٹیں نہ خریدی جائیں مگر آثار اچھے نہیں نظر آتے۔

باب پانزدہم - تعلیمی شعبہ کے ارکین کو اسمبلی اور کونسل کے انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت

سنہ ۱۹۲۳ کے عام انتخابات میں ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب صوبہ کی کونسل کے اور ڈاکٹر لودی کریم حیدر اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ تین سال کے تجربہ نے صاحبزادہ صاحب کو یقین دلا دیا کہ یہ ایک غلطی تھی۔ ان لوگوں کی غیر حاضری سے کام میں ہرج ہوا۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے اساتذہ کے سامنے ایک ایسا مطمح نظر رکھ دیا ہے جو دنیاوی منافع کے لحاظ سے زیادہ دلفریب

معلوم ہوتا ہے اور اُنکے دماغ پر پریشان کن اثر ڈالتا ہے"۔

سنہ ۲۶ء کے انتخابات میں کئی اساتذہ نے شرکت کی درخواست دی۔ ڈاکٹر حیدر پھر اسمبلی کے اُمیدوار ہونا چاہتے تھے۔ ۱۳۔ جون سنہ ۲۶ء کو ایگزیکیٹو کونسل کے جلسہ میں اُنکی درخواست پر غور کیا گیا۔ صاحبزادہ صاحب نے اس موقع پر اپنی تفصیلی رائے کا اظہار کیا۔ جسکا ماحصل یہ ہے۔

کونسل کے روبرو امر فیصلہ طلب صرف یہ ہے کہ مطلوبہ اجازت کا دیا جانا یونیورسٹی کے مفاد کے مناسب ہوگا یا نہیں —— گذشتہ انتخابات کے موقع پر ڈاکٹر حیدر کو اسمبلی میں شرکت کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اب ضروری ہے کہ سابقہ اجازت کے نتائج پیش نظر رہیں۔ جن بیرونی ممتحنوں نے گذشتہ سال اقتصادیات کے طلبا کا ایم اے میں امتحان لیا تھا اُن کی رپورٹوں سے (جو پڑھ کر سنا دی گئیں) ظاہر ہے کہ نتیجہ بہت خراب رہا۔ اس سال کے امتحانات سے بھی یہی پتہ چلتا ہے۔ ۱۲ میں سے صرف ۲ کامیاب ہوئے اور دونوں تیسرے درجہ میں۔ اس ابتری کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس محکمہ کے سب سے زیادہ مشاہرہ پانے والے معلم ڈاکٹر حیدر یونیورسٹی کے کام پر اپنا پورا وقت و توجہ نہ صرف کر سکے۔ ڈاکٹر حیدر کے اسمبلی میں جانے کی وجہ سے یونیورسٹی کے شعبۂ اقتصادیات کو جو نقصان عظیم پہنچا اُسکی بنا پر مناسب نہیں کہ دوبارہ اُنکو اجازت دی جائے۔

مرکزی اور صوبہ کی قانون ساز مجلسوں میں یقیناً ہمارے قومی نمایندوں کی ضرورت ہے مگر یونیورسٹی کا نقصان کرکے اس ضرورت کو پورا نہ کرنا چاہیے۔ اس لیے آیندہ سالوں میں کسی شعبہ کے ناظم اعلیٰ، پرو وائس چانسلر، یا کسی مضمون کے معلم اعلیٰ کو کونسل اور اسمبلی میں جانے کی اجازت ہرگز نہ دی جائے۔ اسمبلی اور صوبہ کی کونسل میں ہمارے طلباء سابق موجود ہیں جو یونیورسٹی کے حقوق و اغراض کا پورا پورا لحاظ کرتے ہیں۔ قوم کو ایسے اساتذہ کی زیادہ ضرورت ہے جو اس واحد قومی مرکزی یونیورسٹی کے طلبہ پر پوری توجہ صرف کریں اور وہ ہرگز مجالس قانون ساز کی نمایندگی کے لیے ہمارے اساتذہ کی طلبگار نہیں ہے۔ بلکہ اس قومی خدمت کے لیے ایسے تعلیم یافتہ اصحاب موجود ہیں جو آزاد پیشوں میں کام کرتے اور ملکی کاموں کی انجام دہی کی زیادہ اہلیت رکھتے ہیں۔ یونیورسٹی کے اساتذہ میں سے دوسرے بھی انتخابات میں شریک ہونا چاہتے ہیں اور یہ درخواست منظور کر لی جائے تو اُنکی درخواستوں کو نامنظور کرنا مشکل ہوگا۔

مگر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے اسکے مخالف تقریر کی اور اساتذہ کی کثرت رائے سے

کونسل نے درخواست منظور کرلی۔ تاریخ کے معلم مسٹر حبیب کو بھی بعد میں اجازت دیدی گئی۔
مسٹر حبیب کا معاملہ چونکہ ایگزیکیٹو کونسل میں بھیجا پڑا اس لیے ۲۱۔ دسمبر کو یہ تحریر لکھی گئی۔

مسٹر حبیب کے معاملہ پر وائس چانسلر کی تحریر

یونیورسٹی کے معلم تاریخ مسٹر حبیب کو ۵۔ جولائی کے جلسہ میں انتخاب میں شرکت کی اجازت دی گئی تھی۔ تعطیل کلاں میں وہ اپنے لیے رائیں حاصل کرنے کا کام کرتے رہے۔ یکم اکتوبر کو یونیورسٹی کھلی تو وہ غیر حاضر تھے۔ ۶ اکتوبر کو انھوں نے ۷ روز کی رخصت اتفاقیہ کی درخواست بھیجی جسے پرووائس چانسلر صاحب نے منظور کرلیا۔ انھوں نے پھر اس رخصت اتفاقیہ میں توسیع چاہی لیکن چونکہ رخصت اتفاقیہ واجب نہ تھی اس لیے ایگزیکیٹو کونسل نے انکی رخصت کو رعایتی رخصت میں بدل دیا۔ اور ۸۔ اکتوبر سے ۳۱۔ اکتوبر تک کی رخصت منظور کی۔ مسٹر حبیب کو پہلی نومبر سے اپنا کام شروع کردینا چاہیے تھا بجائے اسکے ۴۔ نومبر کو پرووائس چانسلر کے نام اس مضمون کا تار آیا کہ ۲۷۔ نومبر تک رخصت میں توسیع کردی جائے۔ دو تین دن کے لیے بھی آنے میں سارا کام ابتر ہو جائیگا۔

پرووائس چانسلر کو رعایتی رخصت دینے یا اُس میں توسیع کرنے کا حق نہ تھا اور یہ تار وائس چانسلر کے پاس بھیجا گیا۔ جو ۱۰۔ نومبر کو پیش ہوا۔ اُسپر یہ حکم لکھا گیا:

"جب تک مقصد نہ معلوم ہو رخصت نہیں منظور کی جا سکتی۔ کام میں بہت ہرج ہو چکا ہے"

یکم دسمبر تک مسٹر حبیب اپنے کام پر واپس نہیں آئے۔ اس طرح کل دو مہینے شعبۂ تاریخ کا وہ کام انجام نہ پاسکا جو اُن سے متعلق تھا۔ اب پرووائس چانسلر صاحب نے بیان کیا ہے کہ "مسٹر حبیب یہاں ۱۲ نومبر کو آئے اور ۲۰ نومبر تک رہے اسکے بعد وہ چلے گئے۔ کیونکہ ۲۲ تک یونیورسٹی کی تعطیل تھی۔ ۲۲۔ کو میں نے انھیں ۷ روز کی اتفاقیہ رخصت دی"

اس طریقہ پر ۲۹۔ نومبر تک انکی رخصت ہوگئی۔ مگر ۳۰۔ نومبر کی غیر حاضری کی بابت پرووائس چانسلر صاحب کچھ نہیں کہتے کیونکہ رجسٹرار صاحب کی رپورٹ کے بموجب یکم دسمبر کو مسٹر حبیب نے کام شروع کیا۔

یہ تو ۱۲۔ نومبر کے بعد کا حساب تھا۔ اُس سے پہلے کا حال ملاحظہ ہو: "ایگزیکیٹو کونسل نے مسٹر حبیب کو ۳۱۔ اکتوبر تک رخصت دی تھی اور یہ رعایتی رخصت تھی۔ فقرہ ۲۱ دفعہ ۹ باب ۱۱ کے مطابق اتفاقیہ اور علالت کی رخصت کی درخواستوں کے علاوہ جملہ درخواستیں رجسٹرار کے پاس رخصت شروع ہونے کی تاریخ سے کم از کم ۱۵ روز قبل پہونچنا چاہیے۔"

لہذا مسٹر حبیب اگر ۳۱-اکتوبر کے بعد توسیع رخصت کے خواہاں تھے تو ۱۶-اکتوبر تک اُنکی درخواست آنا چاہیے تھی، مگر وہ رخصت ختم ہو جانے کے چار روز بعد تک خبر نہ ہوئے۔ یکم نومبر سے بغیر رخصت حاصل کیے غیر حاضر رہنے کی وجہ سے اُن کا معاملہ صریحاً ایگزیکیٹو رگولیشن باب نہم کے نقرہ ۳۰ کے تحت آتا ہے۔ کیونکہ انکی غیر حاضری بالقصد تھی کسی قسم کی مجبوری نہ تھی۔ مسٹر حبیب نے مذکورۂ بالا نقرہ ہی کی خلاف ورزی نہیں کی بلکہ انکے معاملہ میں ایگزیکیٹو رگولیشن باب یازدہم کے نقرہ جات ۳۰-۳۲ بھی عائد ہوتے ہیں کیونکہ وہ پہلے سے مزید رخصت حاصل کیے بغیر ۱۲-نومبر تک غیر حاضر رہے۔ پرو وائس چانسلر کے نام تار یا خط بھیج دینے سے قانون کے شرائط پورے نہیں ہوتے۔ رخصت ختم ہو جانے کے بعد ایک ہفتہ کے اندر مسٹر حبیب اپنے کام پر واپس نہیں آئے بدیں وجہ وہ اُس تدارک کے مستحق ہیں جو اُس نقرہ میں درج ہے۔

اُن کا جواب کونسل کے روبرو پیش ہے۔ اُنکا انداز تحریر حیرت انگیز ہے۔ جسے اُن کے لڑکپن پر محمول کرنا چاہیے۔ اُمید ہے کہ سکون کے ساتھ غور کرنے پر اُنھیں اپنی غلطیوں کا یقین آجائے گا۔

اس تحریر کے ملاحظہ کے بعد کونسل نے حسب ذیل قرارداد منظور کی :-

"پرو وائس چانسلر صاحب نے تجویز کیا کہ مسٹر حبیب کو ۴ روز کی (یکم لغایۃ ۴ نومبر) رخصت خاص بغیر تنخواہ اور ۷ روز کی رعایتی رخصت دی جائے۔ مگر بالآخر حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی۔

تجویز ہوا کہ مسٹر حبیب بغیر رخصت حاصل کیے ہوئے یکم نومبر سے ۴ نومبر تک غیر حاضر رہے اور اس زمانہ تک اُنھوں نے کوئی درخواست نہ بھیجی اس واسطے اُس زمانہ میں اُنکو بغیر رخصت حاصل کیے غیر حاضر متصور کیا جائیگا۔ اور بدیں وجہ اُنکو اس عرصہ کی کچھ تنخواہ نہیں ملے گی۔

اسکے بعد یہ تجویز ہوا کہ مسٹر حبیب کو ۵ لغایۃ ۱۱-نومبر رعایتی رخصت دی جائے بشرطیکہ وائس چانسلر کو جو جواب انھوں نے لکھا ہے اُسکا آخری نقرہ وہ واپس لیں۔"

کونسل یونیورسٹی کے حقوق کی حفاظت یوں کیا کرتی ہے!

باب شانزدہم - گذشتہ تین ماہ میں وائس چانسلر کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا۔

۲-اکتوبر کو صاحبزادہ صاحب منصوری سے علیگڈھ واپس آئے۔ تندرستی بہتر تھی اس لیے دوبارہ انتخاب میں کوشش کرنے کا ارادہ کرکے کورٹ کے آراکین کو مطلع کیا۔ مشہور تھا کہ نواب سر مزمل اللہ خاں صاحب کے انتخاب کی باقاعدہ کوشش جاری ہے۔ اُنکو اسکا پورا حق حاصل تھا

اور انکی سعی کی کوئی مخالفت نہیں کی گئی - مگر افسوس ہے کہ اُنکے دوستوں اور معاونوں نے قابلِ اعتراض طریقے اختیار کیے جیسا کہ واقعات ذیل سے معلوم ہوگا -

چار گمنام مطبوعہ چٹھیاں جو "نیازمند خصوصی" کی طرف سے لکھی گئی تھیں کورٹ کے ارکین میں تقسیم ہوئیں اور اخباروں میں بھی چھپوائی گئیں - اسکے بعد ایک مطبوعہ گمنام خط "معین حق" کی طرف سے نکلا - پہلی چار چٹھیوں میں صاحبزادہ صاحب کے عہد کار پر حملہ کرنے کی غرض سے طنزیہ لہجہ میں سوالات کیے گئے تھے اور پانچویں خط میں جو جھوٹی اور بے بنیاد باتوں سے بُھرے انکی گذشتہ زندگی اور علیگڈھ کالج سے اُنکے تعلق پر حملہ تھا - نواب عبدالقیوم صاحب پشاوری کی رائے سے ان گمنام تحریروں کے کاتب کا پتہ لگانے کی کوشش کی گئی تو چٹھی نمبر ۱ و نمبر ۳ کا ایک ایک نسخہ ہاتھ آیا جن پر مولوی مقتدیٰ خاں شروانی موجودہ منیجر اُردو سیکشن یونیورسٹی پریس کے دستخط تھے -

مولوی مقتدیٰ خاں کئی سال سے یونیورسٹی پریس کے منیجر ہیں - کام قابل اطمینان نہ ہونے کی وجہ سے شیخ عبداللہ صاحب (خازن) نے تقریباً دو سال ہوے ایک قابل منیجر کے لیے اشتہار دیا اُنھوں نے کسی شخص کو منتخب نہیں کیا تو احیدالدین صاحب کے امتحاناً تقرر کی سفارش کی گئی اور ستمبر ۲۵ء میں وہ انگریزی صیغہ کے منیجر مقرر ہوے - مقتدیٰ خاں صاحب کو یہ بات ناگوار ہوئی اور اُسی وقت سے صاحبزادہ کے ساتھ اُن کا طرز عمل بدل گیا -

مقتدیٰ خاں صاحب محض شروانی خاندان کے ایک رکن ہی نہیں بلکہ نواب سر مزمل اللہ خاں صاحب کے قریبی رشتہ دار بھی ہیں - گذشتہ نومبر میں نواب صاحب نے کانفرنس کی جانب سے انہیں کورٹ کا رکن بنانے کی تجویز پیش کی تھی - دو ماہ سے وہ نواب صاحب کے اخبار علیگڈھ میل کے آنریری منیجر ہیں -

۲۲ - دسمبر کو صاحبزادہ صاحب نے مولوی مقتدیٰ خاں کو بُلایا اور مولوی حبیب اللہ خاں صاحب کی موجودگی میں مسٹر سجاد حیدر رجسٹرار نے اُن کا بیان قلمبند کیا - جس میں اُنھوں نے نواب سر مزمل اللہ خاں صاحب سے اپنی قریبی رشتہ داری کا اعتراف کیا - چٹھی نمبر ۱ - ۲ - ۳ و ۴ کے متعلق تسلیم کیا کہ اُنھوں نے لکھیں اور چھپوا کر نومبر و دسمبر میں تقسیم کیں - اور احیدالدین صاحب کے منیجر مقرر کیے جانے سے جو ناگواری ہوئی تھی اُس کا بھی اقبال کیا - مگر معین حق کے نام سے جو خط شایع کیا گیا اُسکی تحریر سے انکار کیا - اور باوجودیکہ تحقیقات سے اُسکے راقم کا پتہ اُنکو مل گیا تھا اس عذر پر نام بتانے سے دریغ کیا کہ ممکن ہے اُنکی تحقیقات صحیح نہ ہو -

"معین حق" کے نام سے جو خط شایع ہوا اُس کا نام بتانے سے مقتدیٰ خاں صاحب نے اگرچہ انکار
کیا مگر ہر شخص یہی نتیجہ نکالے گا کہ "معین حق" کا تعلق اُسی جماعت سے ہے جس میں مقتدیٰ خاں صاحب ہیں
مقتدیٰ خاں صاحب نے جو یونیورسٹی کے پورے وقت کے تنخواہ دار ملازم ہیں چونکہ ان چٹھیوں
کی تحریر کا اقبال کر لیا اس لیے صاحبزادہ صاحب نے اکزیکیٹو کونسل کے روبرو اس معاملہ کو پیش کر دیا۔
وہاں بحث و مباحثہ کے بعد ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کی تحریک اور حاجی صالح خاں و اساتذہ کی کثرتِ
رائے سے یہ قرارداد منظور ہوئی۔

کونسل حسب ذیل تجویز منظور کرتی ہے جسکے محرک پرو وائس چانسلر صاحب اور موید مولوی سلیمان
اشرف صاحب ہیں "کونسل یونیورسٹی کے تنخواہ دار ملازم کے گمنام چٹھیاں لکھنے کے فعل پر جس میں
یونیورسٹی کے حکام کے کام پر نکتہ چینی کی گئی ہے سختی کے ساتھ ملامت کرتی ہے"
"یہ بھی تجویز کیا گیا کہ چونکہ اس معاملہ میں چند ایسی باتیں ہیں جنکی توضیح کی ضرورت ہے اسلیے
یہ معاملہ کونسل کے آیندہ اجلاس تک بغرض مزید تجویز ملتوی کیا جاتا ہے۔"

کونسل نے یوں اپنا فرض انجام دیا اور اُس معاملہ کا تدارک کیا جس میں وائس چانسلر کی منزلت
کے علاوہ حکومت اور انتظام کے اصول بھی خطرہ میں تھے۔ پرو وائس چانسلر نے سب خیالوں کو نظر انداز
کر کے باوجودیکہ معاملہ بالکل صاف تھا اور تمام واقعات متعلقہ کونسل کے روبرو موجود تھے، اپنے ساتھیوں
سے ایک مبہم قرارداد منظور کرا کے معاملہ کو سرِ دست دبا دیا۔

باب ہفتدہم۔ کورٹ اور یونیورسٹی کی دوسری جماعتوں کے ارکین کا انتخاب۔

کورٹ اور اکزیکیٹو کونسل قوم کی خواہشات اور خیالات ظاہر کرنے کے لیے اُسکے نمایندے ہیں۔
لیکن پرو وائس چانسلر اور اُنکے دوستوں نے انتخابات کے سلسلہ میں جو طریقے اختیار کیے ہیں اُس
سے مستقبل کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حسب ذیل جماعتوں کی جانب سے اِسسال کچھ ارکین منتخب کیے جانے والے تھے۔

(۱) معطیان
(۲) رجسٹرڈ گریجویٹ
(۳) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
(۴) اسلامیہ کالج
(۵) علمی کام کرنے والے اشخاص
(۶) علما

مذکورۂ بالا جماعتوں کے نمایندوں کے منتخب کرنے کے لیے رائیں حاصل کرنے کا باقاعدہ انتظام تھا۔
کورٹ کے اکثر ارکین کو علم ہوگا کہ بعض امیدواروں کے لیے جنکے نام پہلے سے ایک فہرست میں درج

سے تھے انھیں کن طریقوں پر ترغیب دیگئی - پرو وائس چانسلر صاحب جو رائیں جانچنے والی کمیٹی کے رکن نہ تھے معطیان کی رایوں کی جانچ کرتے وقت اس کمیٹی کی کارروائی میں تین دن تک برابر شریک اور ذاتی دلچسپی لیتے رہے - معطیان کے بارہ نمایندوں میں سے تین اس ضلع کے شروانی خاندان سے منتخب ہوے اور سر علی امام، راجہ ابوجعفر، نواب طالب مہدی خاں اور چودھری شہاب الدین جیسے اصحاب رکن نہیں بنائے گئے - اسی طرح بعض مشہور طلباے قدیم چھوڑ دیے گئے -

آخری تین جماعتوں کے نمایندوں کا انتخاب کورٹ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۴ - دسمبر ۱۹۲۶ء میں ہونے والا تھا - بعض ارکین کو چھوٹے چھوٹے کاغذوں کے بنڈل اسٹریچی ہال کے برآمدہ میں دیے گئے جن پر بعض منتخب امیدواروں کے نام چھپے ہوے تھے - ایک بنڈل مسٹر محمد یعقوب ایم ایل اے کو بھی دیا گیا - اسی طرح بعض مخصوص اشخاص کے انتخاب کے لیے ہر قسم کا پروپاغنڈا کیا گیا - اور صاف ظاہر ہے کہ آیندہ مدت میں عملی طور پر کورٹ پرو وائس چانسلر کے زیر اثر رہے گا -

باب ہشتدہم - نظم ونسق پر نظر ثانی کی ضرورت -

صاحبزادہ صاحب کی رائے میں دسمبر ۱۹۲۰ء میں جو نیا قانون نافذ ہوا، موجودہ ناقابل اطمینان حالت کا بہت کچھ ذمہ دار ہے - سرسید علیہ الرحمہ نے علیگڈھ کالج کیلیے ملک اور جماعت کی حالت کے مناسب انتظام تجویز کیا تھا - نیا قانون بنانے والوں نے اُس طریقہ کو بالکل نظرانداز کردیا جس سے گذشتہ زمانہ میں ایسے شاندار نتائج پیدا ہوے تھے - بہرحال یہ نیا قانون چھ سال سے نافذ ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ نتائج کے لحاظ سے غور کیا جائے کہ کہاں تک وہ اس درسگاہ کے لیے موزوں ہے - تحقیقات کی ضرورت سے متعلق کوئی اختلاف رائے نہیں ہے - ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے چند ماہ ہوے شملہ میں مسٹر ریچی سے اس ضرورت کا اعتراف کیا - صرف سوال یہ ہے کہ یہ تحقیقات گورنمنٹ کرے یا یونیورسٹی کے حکام - صاحبزادہ صاحب نے اس بارے میں گورنمنٹ کو جو خط لکھا ہے اُسکا ضروری خلاصہ درج ذیل ہے -

۱ - گذشتہ اگست وستمبر میں منصوری پر اور ۶ - اکتوبر کو علی گڈھ آکر افواہاً سنا کہ گورنمنٹ یونیورسٹی کی جانچ کرنا چاہتی ہے - ۲۳ - اکتوبر کو مسٹر ریچی سے دہلی میں ملاقات کی گئی تو انھوں نے کہا کہ وہ شملہ میں ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب سے ملے تھے اور ان سے کہہ دیا تھا کہ گورنمنٹ امتحانات کے نتائج سے مطمئن نہیں ہے اور اسکے متعلق تحقیقات کرنا چاہتی ہے - ڈاکٹر ضیاء الدین نے وعدہ کیا کہ اس قسم

کی تحقیقات کی تحریک کونسل میں کی جائیگی اور گورنمنٹ ڈاکٹر صاحب کے جواب کا انتظار کر رہی ہے۔ مسٹر رچی نے یہ بھی کہا کہ اس ملاقات کی ایک تحریری یادداشت بھی ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب کے پاس بھیجدی ہے۔ علیگڈھ واپس آکر ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب سے دریافت کیا اور مسٹر رچی نے جو تحریر اُنکو بھیجی تھی وہ دیکھنے کے لیے طلب کی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے مسٹر رچی سے ملاقات کا ہونا اور اس تحریر کا وصول پانا تسلیم کیا مگر وہ تحریر نہ دکھا سکے۔ تحقیقات کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے اعتراف کیا کہ اُنھوں نے مسٹر رچی سے وعدہ کیا ہے کہ کونسل میں اس امر کی تحریک کریں گے کہ گورنمنٹ کے نمایندوں کی اعانت سے یہ تحقیقات کی جائے۔ مگر نہ تو میرے استفسار سے قبل ڈاکٹر صاحب نے مسٹر رچی سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا اور نہ اب تک کونسل میں تحقیقات کی تجویز پیش کی ہے۔

۲ —— میں نے مسٹر رچی سے جو کچھ معلوم ہوا اُسے ایگزیکیٹو کونسل کے اراکین سے کہدیا بعض صاحب چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ تحقیقات کرے اور بعض کی خواہش ہے کہ یونیورسٹی کے حکام تحقیقات کریں میرے اپنے خیالات ذیل میں درج ہیں۔

(۱) تحقیقات کی نوعیت اور طریقہ خواہ کچھ ہو، اُسکا مقصد یونیورسٹی کی اصلاح میں اعانت ہونا چاہیے۔ یہ اگرچہ مسلمانوں کی یونیورسٹی ہے لیکن چند خاص حالتوں میں یہ قومی اور سرکاری یونیورسٹی بھی ہے۔ صرف اغماض و ناپسندیدگی سے کام نہیں چلے گا بلکہ مقصد یہ ہونا چاہیے کہ یونیورسٹی کی حقیقی ترقی کے لیے عملی ذرائع اختیار کیے جائیں۔

(۲) اگر تحقیقات کا یہ مقصد ہو تو ایسے ماہرین فن تعلیم یا دوسرے اشخاص کو یہ کام سپرد کرنا چاہیے جو آزاد، غیر جانبدار اور اہل ہوں۔ جنکے دماغ عدل گستر اور دل دردمند ہوں۔

(۳) اس تحقیقات کی نوعیت اور منشا کیا ہونا چاہیے۔ ہماری یونیورسٹی پبلک کی امداد سے چلتی ہے۔ یہاں گورنمنٹ کا تحقیقات کرنا خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اگر خاص صورتیں موجود ہیں تو پھر مکمل اور پوری تحقیقات ہونا چاہیے کہ آیندہ اس قسم کی ضرورت نہ پیش آئے۔

(۴) دیگر امور کے علاوہ جدید نظام جس پر دسمبر ۲۰ء سے عملدرآمد ہے کامل غور اور جانچ کا مستحق ہے کیونکہ اسکے بعض خاص ضوابط سابقہ عام قواعد کے قطعی منافی ہیں۔

ان خیالات کو پیش نظر رکھکر گورنمنٹ کی تحقیقات کو پسند کرنے اور اسکے روبرو چند ایسے واقعات و خیالات بیان کرنے میں مجھے پس و پیش نہ ہو گا جو تحقیقات کی نوعیت و ماہیت معلوم کرنے میں مفید ہوں۔

۳ ـــــ ۱۸۷۵ء سے اس درسگاہ کا نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیائی درس گاہوں میں اعلیٰ درجہ رہا ہے۔ سرولیم میرس گورنر صوبجات متحدہ نے گذشتہ فروری میں کہا تھا کہ

"..... جس زمانہ میں پہلی بار علیگڈھ کا نام میں نے سنا تھا اُس وقت اصلاحِ مسلمانان کی تحریک کے لیے اسے آبدار، تیز اور تپائے ہوئے بھالے کی آنی کہ سکتے تھے۔ جب میں اس صوبہ میں آیا تو علی گڈھ کے لڑکے دیکھتے ہی پہچانے جاسکتے تھے۔ اُن میں ایک طرح کی ہوشیاری، چستی، قواعد کی پابندی اور تہذیب تھی جو اُنھیں ممتاز کرتی تھی جب کبھی طاعون یا قحط وغیرہ کے سلسلہ میں کوئی اصلی کام کرنے کا موقع آتا تھا تو یہی لوگ طلب کیے جاتے تھے مخصوص قوتوں کی بدولت ایک خاص جماعت ظہور پذیر ہوگئی ہے ......"

دیگر اعلیٰ حکام اور مشہور ماہرین فن کی رائیں بھی اسی قسم کی پیش کی جاسکتی ہیں۔ یونیورسٹی بنجانے تک اس درسگاہ کی کم وبیش یہی شہرت رہی۔ اور یونیورسٹی ۱۹۲۰ء کے آخر میں وجود میں آئی۔

۴ - اب گزشتہ چند سال کے عرصہ میں کیا بات ہوئی جس نے ہمارے طلبا کی عام تہذیب وحالت میں ایسی تبدیلی کردی کہ گورنمنٹ نے تحقیقات کرنے کی ضرورت ظاہر کی۔ جو تبدیلی اب پیدا ہوئی ہے ہمارے قومی حقوق طالب ہیں کہ اسکے وجوہ کی مکمل وجانبدارانہ تحقیقات کی جائے حکام ہماری حالت کے زوال کو اُن اختیارات کے بیجا استعمال پر محمول کرسکتے ہیں جو ہمیں امتحانات لینے اور سندیں دینے کے بارے میں عطا کیے گئے ہیں۔ لیکن امتحان یونیورسٹی کی تعلیم میں ایک علیٰ منزل کی چیز ہے۔ اختیارات کا جائز یا بیجا استعمال بڑی حد تک اس تعلیم کی کیفیت پر منحصر ہے جو تیاری کے زمانہ میں دی گئی اور جسکے بعد سندیں دینے کے لیے امتحان لیا جاتا ہے۔ اسلیے اُن حالات پر غور کرنا زیادہ ضروری ہے جن کے اندر طلبا امتحانات کے واسطے تیار کیے جاتے ہیں۔ یہیں سے ہم حکمراں جماعت اور معلمین کے اُن حالات و اختیارات پر غور کرنے کی طرف رجوع ہوتے ہیں جو نئے قوانین سے پیدا ہوے ہیں۔

۵ ـــــ ۱۸۸۹ء تک سب کام کالج فنڈ کمیٹی کے سکرٹری کرتے رہے۔ یہ کمیٹی اس درسگاہ کی سب سے بڑی حکمراں مجلس تھی۔ ۱۸۸۹ء میں کالج کا انتظام ٹرسٹیوں کے سپرد کیا گیا۔ سرسید کی زندگی تک عملاً سب کام اُنھیں کی مرضی کے مطابق ہوتا تھا۔ قواعد کے رو سے معلمین کو حکمراں مجلس میں کوئی اختیار یا حق نہ تھا۔ اور نہ کوئی معلم ٹرسٹی بن سکتا تھا۔ ۱۹۰۹ء کے قریب جب کام زیادہ ہو گیا تو ایک سنڈیکیٹ بنائی گئی۔ جس میں ۱۱ ٹرسٹیوں کے علاوہ پرنسپل، ہیڈ ماسٹر اور ایک ہندوستانی

پروفیسر شامل تھے ۔ سنڈیکیٹ کی نامزدگی سکرٹری کرتا تھا اور اُسکے جملہ فیصلے ٹرسٹیوں کی منظوری کے محتاج رہتے تھے ۔ جملہ معاملات ٹرسٹیوں اور سکرٹری یعنی قوم کے نمایندوں کے اختیار میں تھے ۔ اب نئے قوانین کے بموجب کورٹ، ایگزیکیٹو کونسل اور اکیڈمک کونسل بنگئی ہیں ۔ کورٹ سب سے بڑی حکمران مجلس کہی جاتی ہے مگر چانسلر، پرو چانسلر یا وائس چانسلر کے انتخاب، اور پرو وائس چانسلر اور رجسٹرار کی تقرری کے علاوہ اسکے اصلی اختیارات بہت کم ہیں ۔ پہلے درسگاہ کا کوئی ملازم حکمران مجلس کا رُکن نہیں ہو سکتا تھا، جو مالیہ اور تقرری وغیرہ جیسے ضروری امور میں مختار تھی ۔ نئے قانون کے بموجب ۵ معلمین اکیڈمک کونسل کی جانب سے کورٹ کے رُکن ہیں اور چونکہ بیرونی ارکین تھوڑے آتے ہیں اس لیے ایسے اہم مسائل کا تصفیہ جیسے وائس چانسلر کا انتخاب یا پرو وائس چانسلر اور رجسٹرار کا تقرر زیادہ تر معلمین کی رائے پر منحصر ہے ۔ موجودہ قانون کی رو سے یونیورسٹی کا ایک محرر بھی کورٹ کا رُکن ہو سکتا اور وائس چانسلر کے انتخاب میں رائے دے سکتا ہے ۔ کورٹ کے جلسہ کا نصاب (کورم) ۲۵ ہے اور قانون یہی رہا تو کچھ دنوں میں یونیورسٹی کے ملازمین اتنی تعداد میں کورٹ کے رکن ہو جائیں گے کہ اُنکی تعداد سے نصاب پورا ہو جائے ۔ جب یونیورسٹی پریس کے شعبۂ اُردو کے منیجر کورٹ کے رکن تجویز ہوئے ہیں تو دوسرے ملازمین بھی جلد اس مثال کی تقلید کریں گے ۔ ایگزیکیٹو کونسل کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب ہے ۔ یونیورسٹی کا مالیہ، تقرری، تعمیرات، اور انتظام کلیتہً اُسکے اختیار میں ہیں ۔ میرے عہد میں اسکے ۴۸ جلسے ہوئے اور ایک جلسہ کے سوا سب میں معلمین کی کثرت رہی ۔

(اسکے بعد ایک نقشہ دیا گیا ہے جس میں ہر جلسہ کی تاریخ اور اس میں کورٹ اور اکیڈمک کونسل کے نمایندوں کی تعداد درج کی گئی ہے ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکتوبر ۲۴ء کے سوا باقی تمام جلسوں میں اکیڈمک کونسل کے نمایندوں یعنی معلمین کی تعداد زیادہ رہی)

یہ سچ ہے کہ ایگزیکیٹو کونسل میں کورٹ کے نمایندے اکیڈمک کونسل کے نمایندوں سے زیادہ ہیں ۔ مگر اکیڈمک کونسل کے ارکین (یعنی اساتذہ) علیگڈھ میں رہتے ہیں اور سب کے سب ہر جلسہ میں شریک ہوسکتے ہیں ۔ بخلاف کورٹ کے نمایندوں کے جن میں سے بعض بمبئی، حیدرآباد اور کلکتہ جیسے دُور دراز مقامات میں سکونت رکھتے ہیں اور زیادہ تر علیگڈھ سے باہر رہتے ہیں ۔

ـــــــ ایک مثال پیش کی جاتی ہے ۔ ڈاکٹر ضیاء الدین اور ڈاکٹر کرم حیدر صاحبان کو

میرے وائس چانسلر منتخب ہونے سے پیشتر کونسل اور اسمبلی میں شریک ہونے کی اجازت دیدی گئی تھی۔ کام سے انکی غیر حاضری یونیورسٹی کے لیے مضر تھی۔ شعبۂ اقتصادیات کے امتحانات کے نتائج سے صریحًا وہ نقصان ظاہر ہے جو ڈاکٹر حیدر کی غیر حاضری سے ہوا۔ اس سال اُنھوں نے پھر اسی قسم کی اجازت طلب کی۔ میں نے صاف طور پر اس سے اختلاف کیا۔ مگر ایگزیکیٹو کونسل میں یہ معاملہ پیش ہوا تو کثرتِ رائے سے جو کلیتہً اساتذہ پر مشتمل تھی اُنکو اجازت دیدی گئی۔ اور اُنھیں کو نہیں بلکہ مسٹر حبیب تاریخ کے معلم کو بھی کونسل میں جانے کی اجازت دیدی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ۱۰ اکتوبر سے ۲۵ اکتوبر تک اپنے لیے رائیں حاصل کرنے کی کوشش میں کام سے غیر حاضر رہے۔ میرے علم میں کورٹ اور قوم کے نمایندے اجازت دینے کے خلاف ہیں مگر چونکہ معلمین کی کونسل میں اصلی کثرت ہے وہ اپنی من مانی کارروائی کرسکتے ہیں...... اس سلسلہ میں بنارس یونیورسٹی کے قانون کا ذکر مناسب ہوگا۔ وہاں کا تعلیمی عملہ ہمارے یہاں سے زائد ہے پھر بھی ۱۳ میں سے کونسل کے صرف ۲ رکن اساتذہ ہیں۔ اور ہماری کونسل کے ۳۰ ارکان میں سے ۸ اساتذہ ہیں۔ اسی طرح تقررات کی مجلس میں وہاں ۱۰ میں سے ۵ کورٹ کے رکن ہیں اور ہمارے یہاں چند ماہ قبل وائس چانسلر تک اس مجلس کا رُکن نہ تھا۔ پوری مجلس میں اساتذہ ہی تھے۔ اب بڑی مشکل سے وائس چانسلر اور خازن کا مجلس میں اضافہ ہوا ہے۔ قواعد کے بموجب مجلس تقررات کی سفارش پر ایگزیکیٹو کونسل تقرر کرتی ہے۔ گویا جملہ تقررات اساتذہ کے ہاتھ میں ہیں۔ صرف تقرر ہی نہیں بلکہ ترقی اور الاونس وغیرہ کے جملہ مسائل اُنھیں کی اکثریت سے طے ہوتے ہیں۔

۸ ــــ قواعد کے فقرۂ (۱۹) ضمن ۳ (ج) کے مطابق ہر شعبۂ تعلیم کو پروفیسروں اور ریڈروں میں سے اپنا صدر منتخب کرنے کا حق حاصل ہے۔ جنوری سنہ ۳۲ء میں مجھکو معلوم ہوا کہ کئی شعبوں کے صدر ریڈر صاحبان تھے نہ کہ پروفیسر۔ مجھے اس قاعدہ کے مفید ہونے میں شک ہے۔ صریحًا یہ امر یونیورسٹی کے لیے فائدہ مند ہے کہ صدر ایسے لوگوں کو بنایا جائے جو زیادہ تعلیم یافتہ ہوں۔ پروفیسروں کو اسی بنا پر زیادہ تنخواہ دی جا سکتی ہے کہ وہ اُن لوگوں سے زیادہ تعلیم یافتہ ہوں جنھیں کم تنخواہ دی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پروفیسروں کو جو زیادہ تنخواہ پاتے ہیں ریڈروں کے بجاے صدر بنایا جائے۔ پروفیسروں کے مقابلہ میں ریڈروں کو صدر بنانا جیسا کہ ہماری یونیورسٹی میں کثرت سے کیا جارہا ہے یونیورسٹی کے لیے مضر ہے۔ میں نے اسے کم کرنے کی

کوشش کی مگر مذکورۂ بالا قانون کی وجہ سے اسے روک نہ سکا۔

۹ ــــ جہاں تک اکیڈمک کونسل کا تعلق ہے میں اس سے متفق ہوں کہ اس میں اساتذہ کی اکثریت ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کورٹ کی نمائندگی کافی نہیں ہے۔ فی الحال کورٹ کے صرف ۲ نمائندے اکیڈمک کونسل میں ہیں۔ اس تعداد میں اضافہ ہونا چاہیے۔ یہ امر بھی غور کے لائق ہے کہ سینٹ اور سنڈیکیٹ کا طریقہ جیسا بنارس میں رائج ہے ہماری اکیڈمک کونسل سے بہتر ہے یا نہیں ــــــ اور وائس چانسلر کی حیثیت بالکل صاف نہیں ہے۔ وہ اکیڈمک کونسل کا صدر ضرور ہے گر ایسے بعض اختیارات جو اُسے ملنا چاہیے تھے پرو وائس چانسلر کو دیدیے گئے۔ قاعدہ ۳ - فقرہ ۱ کی رو سے وائس چانسلر باعتبار عہدہ کے اکزکیٹیو اور اکیڈمک کونسل کا صدر ہے۔ مگر قاعدہ ۲ فقرہ ۳ کے رو سے جس طرح کورٹ اور اکزکیٹیو کونسلوں کے اجلاس منعقد کرنے کا اُسے حق ہے۔ اکیڈمک کونسل کے متعلق یہ اختیار نہیں ہے۔ بلکہ قاعدہ ۴ فقرہ ۲ کے بموجب یہ اختیار پرو وائس چانسلر کو ہے۔

۱۰ ــــ قاعدہ ۳ فقرہ الغایۃ ۵ میں وائس چانسلر کی حیثیت اور اختیارات کی تشریح کی گئی ہے۔ اور فقرہ ۲ کی رو سے اُس کا فرض ہے کہ وہ دیکھے کہ قواعد وضوابط و آئین کی پابندی ہوتی ہے اور اس بڑے فرض کی انجام دہی کے لیے کہا جاتا ہے کہ اُسکو جملہ ضروری اختیارات حاصل ہیں۔ لیکن عملاً دکھیا جائے تو کُل ضروری اختیارات یونیورسٹی کی مختلف جماعتوں اور عہدہ داروں کو دیدیے گئے ہیں۔ یونیورسٹی میں اصلی کام تعلیم ہے اور وائس چانسلر کا فرض ہے کہ وہ دیکھے کہ پرو وائس چانسلر اور دیگر اساتذہ اُس قانون کی پابندی کریں جو طلبا کی عمدہ تربیت اور اچھی حالت کے بہترین نتائج حاصل کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ لیکن مذکورۂ بالا صورتوں میں وائس چانسلر کیسے یہ سب باتیں کر سکتا ہے۔

مثلاً گذشتہ جون میں ایک کمیٹی یونیورسٹی ڈسپلن اور تعلیم وغیرہ کی تحقیقات کے لیے مقرر ہوئی جسکے ایک رکن خازن اور ۴۔ ارکان اساتذہ میں سے تھے۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کچھ تجاویز پیش کیں جو [illegible] شامل گئیں۔ میں نے ۲۵ - ستمبر کو جو خط پرو وائس چانسلر کے نام لکھا اُس میں ان تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے پرو وائس چانسلر صاحب کو بے ضابطگیوں اور نقائص پر توجہ دلائی (رپورٹ اور اپنے خط کی نقول منسلک کرتا ہوں) کمیٹی کی بعض تجاویز متعلق پرو وائس چانسلر صاحب کے نام ہدایات جاری کیں مثلاً تجویز نمبر ۴ منظور کرکے پرو وائس

چانسلر صاحب سے درخواست کی کہ ۵- نومبر ۲۹ء کے بعد داخلہ بند کردیں لیکن پرو وائس چانسلر صاحب نے میرے حکم کی کچھ پروانہ کی چنانچہ ۲۳- نومبر کو داخلہ کا رجسٹر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ۸- ۹- ۱۰- ۱۱- ۱۲- ۱۳- ۱۶- ۲۲ اور ۲۳ نومبر کو بھی طلبا داخل کیے گئے ہیں- پھر ۲۰ دسمبر کو رجسٹر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ داخلے جاری تھے- حالانکہ کمیٹی نے یہ سفارش اس لیے کی تھی کہ وہی طالبعلم ۷۵ فی صدی حاضریاں پوری کرسکتے ہیں جو ۵- نومبر تک داخل ہوجائیں-

کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی کہ دو طالبعلموں سے زیادہ ایک کمرہ میں نہ رکھے جائیں- چونکہ دو نوجوانوں کا ایک کمرہ میں رکھا جانا مناسب نہ معلوم ہوا اس لیے میں نے پرو وائس چانسلر کو ہدایت کی کہ تین طالبعلموں سے زیادہ ایک کمرہ میں نہ رکھے جائیں لیکن مجھے معلوم ہوا کہ سرسید کورٹ اور عثمانیہ ہوسٹل کے کمروں میں چار چار طالب علم رہتے ہیں- میں نے اپنے خط میں کچھ اور ہدایتیں بھی کی تھیں مگر ان پر کچھ توجہ نہ کی گئی- پرو وائس چانسلر اور اساتذہ کی اکیڈمک کونسل میں اکثریت ہے- اور اگزیکٹیو کونسل میں بھی حقیقی طور پر انھیں کی اکثریت ہے- اور معلوم ہوتا ہے کہ پرو وائس چانسلر صاحب کو یہ گمان ہے کہ تعلیم کے افسر وہی ہیں- اس گمان کی وجہ شاید یہ ہو کہ ہماری یونیورسٹی کے نفقرہ (۱) کے آئین ۹ میں وائس چانسلر کو خاص انتظامی و تعلیمی افسر کہا گیا ہے اور ہماری یونیورسٹی کے قانون کے نفقرہ (۱) میں جہاں وائس چانسلر کی حیثیت واضح کی گئی ہے یہ الفاظ محذوف ہیں- برخلاف اسکے آئین نمبر ۴ کے نفقرہ (۱) میں پرو وائس چانسلر کو یونیورسٹی کا خاص تعلیمی افسر بیان کیا گیا ہے- پھر وائس چانسلر اکیڈمک کونسل کا اجلاس منعقد نہیں کرسکتا اور پرو وائس چانسلر کرسکتا ہے- ان قواعد کے باوجود بے شبہ وائس چانسلر انتظامی و تعلیمی شعبوں کا افسر ہے اور جیسا کہ قاعدہ ۲ سے ظاہر ہے وہ یونیورسٹی کا افسر ہے- مگر مذکورہ بالا قواعد نے پرو وائس چانسلر کو غلط فہمی میں ڈال دیا ہے اور درس گاہ کے معاملات میں سخت بے ترتیبی پیدا ہوگئی ہے-

۱۱ — ایک اور درخواست ہے جس پر امید ہے کہ گورنمنٹ مہربانی سے غور کریگی- یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ کسی درس گاہ کی آمدنی پر خاص توجہ درکار ہے- قانون کے مطابق ہمارے حسابات کی جانچ سند یافتہ کارخانوں کے آڈیٹر کرتے ہیں اور وہ حسابات گورنمنٹ کو بھیجدیے جاتے ہیں مگر کالیہ کی اہمیت کے خیال سے میں گورنمنٹ سے ملتجی ہوں کہ ہمارے حسابات کی جانچ سند یافتہ سرکاری آڈیٹروں سے کرائی جائے یونیورسٹی کو اس کام کا معقول معاوضہ دینے میں عذر نہ ہوگا اگر

ہا ونہ لینا ضروری ہو۔

یہ ضروری خلاصہ ہے اُس مطول رپورٹ کا جو صاحبزادہ صاحب نے سوا سو صفحات پر لکھی ہے اور جسکا ترجمہ نظامی پریس بدایوں سے ۱۱۲ صفحات پر شایع ہوا ہے۔ خلاصہ میں اہتمام کیا گیا ہے کہ کوئی اہم بات چھوٹنے نہ پائے۔ کہیں کہیں اصل الفاظ قائم رکھے ہیں مگر عموماً مفہوم لے لیا گیا ہے۔ صاحبزادہ صاحب نے گورنمنٹ کو جو خط لکھا ہے اور جو خاص اہمیت رکھتا ہے اسکا بیشتر حصہ بجنسہ لے لیا گیا ہے۔ پھر بھی جن اصحاب کو اس مسئلے سے زیادہ دلچسپی ہو اُنسے التماس ہے کہ نظامی پریس بدایوں سے کامل رپورٹ کا ترجمہ منگا کر ملاحظہ فرمائیں۔

اس اثنا میں ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے ایک جواب بھی شایع کیا ہے جو اخباری سائز کے ۳۵ صفحے پر ہے۔ انشاء اللہ آیندہ جب ہم صاحبزادہ صاحب کی رپورٹ پر تبصرہ کرینگے تو ڈاکٹر صاحب کے جوابات سے بھی ناظرین الناظر کو روشناس کراتے جائیں گے۔

یہاں ایک بات ان حاضرین کرام سے عرض کرنا ہے جو قومی خدمت کا دعویٰ رکھتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں اُنکی روش عجیب و غریب ہے۔ تارک موالات نہیں اگرچہ اس میں شبہ ہے کہ مسلمانوں میں اب بعض مستثنیات کے سوا کوئی بھی تارک موالات باقی رہا ہے، وہ اگر مسلم یونیورسٹی کے متعلق سکوت اختیار کرتے تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ مگر وہ جو اس جرم کے مرتکب نہیں ہوئے یا جو کونسل کے داخلہ ملازمتوں کے اوسط اور انتخاب جداگانہ وغیرہ امور میں اب کھلے خزانہ دلچسپی لے رہے ہیں انھیں تو اس اہم مسئلہ میں خاموش نہ رہنا چاہیے تھا۔ اگر صاحبزادہ صاحب کی رپورٹ اُن تک نہیں پہونچی تھی تو اُسکا خلاصہ اب سامنے آگیا ہے اور رپورٹ کا اُردو ترجمہ بھی موجود ہے اور اُن کے لیے ناواقفیت کا کوئی عذر باقی نہیں ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے عدم و وجود سے وہ مستغنی نہیں ہیں اور اسکی ترقی و بہبود میں حصہ لینا اپنا فرض تصور کرتے ہیں تو صورت حالات کی نزاکت کا احساس کرکے صاحبزادہ صاحب کی رپورٹ پر مناسب توجہ کرنا چاہیے۔ صاحبزادہ صاحب سے خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، اور کون نہیں جانتا کہ ہم اُنسے شدید اختلافات کا اظہار کرتے رہے ہیں، مگر انکی منزلت اور قومی خدمت ہرگز اس قابل نہیں کہ اُسے نظر انداز کیا جا سکے اور جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے اُسپر کافی توجہ نہ کیجائے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کے ہمنواؤں کی طرف سے بعض اخبارات میں مسلسل ایسی تحریریں شایع ہو رہی ہیں جن سے عامۂ مسلمین کو صاحبزادہ صاحب کی رپورٹ کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے لیکن یقین واثق ہے کہ اس رپورٹ کی جو اصلی اہمیت ہے اُسے کسی صورت سے نقصان نہ پہونچے گا۔

ظفر الملک

جنوری کے رسالے

زمانہ سابق قیصر جرمنی کے سوانح کا ایک دلچسپ باب محمد علی صاحب وکیل ایبٹ آباد نے "قیصر جرمنی کا بیان" کے عنوان سے جنوری کے زمانہ مین شایع کیا ہے جس کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہی کہ صرف مفتوح جرمن ہی سفاک، ظالم اور غیر مہذب نہین بلکہ مہذب فاتحون کا اخلاق بھی کچھ زیادہ بلند نہین ہی قیصر کی زبان سے سنیے:-

"فرانس مین پیشقدمی کے وقت تو مین نے حکم دیدیا تھا کہ آرٹ کے خزانے محفوظ رکھے جائین۔ مین نے فوج کے ساتھ ماہرین فن مقرر کر دیے تھے تاکہ وہ ہر ایک گرجے، محل، اور عجائب خانے کا لحاظ کیا کرین اور فنون لطیفہ کی بہ ضابطہ نگرانی کرین تاکہ کسی محفوظ جگہ پر بھیج دیا کرین سینٹ کوئنٹس کے گرجے کی قدیمی کھڑکیان جرمن سپاہیون نے نہایت احتیاط سے محفوظ رکھی تھین بہ کہ انگریزی افواج ان پر گولہ باری کرتی تھین۔

بیلجیم کے قصبہ نامس مین۔ لڑائی کے ایام مین ایک جرمن کمانڈر مع اسٹاف کے مقیم تھا۔ اس سے قبل اس جگہ پر انگریزی فوج قابض تھی جس نے محل کے رہائشی سامان اور فنون لطیفہ کو درہم برہم کر دیا تھا۔ شہزادی (ہائیکس) کے چاندی کے برتن محل کے باغ مین مدفون پائے... مین نے ان قیمتی برتنون کو ایک بنک مین بھجوا دیا اور ہدایت کر دی کہ یہ تمام اشیا شہزادی موصوفہ کو جنگ کے بعد دیدی جائین۔ بعد مین نے اپنے ایک معتمد کی معرفت مین سکو یقین دلایا کہ آپکا سارا سامان محفوظ ہی، لیکن میرے خط کا کوئی جواب نہ آیا بلکہ شہزادی نے فرانسیسی اخبارون مین یہ خبر شایع کرائی کہ سپاہیان کاک نے اسکے قیمتی زیورات چرا لیے ہین"

معارف بدھ مت کے عروج کے زمانہ مین چنپا نگر صدر راج (صوبہ بہار) کا دارالخلافت تھا۔ جدید مورخین بھاگلپور کے ایک گاؤن چنپا نگر کو قدیم چنپا کی جائے وقوع خیال کرتے تھے۔ مگر اب تک وہان ایسے آثار نہین دریافت ہوئے تھے کہ ان کا یہ خیال پایۂ یقین کو پہونچ جاتا۔ حال مین مولوی ابو عمر ذکریا نے (غالباً) اصل مقام دریافت کر لیا ہی اور جنوری کے معارف مین ایک مضمون کے ذریعے اس کا اعلان کر دیا ہی۔ بڑے فخر کا مقام ہی کہ اردو دنیا کو بھی اثری تحقیقات سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اُمید ہی کہ محکمۂ آثار قدیمہ جلد اس دریافت کی تحقیق کی طرف توجہ کریگا۔ مولوی ذکریا صاحب کا بیان یہ ہی کہ:-

"مین کانگرس کی طرف سے کاونسل کے ووٹ فراہم کرنے کے لیے سنتال پرگنہ کا دورہ کرتا ہوا نومبر ۱۹۲۶ء کو گڈا سب ڈویژن مین ۲۰ – ۲۲ میل کی مسافت پر ایک چھوٹے سے گاؤن مین گذرا...

یہان کے رہنے والے اس چھوٹے سے گاؤن کو چنپا کہتے ہین۔ یہ ایک اونچی ٹیلہ نما زمین پر واقع ہے یہ اونچی زمین سات آٹھ میل تک پھیلی ہوئی ہے۔ جہان دو تین گاؤن اور کھیت ہی کھیت آباد ہین یہان کثرت سے بڑے بڑے قدیم تالاب پائے جاتے ہین، جنکی قدامت کا پتہ کوئی نہین بتا سکتا۔ بتوفیق الٰہی میرے دل مین خیال گذرا کہ ممکن ہے یہ وہی جگہ ہو جہان شہر چنپا بسا ہوا ہے اسکا سراغ لگانا چاہیے مین نے گاؤن والون سے اسکے کھنڈرون کے متعلق دریافت کیا۔ گاؤن والون نے بیک زبان کہا "یہان جب زمین کھودی جاتی ہے، تو بکثرت بڑی بڑی اینٹین (جو دو انچہ دبیز اور ایک فٹ مربع کی ہوتی ہین جیسی اسوقت نالندہ کے کھنڈرون سے برآمد ہو رہی ہین) ملتی ہین"۔ ان اینٹون سے یہان کے رہنے والون نے اپنے مکانون کی دیوارین بنائی ہین۔ پرانے سکے نکلتے ہین۔ بدھ ساخت کے چھوٹے بڑے بت نکل رہے ہین۔ کچھ مٹی کے ظروف بھی نکلتے ہین۔ چند مکانات بھی نکلے جن مین چھوٹے چھوٹے بہت سے کمرے تھے۔ مین نے اینٹین دیکھین جو کھیتون مین پڑی ہین۔ کوسون تک اینٹون کے انبار پائے جاتے ہین۔ مین نے بطور یادگار ایک اینٹ بھی ساتھ رکھ لی ہے جو واقعی نہایت قدیم اور بدھ ساخت کی ہے، جیسی اب نالندہ سے برآمد ہو رہی ہین۔ اگر محکمہ آثار قدیمہ ادھر توجہ کرے تو تاریخ کے اوراق کے نادر و مفید اضافہ ہو جائیگا۔ مین اپیل کرتا ہون کہ محکمہ آثار قدیمہ جلد ادھر توجہ کرے تاکہ یہ کھنڈر زمانے کے دست و برد سے تو محفوظ رہ جائے۔ اگر میری مدد کی ضرورت ہوگی تو مین ہر طرح کی مدد کے لیے تیار رہون۔ وقت دونگا، ساتھ جاؤنگا، شریک کار رہونگا۔ واقعی یہ دیہی چنپا ہے (اس مین کوئی شک نہین) جہان کی مورتیان، اینٹین اپنی اگلی پرعظمت تاریخ یاد دلا رہی ہین۔

چمن کے تخت پر اک دن شہ گل کا تجمل تھا ہزارون بلبلون کی فوج تھی اک شور تھا غل تھا

خزان کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خار صحن و ان بتاتا باغبان رو رو یہان غنچہ یہان گل تھا"

اُردو جناب مولوی نور الٰہی و محمد عمر صاحبان نے، جنہون نے کچھ عرصہ ہوا ڈراما کی تاریخ پر ایک ضخیم کتاب ناٹک ساگر لکھی تھی، اردو کے جنوری نمبر مین "مبادیات تیاتر" کے زیر عنوان اس فن پر ایک مفید مضمون لکھا ہے۔ مضمون کا اہم ترین حصہ وہ ہے جہان اس امر سے بحث کی گئی ہے کہ متداول ہندوستانی ڈرامے کن اصول کے مطابق لکھے جاتے ہین۔ صاحبان مضمون نے اپنی تحقیق سے جو "اصول" گر حاصل کیے ہین

ان مین سے چند یہ ہین :-

"ڈرامہ عمومًا دو یا تین حصون مین تقسیم ہوتا ہے۔ ایک حصہ جسے ٹریجک کہتے ہین دوسرا ظریفانہ جسے کامک کہتے ہین ٹریجک قصہ مین ایک ہیرو، ایک ہیروئن، اور ایک جراری یا جلالی پارٹ ہونا لازم ہے۔ ان سب کی گفتگو لازمی طور پر نجی تلی ہونی چاہیے اور اس طرح لکھی جانی چاہیے کہ ہیرو اور جراری کیرکٹر کے کلام مین تمیز ہو سکے ہیروئن غم کے بوجھ سے ٹیوزون کی طرح لدی رہے اور اپنی عصمت بچاتی پھرے۔ ان کے علاوہ جسقدر کیرکٹرون کی ضرورت ہو رکھ لو۔

ٹریجک حصے مین ایسے الفاظ لانے کی کوشش کرو جو عام فہم سے بلند ہون اور عجیب طرح سے استعمال ہون... قافیہ فقرون کو بہت زوردار کر دیتا ہے

اور جا بجا اشعار کا آنا بڑا اثر رکھتا ہے، مسدس اور مخمس کے بندون کا کیا کہنا۔ اشعار خود بنانے کی کوشش کرو۔ وزن اور عروض کے دیگر قواعد کی پابندی ضروری نہین۔

تھیٹر کا واحد مقصد تفریح ہے۔ اس لیے ناچ اور گانے جسقدر بھی ہون تھوڑے ہین۔ غزل ایک سے زائد نہو، مگر گانے کے ڈھب کی ہو۔ اپنی غزل بہتر ہے۔ لیکن یہ نہو تو کسی اور شاعر کی غزل کے مقطع مین اپنا تخلص ڈال لو۔

حسب ضرورت واقعات کو تذکرے کے طور پر بیان کرو۔ اور اسائڈ اور سالولکی کے استعمال سے ہرگز گریز نہ کرو۔ . . . اسٹیج پر ایک سو سال کے مسلسل واقعات دکھائے جا سکتے ہین . . . . ڈراما مین شراب خواری تماش بینی اور قمار بازی کے منظر دکھا کر کسی کیرکٹر سے ان کے مصائب پر لکچر دلوا دیا کرو۔

ڈرامے مین کہانی کے واقعات کا تسلسل قائم رکھنا۔ یا ہر معلول کی علت بتانا ضروری نہین۔ ڈراما نہ تو ناول ہوتا ہے نہ منطق کی کتاب۔ کیرکٹرونکے منھ مین ایسے الفاظ رکھیے کہ اکثر بادل کی گرج، بجلی کی کڑک، ہاتھی کی چنگھاڑ، شیر کی گونج، اور اژدہے کی پھنکار کا چربہ اتار سکے۔

یہ قواعد اپنی شرح آپ ہین اور کسی مزید تصریح کے محتاج نہین۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ صورت حالات مین ان پر کاربند ہوئے بغیر سوا اسٹیج پر بار ملنا محال ہے۔ اگر کسی صاحب نظر کو یہ پسند نہ ہون تو بگڑنے کی ضرورت نہین۔ ع

اگلے وقتون کے ہین یہ لوگ انھین کچھ نہ کہو"

ہمایون جنوری مین بڑی زیب و زینت کے ساتھ ہمایون کا سالانہ نمبر شایع ہوا۔ اس نمبر مین مدیر ہمایون میان بشیر احمد صاحب کا ایک پر از معلومات علمی مضمون شایع ہوا ہے۔ "علم و تمدن کے آغاز" کے متعلق وہ فرماتے ہین:۔

"علم و تمدن کا آغاز بھی اُس سرزمین سے ہوا جس مین برکت خداوندی سے پہلے پہل مذہب کے علمبردار اُٹھے۔ وہ سرزمین جو مصر و ایران کے درمیان واقع ہے دنیا کے سب خطون پر سبقت لیگئی۔ اہل چین و اہل ہند دعویدار ہین کہ ہمارا تمدن قدیم ترین ہے لیکن جہانتک ہماری غیر مکمل تاریخ و اثری شہادت کام دیتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر ان دونون سے زیادہ قدیم اور بابل اس سے زیادہ اور ایلم اس سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایلم کے تمدن کا زمانہ بارہ ہزار قبل مسیح ہے۔ بابل کا تمدن چار ہزار سال ق۔م سے دو ہزار سال ق۔م تک قائم رہا اسکے بعد اشوری تمدن تقریباً ایک ہزار سال تک زور آور پر حاوی رہا۔ بابل کو اپنے بادشاہ بنوشد نزار کے عہد مین دوبارہ فروغ حاصل ہوا۔ اُدھر یہودیون نے فلسطین مین اپنی حکومت قائم کی اور فنیقیون نے بحر روم کے ساحل پر ایک بحری تمدن کی بنیاد ڈالی۔ مغربی مورخین کے نزدیک چین اور ہندوستان کی تاریخ کا دو ہزار سال ق۔م سے پتہ چلتا ہے۔ ہمارے خیال مین اِس اندازہ مین بہت کچھ ترمیم کی ضرورت ہے۔ چند سال ہوئے پنجاب

اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہند کا تمدن کسقدر قدیم تھا۔ مصر کا تمدن چار ہزار سال ق م سے شروع ہوکر ہزاروں سال تک نشیب و فراز کے رنگ دیکھتا رہا۔ حطی حملہ آوروں نے ۱۹۲۵ ق م اناطولیہ کے پہاڑوں سے اتر کر جنوبی قوموں کو اپنی بربریت کا مزا چکھایا اور ادھر نینوا کی تسخیر کے بعد اہل میدیا نے اپنی قوت کا سکہ چلایا۔ ۵۵۳ ق م میں ایرانیوں نے اپنے بادشاہ سائرس کے تحت میں میدیا والوں کو نیچا دکھایا اور پھر بتدریج تمام ان قوموں کو جو ان اطراف میں رہتی تھیں اپنے زیرنگین کرلیا۔ یہانتک کہ دارا کے عہد میں ایران کی عظیم الشان سلطنت دنیا میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ یونانی قوموں نے جب اپنی ہستی کو مٹتا دیکھا تو متحد ہوکر ایرانی فوجوں کے سامنے صف آرا ہوگئیں۔ اس طرح یونان کی شجاعت نے مغرب کو ایران کی تلوار سے بچایا اور اپنے ملک میں وہ تمدن قائم کیا جس پر روما کی تہذیب نے اپنی بنیاد رکھی اور جس سے دنیائے یورپ نے درس حکمت لیا۔"

نگار مسٹر محی الدین قادری زور بی اے کے قلم سے جنوری کے نگار میں ایک دلچسپ تنقیدی مضمون حالی اور نثر اردو پر شایع ہوا ہے۔ لائق مضمون نگار اردو نثر میں حالی کا درجہ ذیل کے الفاظ میں متعین کرتا ہے :-

"نثر کے لحاظ سے بھی انکی مصنفات ادبیات اردو کے ایک جزو لاینفک ہیں اور ایسے جزو لاینفک جو انکی شاعری کی طرح ادبیات اردو میں ایک نئے اور ضروری باب کے اضافہ کے باعث ہیں۔ اسوقت بھی جبکہ اردو کا سرمایہ نثر کافی ترقی کرچکا ہے اگر مولوی حالی کی نثری خدمات کو اس سے علیحدہ کرلیا جائے تو ایک ایسا فقدان نظر آئیگا جس کی تلافی شاید ہی متعدد انشاپردازوں کی متفقہ کوششوں کے بعد بھی ایک عرصہ تک ہوسکے۔ . . . .

حالی نے سنجیدہ و علمی مضامین کو اس طرح لکھنا شروع کیا کہ پڑھنے والا اُن سے مرعوب ہوجائے اور اسکو معلوم ہو کہ یہ ایک علمی بحث ہے۔ اس قسم کے اسلوب کی رواج دینے میں سخت ضرورت تھی کیونکہ یہ ایک ردعمل تھا اردو کی اُن پرانی طرز کی تحریروں کا جن میں مواد اور کام کی باتیں تو بہت کم ہوتی تھیں، لیکن لفظی خوبیوں اور ظاہری صناعیوں کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا۔ یہ حالی جیسے سنجیدہ اور اعلی مذاق رکھنے والی ہستی ہی کا کام تھا کہ جہاں اردو کو ایک طرف بچا جکڑبندیوں سے نکالنے کی کوشش کی تو دوسری طرف اس امر کا بھی لحاظ رکھا کہ وہ بالکل آزاد ہوکر بازاری اور مبتذل نہونے پائے . . . . یہ پہلے ادیب ہیں جنھوں نے تنقیدی خیالات کو اردو میں روشناس کرایا۔ حالی سے قبل اردو کے کسی انشاپرداز نے بھی اسطرح غیرجانبدارانہ تنقیدیں نہیں پیش کی تھیں۔ اگرچہ آزاد نے آب حیات میں اس فرض کو انجام دینا چاہا ہے لیکن اُن کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ غیرجانبدار نہیں رہ سکتے . . . . حالی سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے یورپ کی جدید ترین طرز سوانح نگاری کے مطابق ہندوستان میں مبصرانہ سوانحعمریاں لکھنی شروع کیں۔ مورخانہ تدقیق، حالات و واقعات سے منطقی طور پر نتیجوں کا استخراج اور جسکی سوانحعمری لکھی جائے اُسکے کارناموں اور زندگی میں غور و خوض کرنے کی ابتدا حالی ہی نے کی . . . .

حالی دنیا کی اُن خوش قسمت ہستیوں میں سمجھے جو اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودے کو اپنی آنکھ لیے پروان چڑھتا ہوا دیکھکر لطف حاصل کرسکتے ہیں۔ اُنھوں نے جس قدیم پیرایہ تحریر کا ردعمل شروع کیا تھا

وہ انکی زندگی ہی مین حرف غلط بنکر مٹ چکا تھا۔ ان کے نئے رنگ کی نظمون نے اُنھین کے سامنے پرانے اور بدوضع رنگون کی شاعری کو اپنے وسیع دامنون مین محو کر لیا۔ ان کے ثقہ اور سنجیدہ تنقیدی خیالات نے ایک طرف تو قدیم بے راہ روی اور بدمذاقی کے خرمنون کو بجلی بنکر جلا دیا اور دوسری طرف بوستان علم وادب کو ابر نیسان بنکر سرسبز و شاداب بنا دیا۔"

جامعہ مسلم یونیورسٹی کے نوعمر پروفیسر خواجہ غلام السیدین ایم۔ اے۔ نے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے پچھلے جلسے مین "یونیورسٹی اور حیات قومی" پر ایک بصیرت افروز مضمون پڑھا تھا جامعہ نے جنوری نمبر مین اسے شایع کرکے اردو خوان طبقہ کو خواجہ صاحب کے قیمتی مشورون سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔ انکے خیالات کا ست اُن ہی کے الفاظ مین حسب ذیل ہے۔

"یونیورسٹی محض ایک درسگاہ نہین ہے جہان چند مضامین پر سبق پڑھائے جاتے ہین بلکہ وہ قومی زندگی مین ایک مرکزی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ ان تمام عمدہ اور متحرک اثرات کا سرچشمہ ہے جو قوم کی زندگی کی اصلاح کرتے ہین۔ مین اصولاً تشبیہون کا قائل نہین لیکن میرے خیال مین یونیورسٹی کو جائز طور پر ایک بجلی گھر سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ جس طرح بجلی گھر کا کام ہوتا ہے کہ وہ مخصوص آلات کے ذریعے اس بجلی کو جمع کرے جو منتشر طور پر تمام کائنات مین موجود ہے۔ اسکو ایک قابل استعمال شکل دے اور اپنے اندر کام کرنے والون کو اور تمام گرد و نواح کو روشنی پہونچائے بالکل اسی طرح یونیورسٹی بھی ان تمام علوم کو جمع کرتی ہے جو دنیا مین موجود ہین اور تحقیق علمی کے ذریعے مظاہر قدرت اور انسانی زندگی مین چھپے ہوئے قوانین کو مرتب کرکے نئے علوم کی تدوین کرتی ہے۔ ان علوم کو ایسی شکل مین ترتیب دیتی ہے کہ وہ علم کے تلاش کرنے والون کے لیے قابل حصول ہون اور پھر اپنے علوم اور اپنی تحقیقات سے صرف انہی لوگون کو فائدہ نہین پہونچاتی جو اسکی چار دیواری مین تعلیم پارہے ہین بلکہ بجلی گھر کی طرح اسکے فیوض کو گرد و نواح کے لوگون تک پہونچانا چاہیے۔ قوم کی زندگی کے ہر شعبے پر اثر ڈالنا چاہیے اور یہ اسی صورت مین ہوسکتا ہے جب ایک یونیورسٹی کی تحقیقات علمیہ کے نتائج عام فہم انداز مین پبلک کے سامنے پیش کیے جائین اور دوسری طرف یونیورسٹی کے طلبہ ملک کی اصلاح مین حصہ لین۔"

قوس قزح مولوی محمد حمید گیلانی بی۔ اے۔ مدیر قوس قزح نے اپنے رسالے کے جنوری نمبر مین "آفتاب" پر ایک نہایت مفید اور سائنٹفک مضمون شایع کیا ہے۔ ذیل کے اقتباس سے اُسکی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا:۔

"محققین کا دعویٰ ہے کہ آج سے قرنہا قرن پیشتر آفتاب کی سطح پر یہ داغ موجود نہین تھے اور اُسوقت آفتاب مین اتنی حرارت تھی کہ نظام شمسی کے تمام افراد کوئلے کی طرح دہک رہے تھے کچھ عرصہ کے بعد یہ داغ نمودار ہوئے۔۔۔۔ یہ داغ بتدریج حجم اور داغ مین بڑھتے جارہے ہین اور اسلیے ایک وقت آئیگا جبکہ یہ آتشین کرہ بالکل سیاہ ہوجائیگا۔"

دوسرے محققین [illegible]

کہ جب کوئی جسم حد سے زیادہ گرم ہو تو اس مین سے روشنی کی بالکل سفید شعاعین نکلتی ہین، لیکن جون جون اسکی گرمی زائل ہوتی چلی جائے اُسکی سفید شعاعین زرد ہوتی جاتی ہین۔ پھر زرد سے سرخ، اور سرخ سے سیاہی مائل، اور آخرکار معدوم ہو تی جاتی ہین، اسی طرح آفتاب کی شعاعین بھی اسوقت زرد ہین یعنے اسکا وہ زمانہ گذر چکا ہے جبکہ اسکی شعاعین بجلی کی طرح سفید ہوتی تھین کیونکہ یہ بہت سی حرارت خارج کر چکا ہے اور ابھی متواتر خارج کر رہا ہے۔ کوئی ایسا بھی زمانہ آئیگا جبکہ اسکی ساری حرارت خارج ہو جائیگی اور یہ بالکل افسردہ اور تاریک کرہ رہجائیگا۔ اور اسوقت تمام نظام شمسی درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ پیشین گوئی کیسی ہی لغو کیون نہو، مگر کم از کم مین تو اسکا قائل ہون۔ کیونکہ پیشین گوئی نئی نہین ہے۔ قرآن حکیم ساڑھے تیرہ سو سال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔

اذا الشمس کورت! واذا النجوم انکدرت!!"

"سید"

فروری کے رسالے

زمانہ فروری کی اشاعت مین جناب مہتہ فیروزپوری کا ایک مفید اور سبق آموز مضمون شایع ہوا ہے جسمین اٹھارہ باتون کے لحاظ رکھنے مین کامیابی کا راز بتایا گیا ہے۔ مضمون کا عنوان "بڑھے چلو" ہے۔ ہمارے خیال مین کامیابی جس شے کا نام ہے وہ اسی بڑھے چلو مین ہے۔ ہم آخر کے دو نکات مضمون مذکور سے یہان درج کرتے ہین:۔

"۱۷۔ یاد رکھو صرف ایک خاص پیشہ مین درجہ کمال پر پہونچنے کا انہماک انسان کے لیے مضر ثابت ہوتا ہے کیونکہ انسانی دماغ کے مختلف حصے مختلف غذا کے طلبگار ہوتے ہین جس حصے کو اُسکی خوراک نہ ملیگی اُسکا بیکار رہ جانا لازمی ہے، قدرت کا اصول بھی یہی ہے کہ جس شئے کو تم استعمال نہین کرتے وہ نکمی اور ناکارہ ہو جاتی ہے۔

۱۸۔ وہ کام تمھاری زندگی کا پیشہ ہونا چاہیے جو تمھاری فطرت کے موافق اور تمھاری طبیعت کے مطابق ہو۔ نہ وہ کہ جسکے ذریعہ تم زیادہ روپیہ کما سکو۔ تم جو کام کرو اس مین اپنے فطری کمال کا خیال رکھو تحصیل زر کے لیے کسی کا کام کرنا اپنی لیاقت کو فروخت کرنے کے مترادف ہے۔

لہذا اپنی طاقتون کو تم صرف روپیے کی فراہمی مین صرف نہ کرو۔ اصلی کامیابی روپیہ کا جمع کرنا نہین ہے۔ اس قسم کی کامیابی اور اصلی کامیابی مین بہت فرق ہے۔ اصلی کامیابی یہ ہے کہ انسان اپنی فطری قوتون کو چمکانے کی کوشش کرے۔ روح کو پاکیزہ تر بنائے۔ تاکہ دنیا والے بھی عزت کرین اور خدا کی قربت بھی نصیب ہو۔"

معارف فروری کے پرچے مین مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک پُر از معلومات مضمون شایع ہوا ہے فلاسفۂ فرنگ سارے اسلامی فلسفے کو صرف فلسفۂ ارسطو کی شرح سمجھتے ہین۔ ایک نے تو یہان تک کہدیا

کہ مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے۔ مقالہ نگار نے جس خوبصورتی کے ساتھ اِس اعتراض کو اُٹھایا ہے وہ "کیا مسلمان حکماء صرف فلسفۂ ارسطو کے خوشہ چین تھے،" کے اقتباس ذیل سے ظاہر ہوگا:۔

"ارسطو کے پہلے یونان میں سات بڑے بڑے فلاسفر مختلف زمانوں میں پیدا ہوئے جن میں سب سے (Thales) طالیس اسکے بعد (Anaxagoras) انکسا غورس (Empedocles) اینڈقلیس (Pythagoras) فیثا غورث (Socrates) سقراط اور (Plato) افلاطون تھے ممتاز مسلمان حکماء ان ساتوں فلاسفہ کے خیالات اور مسائل سے آگاہ تھے اور اپنی کتابوں میں ان کا تذکرہ کیا ہے حوالہ دیا ہے۔ چنانچہ عبدالکریم شہرستانی المتوفی ۵۴۸ھ نے اپنی کتاب ملل و نحل میں ان ساتوں اساطین فلسفہ کے خیالات مسائل اور نظریے پوری شرح اور پوری صحت کے ساتھ لکھے ہیں آج بھی بہتر سے بہتر تاریخ فلسفہ میں اُن لوگوں کے خیالات کی تفصیلات اِس سے زیادہ نہیں ملتی۔

مسلمانوں کی تاریخ فلسفہ کے متعلق ایک عام غلطی یہ ہے کہ وہ صرف فارابی ابن سینا غزالی ابن رشد رازی۔ طوسی اور قطب رازی وغیرہ کی تصنیفات سے عبارت ہے لیکن حقیقت میں مسلمانوں کے اصلی معنوں میں فلسفہ کا دور متکلمین کی تصنیفات سے شروع ہوتا ہے۔ مثلاً علامہ ابوالہذیل نظام۔ حافظ ابوالحسن اشعری وغیرہم۔ قدیم فلاسفہ کی ترجمانی ان کتابوں میں کی گئی ہے عموماً کتاب المقالات یا کتاب الدیانات اختیار کیا گیا ہے۔

دیمقراطیس کے مسئلہ جزء لایتجزیٰ سے متکلمین اسلام ابتدا ہی سے واقف تھے اسلیے ارسطو کے ہیولیٰ کو چھوڑ کر انھوں نے دیمقراطیس کی رائے کی پیروی کی اور اسکی پرزور حمایت کی۔ افلاطون کے مثل سے بھی اُنھوں نے پوری ہمدردی کی اور اسکو اپنی کتابوں میں جگہ دی اور صوفیہ میں سے نقشبندی مجددیوں نے اس پر عالم مثال کا ایک نظریہ قائم کرلیا۔

ابوریحان بیرونی یونان کے مختلف فلسفوں کے ساتھ ایران اور ہندوستان کے بھی تمام مذاہب سے واقف تھا۔ آثار الباقیہ اور کتاب الہند اسکی شاہد ہیں"

نگار

فروری نمبر میں مسٹر سید محمد بی اے کا مضمون "نظامی عروضی اور چہار مقالہ" جس محنت اور کاوش سے لکھا گیا ہے ذیل کا اقتباس اُسکا شاہد ہے۔

"چہار مقالہ کئی باتوں کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اول تو یہ قدیم کتب نثر میں ہے اور اسکی قدامت بہت کچھ اسکی قدر و قیمت میں اضافہ کرتی ہے۔ اسکے علاوہ تاریخی حیثیت سے یہ کتاب بہت اہم ہے۔ مصنف نے اپنے زمانہ کے چشم دید واقعات اور مشہور شعراء کے حالات مختلف مباحث کے درمیان میں بیان کیے ہیں۔ اس طرح معتبر تاریخی مواد اس غیر تاریخی کتاب سے حاصل ہوجاتا ہے۔ ایران کے مشہور شعراء کے حالات مصنف نے اپنے مشاہدہ سے لکھے ہیں اور بہت سی نئی کام کی باتیں جن سے اور تذکرے خالی ہیں اس میں صحت کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔

چہار مقالہ کا مصنف "نظامی" عروضی ہے۔ اسکی تمام تر شہرت کا دار و مدار اسی کتاب پر ہے شاعری کی بدولت اسکو مقبولیت اور شہرت کا کوئی حصہ حاصل نہیں ہوا۔۔۔۔

چہار مقالہ کے تین قلمی نسخون کا پتہ چلا ہے ایک نسخہ جو قدیم کہا جا سکتا ہی قسطنطنیہ مین ہے اور یہ [illegible]ھ کا لکھا ہوا ہی اس نسخے اور دیگر نسخون مین بہت زیادہ اختلاف ہی۔ اسکے علاوہ برٹش میوزیم مین دو نسخے موجود ہین۔ ان مین سے ایک اور نسخون کے مقابلہ مین بہت زیادہ صحیح ہے۔ [illegible]ھ کا لکھا ہوا ہے اور دوسرا ۱۲۷۴ھ کا لکھا ہوا ہی یہ آخری نسخہ صحت و سقم کے لحاظ سے مساوی ہی۔ ان قلمی نسخون کے علاوہ مطبوعہ نسخون مین قدیم ترین نسخہ طہران کا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا سن طباعت [illegible]ھ ہی اس مین بیحد غلطیان اور تصرفات ہین [illegible]ھ مین سلسلۂ اوقاف جبریہ گب مین ایک نہایت عمدہ نسخہ شایع ہوا ہے "

جامعہ فروری نمبر مین رام چندرن صاحب کے مضمون ہندو فلسفے کی خصوصیت کا ترجمہ سعید انصاری صاحب کے قلم سے شایع ہوا ہے۔ مسلمانون کو ہندو فلسفے کا مطالعہ کرنا چاہیے جو لوگ تصوف سے دلچسپی رکھتے ہین انکے لیے ویدانت اور یوگ مین کافی سامان مطالعہ موجود ہے۔ اقتباس ذیل سے مضمون مذکور الصدر کی اہمیت ظاہر ہو سکتی ہی۔

"(اب ہم) اصل موضوع کی طرف توجہ کرتے ہین کہ آیا ہندو فلسفے مین یہ صلاحیت ہی کہ وہ زندگی کو بحیثیت مجموعی سنوار سکے نہ یہ کہ وہ صرف دماغی نشو و نما کے لیے ایک آلہ کار ہو۔ بلکہ جہانتک ہمارا خیال ہے ہندو فلسفے کے عمیق میلانات کو اگر صحیح طور پر لیا جائے تو اس سے یقیناً دماغ مین ایسی حرکت پیدا ہو گی جو ہمکو اس امتزاج کی طرف لیجائے گی۔ لیکن یہ بات صرف ہندو فلسفے کے ساتھ مخصوص نہین بلکہ دنیا کے تمام بڑے بڑے فلسفون مین پائی جاتی ہے۔ پھر بھی صرف تحریک کا پیدا کر دینا ہی کافی نہین اصل ضرورت یہ نہین ہے کہ محض منزل مقصود کا پتہ بتا دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ راستے کو صاف اور ہموار بھی کیا جائے اور خود کو ان چیزون کو خارج جس سے آسانی کے ساتھ گذر جانیکا موقع بھی دیا جائے۔ فلسفہ کا صرف یہی کام نہین ہی کہ وہ روشن ستارے کی طرح آسمان کی بلندی سے چمکتا رہے بلکہ اسکو مثل اس شکل کے ہونا چاہیے جو سخت اور دشوار گزار راستون کی بھی رہنمائی کرے پچھلے مضمون مین ہم نے ذکر کیا تھا کہ کٹھا اپنشد مین حقیقت کے راستے کا کیا مفہوم لگایا ہی لکھا ہے کہ وہ استرے کی دھار کی طرح تیز ہی جس سے گذرنا سخت دشوار ہی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے دماغون نے اپنی اسی کیفیت مین "یوگ" کا طریقہ تصور نکالا جو بیک وقت ستارے کا کام بھی دیتا ہی اور مشعل کا بھی۔ ستارے کی حقیقت متعدد بار دریافت ہوئی لیکن مشعل کی روشنی سب سے پہلے یوگ ہی نے روشن کی"

ہمایون فروری نمبر مین تجمل حسین صاحب نے "اکبر کی انتظامی قابلیت پر" کاوش سے مضمون لکھا ہی جسکا اقتباس مندرجہ ذیل سے پتہ چل سکتا ہے۔

"اس عہد کے چند عہدے۔ اکبر کے عہد حکومت مین جو عہدے مقرر کیے گئے تھے اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظام حکومت کسقدر منظم اور سلجھا ہوا تھا اور بادشاہ کی اس مین کس قدر حکمت اور

دور اندیشی مضمر تھی جلیل القدر اور ممتاز ترین عہدہ دار وکیل تھا جسکو وزیر اعظم بھی کہتے تھے۔ بادشاہ کی طرح یہ بھی تمام شعبہ جات حکومت پر نگرانی رکھتا تھا اور ہر وقت مشورے مین شریک رہتا تھا مالیات کا کام جس طرح ابتدائے بیان مین ظاہر کیا گیا ہو دیوان کے زیر نگرانی تھا تنخواہون کی تقسیم ملازمین سلطنت کے دفاتر کی حفاظت جنگ کے وقت فوج کی ترتیب اور محلات شاہی کی نگرانی کے لیے بخشی مقرر تھا اور تمام کاروبار متعلقہ کا وہی ذمہ دار تھا۔ انصاف کرنے کے لیے عدالت کا ایک بڑا محکمہ قائم کیا گیا تھا جس مین میر عدل اور قضاۃ اجلاس کیا کرتے تھے اور فریقین کی نزاعات کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔ قضاۃ کا کام میر عدل کو صحیح مشورہ دینا اور مقدمہ فیصل ہوتے وقت مدد دینا تھا اس فیصلے سے اگر کوئی فریق ناراض ہوتا تو اسکے لیے بادشاہ کی طرف رجوع کرنے کے لیے موقع حاصل تھا۔ بادشاہ ہر وقت اس قسم کی اپیل سننے کے لیے مستعد رہتا تھا فیصلے مقررہ احکام قانون اور شرع وغیرہ کے موافق ہوتے تھے علاوہ ازین کوتوال کا بھی عہدہ تھا......

اکبر کا نام بحیثیت فاتح اعظم کے صفحۂ دہر پر جلی قلم سے لکھا ہوا ہے اور رہیگا مورخین اکثر اسکا مقابلہ یورپ کے فاتحین مثلاً سکندر اعظم نپولین بوناپارٹ وغیرہ سے کیا کرتے ہین اور اس نتیجے پر پہونچے بغیر نہین رہتے کہ اکبر ان مشاہیر عالم سے کسی طرح کم نہین بلکہ بعض امور مین قابل ترجیح ہو۔ بلاشبہ اولوالعزم فاتحین اور مشہور سلاطین کی محفل مین اکبر بادشاہ کا شمار پہلی صف مین ہو۔

ادبستان

مولانا عبدالمجید صاحب بی اے ایل ایل بی۔ اڈیٹر خلافت کے قلم سے فروری کے ادبستان مین (جو سال گذشتہ بمبئی سے جاری ہوا ہو) نظیر اکبرآبادی پر ایک دلچسپ اور مفید مضمون شایع ہوا ہے جسکا حسب ذیل اقتباس شاید ناظرین الناظر کی دلچسپی کا باعث ہو:۔

”ہر شخص جانتا ہے کہ آج اس ملک مین ایک ہی چیز کی کمی ہے اور اسی کے لیے ہر شخص کوشان ہو یعنے مختلف جماعتون کا اتحاد آج شیعہ سُنی۔ ہندو مسلمان سکھ برہمن غیر برہمن سب آپس مین ایک دوسرے سے بدظن ہین اور ہمارے رہنمایان قوم کی خواہش ہو کہ کسی طرح اتحاد و اتفاق قائم ہو جائے۔ نظیر اکبرآبادی کے دیوان سے خاص سبق یہی ملتا ہو کہ بیگانگی کی بڑی وجہ یہی ہو کہ ہندو مسلمان سکھ ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات مذہب علم ادب اور تمدن سے ناواقف ہین اسلیے آپس مین بیگانگی پیدا ہے۔ آج مسلمانون کو جس درجہ ہندوؤن اور سکھون کے مذہب روایات اور جذبات سے بیگانگی ہے اس سے کہین بڑھی ہوئی بیگانگی سکھون اور ہندوؤن کو مسلمانون کے مذہب روایات اور احساسات سے ہے یہی سبب ہو جو مسلمان

میرے مولا بلا لو مدینے مجھے“

فرط جوش سے گنگنا اٹھتا ہو تو ہندو اور سکھ چونکنے ہوتے ہین کہ آخر مدینے سے مسلمانون کو کیا تعلق ہے اسی طرح جب ہندو ”چندر گوپال آنند کھیلین ہوری رے کنھیا گھر“ گاتا ہے یا سکھ ”ست سری اکال جو بولے نو نہال ہو“ کے نعرے لگاتا ہے تو مسلمان بیگانہ وار منھ تکتا ہے۔ اگر آج ایک دوسرے

[illegible]

ہو جاتی ہیں .... مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے گرو نانک، سری کرشن جی، مہا دیو جی، وغیرہ کی بھی شان میں نظمیں دیکھیں جسے پڑھکر اس زمانے میں حیرت ہو گی کہ ایک مسلمان نے ان خیالات کا اظہار کیونکر کیا۔ اور کنھیا جی کی پیدایش، طفلی، بعنوان شباب اور شادی کا حال پڑھکر تو بیساختہ زبان سے نکلا کر نظیر ایک آل انڈیا شاعر ہے۔ بانسری کی تعریف۔

سب سنتے: اے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کرشن کنھیا نے بانسری"

اکبر الہ آباد منشی مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل کا مضمون "مسلمانوں کا بسایا ہوا پہلا شہر" ہندی ادب میں ایک کارآمد اور ضروری اضافہ ہے۔ ملک وملت کو اس وقت ایسے مضامین کی سخت ضرورت ہے۔ مضمون مذکور الصدر ہندی رسالہ سرسوتی میں شایع ہوا ہے جسکا ترجمہ اکبر نے شایع کیا ہے۔ اقتباس ذیل اسی کے ابتدائی حصہ سے لیا گیا ہے:-

"مسلمانوں نے اپنے زمانہ حکومت میں بہت سے اچھے اچھے کام کیے ہیں۔ انھیں میں خوبصورت شہروں کی تعمیر بھی ہے۔ ان کے بسائے ہوئے شہروں میں بہت سے برباد ہو چکے ہیں تاہم کچھ تو کچھ پرانی شان وشوکت کے ساتھ ابھی تک باقی ہیں اور اپنے بسانے والوں کی یاد دلاتے رہتے ہیں مسلمانوں کے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ بہت روشن خیال اور عادل تھے۔ آپ نے ۶۳۴ء سے ۶۴۴ء تک خلافت کی تھی۔ آپکے زمانے میں مسلمانوں کے اندر بہت سی اصلاحیں رونما ہوئیں سب سے پہلے آپ ہی نے نئے شہروں کی بنیاد ڈالی جس میں سب سے پہلے بصرہ آباد کیا گیا۔ اسکی بنیاد آپ ہی کے عہد یعنے ۶۳۵ء میں پڑی کسی وقت میں یہ شہر بہت بارونق اور علوم وفنون کا مرکز تھا۔ لیکن اب اسکی پہلی سی شان نہیں رہگئی۔"

مرقع لکھنو مولانا محوی صدیقی نے فلاسفہ اور حکمائے اسلام کے عنوان سے مرقع کے فروری نمبر میں ایک کارآمد سلسلہ مضامین شروع کیا ہے جس سے ذیل کا اقتباس نذر ناظرین ہے:-

"خلفائے عباسیہ نے بغداد کو علوم وفنون کا گہوارہ بنا دیا تھا سرکاری دارالترجمہ کے فاضل ارکان کے علاوہ اور بہت سے حکما وعلما نہایت انہماک اور شوق کے ساتھ یونانی علوم کو عربی میں منتقل کرتے۔ عربی کو ایک زبردست علمی زبان بناتے۔ ان علوم کو حیات جاوید بخشنے میں بڑی سرگرمی سے مصروف تھے مگر افسوس کہ انکے زیادہ تر علمی کارنامے اختلافات کی بے پروائی اور خانہ جنگیوں کی بدولت بہت کچھ ضایع ہو چکے ہیں اور جو کچھ باقی ہیں وہ آج بھی شکوہ سنج بے اعتنائی ہیں کسقدر عبرت کا مقام ہے کہ مستشرقین مغرب ایسے گرانبہا جواہر پاروں کو جو خاک گمنامی وبربادی کے نذر ہو چکے تھے نکال نکالکر برسوں کی محنت شاقہ اور صرف زر کثیر کے بعد شایع کر رہے ہیں اور بہت کچھ کر چکے ہیں۔ لیکن دلائے برحال ما کہ ہم ان سے اب بھی بے خبر ہیں۔ بلکہ انگریزی تعلیم کی برکت سے اپنے اسلاف کے زرین کارناموں سے کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔"

امتیاز ۱۱

اُردو رسائل کے خاص مضامین

(جنوری ۱۹۲۷ء)

زمانہ۔ کانپور

(۱) سابق قیصر جرمنی کا بیان
(۲) مرلا (افسانہ)

معارف۔ اعظم گڈھ

(۱) نفسیات جذبات
(۲) مسلمان اور سیر و سیاحت

ہمایون۔ لاہور (سالانہ نمبر)

(۱) دنیا کی مذہبی و معاشرتی تاریخ پر ایک نظر
(۲) اسلام کی شاعرہ
(۳) اقوال و افعال

جامعہ۔ دہلی

(۱) یونیورسٹی اور حیات قومی
(۲) حافظ اور تاریخ طبعی

نیرنگ خیال۔ لاہور

(۱) لاہور کی تاریخی اہمیت
(۲) انارکلی (ڈرامہ)

اردو۔ اورنگ آباد (دکن)

(۱) تصنیفات شیخ فریدالدین عطار
(۲) مبادیات تیاتر

نگار۔ بھوپال

(۱) شمالی ہند اور دکن
(۲) آغاز ہستی (ڈرامہ)
(۳) حالی اور نثر اُردو

شمع۔ آگرہ

(۱) شیخ علی حزین
(۲) نجات (افسانہ)

قوس قزح۔ لاہور

(۱) آفتاب
(۲) مغلوں اور عادل شاہیوں کے تعلقات

مرقع۔ لکھنؤ

(۱) جان عالم اور ملکہ مہر نگار
(۲) جان کیٹس

فروری ۱۹۲۷ء

زمانہ کانپور

(۱) کربلا (ڈرامہ)
(۲) بڑھے چلو
(۳) قانون کا پھندا

معارف اعظم گڑھ

(۱) مسلمان حکما اور یونانی مذاہب فلسفہ
(۲) علامہ مرتضی
(۳) گلبرگہ شریف اور اسکا نواح
(۴) ایک تحفہ اور اسکی قابل دید چیزین

جامعہ دہلی

(۱) ہندو فلسفے کی خصوصیت
(۲) مسلمانون مین اعلے مغربی تعلیم
(۳) باغ و بہار

سہیل علی گڑھ

(۱) سنجر و غزالی
(۲) مثنوی بوستان خیال
(۳) اصغر کی شاعری
(۴) قانعہ [illegible]

علیگڈھ میگزین علیگڈھ

(۱) بعد رابعہ
(۲) نظریہ تمدن

ہمایون - لاہور

(۱) اکبر کی انتظامی قابلیت
(۲) ریاضیات
(۳) دنیا کی مذہبی اور معاشرتی تاریخ پر ایک نظر

نگار - لکھنؤ

(۱) آغاز ہستی
(۲) شمالی ہند اور دکن
(۳) نظامی عروضی اور چہار مقالہ
(۴) درس محبت (فسانہ)

شمع - آگرہ

(۱) محکومیت نسوان
(۲) شمع مزار
(۳) نجات (فسانہ)
(۴) قرون وسطی مین ہندوستان کے براہ خشکی باربرداری اور آمد و رفت کے ذرایع

حقیقت کی حقیقت

دسمبر نمبر میں "مقدس ڈاکو نمبر ۲" کے تحت الفاظِ ذیل تحریر ہوئے تھے :-

"روزانہ اخباروں میں لکھنؤ کا وہ بے حقیقت اخبار جسکے اجراء کا گناہ عظیم راقم الحروف کے سر ہے خواجہ حسن نظامی صاحب کی اگر لیس پوٹ کر رہا ہے تو کچھ مقام تعجب نہیں کہ خود منادی کے اعلان کے بموجب اسے پچیس روپیہ ماہوار کا وظیفہ تبلیغی راجہ یا مقدس ڈاکو کی سرکار سے ملتا ہے۔"

مسٹر انیس احمد عباسی بی اے نے جو اس بے حقیقت اخبار کے مالک و اڈیٹر ہیں اسے پڑھ کر کالم کے کالم مجھے گالیاں دینے اور اپنی بے لوثی ثابت کرنے میں صرف کر دیے ہیں۔ پہلے تو وہ "پھول والے" کے فرضی نام کی آڑ میں رہے، اس لیے مطلق التفات کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ لیکن جب اُنکے دل کی بھڑاس یوں نہ نکلی اور اُنھوں نے ہمت کرکے اپنا نام ظاہر کیا تو مناسب معلوم ہوا کہ اخبار کے ناظرین خصوصاً اہلِ شہر کو غلط فہمیوں سے بچانے کے لیے اصل صورتِ حال واضح کر دی جائے۔

حقیقت کی گذشتہ زندگی اور اُس سے میرے تعلق کی بحث کو چونکہ خواجہ صاحب کی مالی امداد سے کوئی تعلق نہ تھا، اس لیے خلط مبحث نہ ہونے دینے کی غرض سے میں نے چاہا کہ مالی امداد کے مسئلہ کو پہلے صاف کر دیا جائے، اسکے بعد دوسرے موضوع پر ایک مفصل بیان تحریر کرکے اُن تمام غلط بیانیوں کی حقیقت عیاں کر دی جائے جو اڈیٹر حقیقت نے اپنے جرم کو چھپانے اور ناظرینِ اخبار کو مبتلائے فریب کرنے کے لیے ان مضامین میں کی تھیں۔

میری جو تحریریں حقیقت میں شایع ہوئیں اُن میں دکھایا گیا تھا کہ باوجودیکہ خواجہ صاحب نے منادی میں حقیقت کا نام لیکر وظیفہ کا اعلان نہیں کیا لیکن منادی میں جو کچھ چھپا اُس سے نتیجہ یہی نکلتا ہے۔ اور اگر خواجہ صاحب یہ بتا سکیں کہ ۲۵ عہ ماہوار جس روزانہ اخبار کو دینے کا اعلان کیا گیا تھا وہ حقیقت کے بجائے کوئی دوسرا پرچہ ہے تو اُسکے دفتر سے اسکی تصدیق کر لینے کے بعد میں نہایت خوشی سے اپنی غلطی کا اعتراف کر لوں گا۔ خواجہ صاحب ایسا نہیں کر سکے بلکہ اڈیٹر حقیقت کے شریک ہو کر مجھے گالیاں دیتے رہے اور اصل مبحث سے پہلو بچا کر لوگوں کو

اور کر لینے رہے کہ ایڈیٹر حقیقت نے جو خواجہ صاحب کی حمایت کی اُس میں کہیں مالی منفعت کا سوال نہ تھا لیکن مشک ہے اور اقت کی بو چھپائے نہیں چھپ سکتی۔ ایڈیٹر حقیقت نے میری تحریروں کے جواب میں اور بعد کو متعدد ایسے اعترافات کر لیے ہیں جنکی موجودگی میں خواجہ صاحب کی وظیفہ خواری کا تسلیم کرنا چنداں ضروری نہ رہا۔

غالباً انہیں نادانستہ اعترافات کے باعث اُنکے دوستوں نے جلد سے جلد اس بحث کو بند کر دینے کا مشورہ دیا اور جب میں نے حقیقت کے ساتھ اپنے ابتدائی تعلقات کی داستان قلمبند کرکے اشاعت کی غرض سے اُنکو بھیجی تو اُنھوں نے اُسکے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ ممکن تھا کہ یہ بیان کسی دوسرے مقامی اخبار میں شایع کرا دیا جاتا مگر کسے اتنی مہلت تھی کہ وہ اُس اخبار کے ناظرین کی آگاہی کے لیے بطور تمہید اس ساری بحث کا خلاصہ لکھتا۔ بہر حال نامناسب نہ ہوگا اگر ایڈیٹر حقیقت کے بعض اعترافات و بیانات سے ناظرین الناظر بھی روشناس کرا دیے جائیں تاکہ دسمبر میں جو کچھ عرض کیا گیا تھا اُسکے متعلق کم سے کم اُنھیں کوئی غلط فہمی نہ ہو۔

پہلا اعتراف:- (حقیقت - ۱۷ فروری ۱۹۲۷ء) " حالانکہ اس سوا سال میں علاوہ معمولی آمدنی کے یکمشت (۵۰۰) پانچسو روپیہ اور صرف کے عطایا بھی حاصل ہوئے "

دوسرا اعتراف:- (حقیقت - ۲۰ - مارچ ۱۹۲۷ء) " چیف سکرٹری صاحب (حکومت صوبجات متحدہ) نے اول تو اپنی جیب خاص سے حقیقت کو کوئی عطیہ نہیں دیا تھا بلکہ دیگر اخبارات کی طرح حقیقت کو بالشوک اشتہارات کی اشاعت کے معاوضہ میں پچاس روپیہ فی صفحہ کے حساب سے دس صفحوں کی اُجرت پانچسو روپیہ دی گئی تھی "

خطوط کشیدہ الفاظ سے تناقض بیاں خود بخود عیاں ہے۔ البتہ دو باتیں مزید تصریح کی محتاج ہیں (۱) "بالشوک اشتہارات" کون بلا ہے (۲) حقیقت کی طرح کون کون سے دوسرے اخبارات کو اس معاملت کا فخر حاصل ہوا؟ ایڈیٹر حقیقت یا چیف سکرٹری صاحب سے کوئی دریافت کر سکے تو پبلک کی بڑی خدمت ہو۔

تیسرا اعتراف:- (حقیقت مورخہ ۲۰ - مارچ ۱۹۲۷ء) " اودھ خلافت کمیٹی سے بیشک منجملہ ایک ہزار کے وعدہ کے صرف ڈیڑھ سو روپیہ یا کچھ زیادہ اور شاید تین چار تک تھیروں کے ٹکڑے وصول کیے گئے تھے .... اودھ خلافت کمیٹی نے حقیقت کو اپنا آرگن بنا کر اسکو روزانہ کرنے کیلئے ایک ہزار روپیہ بطور قرض حسنہ اور پریس کے چند مستعمل تھیر دینے کا وعدہ کیا تھا ....

حقیقت کے روزانہ ضمیمہ کی اشاعت میں جو صرف ہوا تھا اُسکے بعد جو رقم ڈیڑھ سو میں سے
بچ رہی تھی وہ شیخ شوکت علی صاحب کو واپس کر دی گئی ۔۔۔۔ تین چار شکستہ پتھروں کے
ٹکڑے جنکی قیمت کا تخمینہ مجموعی طور پر آٹھ دس روپیہ سے زیادہ نہ تھا وہ بیشک
حقیقت پریس کے ذمہ واجب ہیں "

(اودھ خلافت کمیٹی کے حساب کی جانچ ۱۹۲۲ء کے آخر میں کی گئی تھی۔ جانچ کے دوران میں معلوم ہوا کہ تین سو روپیہ مسٹر انیس احمد عباسی کو قرض کے نام سے دیا گیا جسکی رسید موجود تھی۔ واپسی کی رقم کا کہیں اندراج نہ تھا۔ مولوی عبدالماجد صاحب صدر اودھ خلافت کمیٹی کا فرض ہے کہ وہ حسابات دیکھ کر اپنا اطمینان کر لیں۔ اور قرض دی ہوئی رقم مع پتھروں کی قیمت کے ایڈیٹر حقیقت سے وصول کر لیں۔ باقی رہا یہ امر کہ ایک طرف حکومت سے رقم لی جاتی رہی اور دوسری طرف اُس قومی مجلس میں دخیل رہے جو حکومت سے برسر جنگ تھی' اسکا رونا کہاں تک رویا جائے گا۔ کانگریس اور خلافت کمیٹیوں کو سب سے زیادہ نقصان ایسے ہی لوگوں سے پہونچا جو مار آستین بنکر قومی مجلسوں کے تمام اندرونی حالات سے حکومت کو واقف کرتے رہے۔ اسوقت بھی حقیقت اور بعض دیگر اسی قسم کے اخبارات کو غور سے پڑھنے والے بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ لبرل' پنجابی لبرل' اور "کمیونکیٹڈ" وغیرہ کے سر جو مضامین تھوپے جاتے ہیں اور جن میں سے بعض دانستہ یا نادانستہ اُن اخبارات میں بھی چھپ جاتے ہیں جنکی حب قومی و وطن دوستی مسلّم ہے وہ کس دفتر میں تیار ہوتے ہیں۔ گو یہ معلوم کرنا شاید دشوار ہو کہ ان "اشتہارات" کی کیا اجرت حقیقت وغیرہ کو ملتی ہے)

چوتھا اعتراف (حقیقت - مورخہ ۱۶- اپریل ۲۷ء) " گذشتہ تین ماہ میں حقیقت اور ایڈیٹر حقیقت کو
ایسی شدید مالی مشکلات لاحق رہی ہیں کہ اخبار کی زندگی خطرہ میں پڑ گئی تھی اور روزافزوں
مصائب سے عاجز آکر ہم نے ارادہ کر لیا تھا کہ اخبار کو بند کر دیں گے۔ مختلف طور پر وقتاً
فوقتاً بعض احباب سے تقریباً چھ سو روپیہ قرض لیکر کام چلایا گیا۔ آج ہمکو یہ اعلان
کرنے کی ضرورت ہے کہ اس بارے سابقہ دوش کرنے میں حقیقت کے لیے حسب ذیل امدادی
رقوم گذشتہ دو ماہ میں وصول ہوئیں جن سے قرضہ کا بڑا حصہ ادا ہو گیا .... لیکن ہنوز
اخبار کی مالی حالت قابل اطمینان نہیں ہو سکی ہے (فہرست عطایا)
خان بہادر قاضی عزیز الدین احمد (ترکی حماقت کے مشہور مولف مصنف) ۱۰/

سید یوسف علی صاحب پرنسپل ہیوٹ انجنیرنگ اسکول لکھنؤ   ۱۰/

الہ آباد کے ایک معزز رئیس (سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے نام چھپایا گیا)   ۱۰/

حضرت خواجہ حسن نظامی (مولانا محمد علی کی مخالفت کے انعام میں یا تبلیغی وظیفہ)   للعہ/

راجہ صاحب سلیم پور (انتخابات میں تائید کا صلہ)   صہ/

ایک محترم رئیس جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے (شماتت ہمسایہ کے ڈر سے)   وعہ/

"...... اب اخبار پر قرض کی مد میں کم و بیش دو سو روپیہ کا بار اور رہ گیا ہے"

(خواجہ صاحب دس روپے اور بھیج دیں تو جنوری سے اپریل تک کا وظیفہ پورا وصول ہونے کی رسید لکھ دی جائے) ناظرین الناظر کو یہ سن کر بہت اطمینان ہوگا کہ اخبار میں اس تحریر کو شایع ہوئے دس دن مشکل سے گذرے ہوں گے کہ دفتر حقیقت میں ہن برس گیا۔ اور نا معلوم بارش زر کی بدولت نہ صرف اخبار کا بقیہ دو سو روپیہ کا قرض ادا ہوگیا، بلکہ اسکے مرجھائے ہوئے نخل امید میں از سر نو برگ و بار پیدا ہوگئے چنانچہ ۲۹ - اپریل کے حقیقت میں جلی حروف کے اندر اعلان ذیل درج تھا:

> **روزنامہ حقیقت میں انقلاب**
>
> "الحمد للہ گذشتہ چار سال میں روزانہ حقیقت نے اپنے بیش بہا مضامین کی بنا پر جس قدر ہر دلعزیزی اور کامیابی حاصل کی ہے کہ اب ۱۰ - مئی سے روزانہ حقیقت ۱۸ - ۲۲ کے بجائے بڑی تقطیع ۲۰ - ۲۶ پر شایع ہوگا"

چونکہ اسی تاریخ سے ڈاکٹر ضیاء الدین کی حمایت اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی مخالفت میں ایک طولانی سلسلہ مضامین بھی شروع ہوگیا، اس لیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حقیقت کے مرجھائے ہوئے پودے میں جس بارش زر کی بدولت دفعتاً تازگی پیدا ہوگئی اسکے بادل کالے سے متھرا جانے کے بجائے کوئل سے اجودھیا کی طرف آئے تھے۔ اور راستہ میں لکھنؤ کے باورچی کو بھی سیراب کرگئے۔

حقیقت کی ہر دلعزیزی کی شہادت ہم بھی دے سکتے ہیں کہ ہندوستان بھر کے تمام روزانہ اردو اخبارات میں اشاعت کی کمی کے لحاظ سے سب میں ممتاز یہی اخبار رہتا ہے۔ اور دنیا جانتی ہے کہ قیمتی چیزیں مقدار میں ہمیشہ کم ہی ہوا کرتی ہیں۔ مولانا محمد علی صاحب اور دیگر اخبارات کے مالکان و منتظمین کو چاہئے حقیقت سے اخبار کے انتظام میں سبق لینا چاہیے کہ

اخبار کی ہزاروں کی اشاعت کے مقابلہ میں حقیقت صرف تین ساڑھے تین سو چھپتا ہے اور پھر بھی تین چار مہینے کے اندر چھ سو سے قرض بڑھنے نہیں پاتا۔

ایڈیٹر حقیقت کو خدا معلوم یہ غلط فہمی کیوں ہے کہ میں انھیں اپنا رقیب تصور کرتا اور انکی یا انکے اخبار کی ترقی دیکھ دیکھ کر رشک وحسد سے کباب ہوا جاتا ہوں۔ رشک وحسد کے لائق جس قدر وہ یا ان کا اخبار ہے اس کا اندازہ کسی قدر سطور بالا سے ہو گیا ہوگا اور غالباً ناظرین الناظر اور اہل لکھنؤ اس سے بھی بے خبر نہیں کہ میری انکی راہیں مختلف، طریقۂ کار مختلف اور شاید مقاصد زندگی بھی مختلف ہیں۔ اس لیے میں ان کا یا وہ میرے حریف نہیں ہو سکتے۔

ان کو اخبار نویسی کے ذریعہ روپیہ کمانا ہے۔ میں سترہ اٹھارہ سال سے برابر اپنی ذاتی آمدنی کو بھی اسی راہ میں گنوا دیتا ہوں۔

انھیں روپیہ کمانے کے لیے زرداروں اور مقتدر لوگوں کی موافقت اور قصیدہ خوانی کرنا آتی ہے۔ یہاں سرے سے یہ اہلیت ہی مفقود ہے۔

وہ گرگٹ کے رنگوں کی طرح اپنے اصول کار اور اپنے اخبار کی پالیسی کو ہر سال کیا معنی، ہر ہفتہ، بلکہ شاید ہر روز یا ایک دن میں بھی کئی بار بدل سکتے ہیں۔ مجھے بارہا احباب کے طعنے سننا پڑتے ہیں کہ میں جلد جلد رائے تبدیل کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوں۔

انکو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نہ تو خدا کا خوف ہے نہ ضمیر کی ملامت کا اندیشہ۔ اور بہت ممکن ہے کہ خود فطرت نے ضمیر جیسی فضول اور غیر مفید شے کے داعیات کا انکو مکلف بنانا ہی پسند نہ کیا ہو۔ اور مجھے یہ بیماری نہ ہوتی تو شاید انیس احمد صاحب کے نقطۂ نظر سے آج میری حالت انکے لیے ضرور قابل رشک ہوتی۔

انھیں میونسپل کمشنری کا ایسا سودا ہے کہ تین انتخابات میں پے بہ پے شکست پانے کے بعد بھی وہ حقیقت کی کمائی کو اس جوے پر لگانے کے لیے ہر وقت آمادہ و تیار رہتے ہیں۔ اور عجب نہیں کہ ذرا اور ابھر پائیں تو پھر کونسل اور اسمبلی کی ہوس بھی پیدا ہونے لگے ہیں۔ ایسے کھیلوں کے پاس بھی نہیں پھٹکا چاہتا۔

انکو اپنے مذہب سے جتنا لگاؤ ہے وہ صرف اسی سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ حقیقت میں

حضرت خلیفۂ اول رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر تبرا چھپا اور جناب حافظ ساجد علی صاحب عباسی وکیل اورنگ آباد دکن کو اُنھیں متنبہ کرنا پڑا۔ لیکن اسکے بعد بھی اُسی تبرہ بازی کے مضامین برابر شایع ہوتے رہتے ہیں۔ حالانکہ اُسکے مضامین میں سوا اسکے کوئی خوبی نہیں کہ وہ مختلف پہلوؤں سے سنیوں کے لیے اشتعال انگیز ہوں ـــــ یہی نہیں، بلکہ جناب مولانا عبد الشکور ایڈیٹر النجم جیسے متشرع عالم دین کے خلاف ایک رسالہ بطور ضمیمہ کے حقیقت میں برابر چھپا رہتا ہے۔ نماز روزہ وغیرہ تو ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں فیشن سے خارج ہیں، اُن سے ایک تعلیم یافتہ ایڈیٹر کو کیا سروکار ہو سکتا ہے۔ البتہ سود کی ترویج، تھیٹر، سنیما، ناچ رنگ کے جلسوں اور اسی قسم کی مہذب زندگی کے دیگر اشتغال کے لیے وہ ہر وقت حاضر ہیں۔ رہا میں سو مجھے تو مولانا محمد علی تک کے دریا رسے وہابی ہونے کا لقب حاصل ہے۔ اور انگریزی عدالت اس سے پیشتر مذہبی جنون کی سند عطا کر چکی ہے اگر اتنا اور بتا دوں کہ خواجہ حسن نظامی جواب غصہ کی حالت میں عقل سے بے بہرہ ہو کر لکھتے ہیں کہ

"ایڈیٹر الناظر کو اپنے دماغ کی تشخیص بھی کرانی چاہیے کہ وہ ٹھیک حالت میں ہے یا نہیں" (حقیقت - ۱۷ - فروری)

مئی سنہ ۲۶ء میں اسپیشل خلافت کانفرنس کے بھرے اجلاس میں وہ بھی اہل دہلی سے میری مذہبیت و جوش دینی کی ثنا و صفت کر چکے ہیں، تو غالباً ایڈیٹر حقیقت کو میرے اس اعترافِ جرم پر زیادہ عتاب کرنے کا موقع نہ رہے گا۔

ایڈیٹر حقیقت گورنمنٹ سے روپیہ پائیں خلافت کمیٹی سے قرض حسنہ لیں، اور اس صوبہ لکھنؤ ہی کے اہل ثروت سے نہیں، بلکہ بمبئی، کلکتہ اور ڈھاکہ تک کے زرداروں سے روپیہ بٹوریں، مگر میرے لیے الحمد للہ کہ خدا نے اس قسم کے سب دروازے بند کر دیے ہیں۔

اتنے کثیر شواہد اختلاف کی موجودگی میں کون اسے باور کریگا کہ میں جو کچھ اُنکے متعلق رائے ظاہر کروں وہ کسی جذبۂ رقابت یا رشک و حسد کا نتیجہ کہے جانے کی مستحق ہوگی۔

بے شبہ ایڈیٹر حقیقت کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ میں اُنکے اخبار اور خود اُنکی روش کا مخالف ہوں۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو تعجب کرنا چاہیے تھا۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اُنکے ساتھ بہت رعایت ملحوظ رکھی۔ الناظر میں بھی اس سے قبل صرف دو ایک ہی کچھ لکھا گیا اور اہل شہر کو بھی میں نے [illegible] [illegible] [illegible] ایک صدی تک جا سکے

نظرے خوش گزرے

آخر ماہ فروری میں سالانہ خلافت کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی تو اعلان سابق کے بموجب میں اُس میں کوئی عملی حصہ نہ لے سکا - باہر سے جو مہمان آئے ہوئے تھے اُن میں سے ایک بزرگ کی زیارت کے لیے ایک روز شام کو اپنے کاموں سے فارغ ہوکر مہمانوں کی قیامگاہ تک ضرور گیا - اتفاق سے اُسی دن لاہور سے اخبار زمیندار کا ایک پلندہ وصول ہوا تھا جس میں زمیندار مورخہ ۲۹ فروری ۲۷ء کے پرچے تھے اس پرچہ میں غازی عبد الرحمن صاحب معتمد صوبہ خلافت کمیٹی پنجاب کا ایک بیان تھا جسکے مخاطب اراکین خلافت کمیٹی تھے - یہ خیال کرکے کہ غازی صاحب نے تقسیم کی غرض سے بھیجے ہیں، میں ان پرچوں کو ساتھ لیتا گیا اُسوقت مرکزی کمیٹی کا جلسہ منعقد تھا اور نماز مغرب کے لیے لوگ اُٹھ رہے تھے - میں نے پہونچتے ہی شعیب قریشی صاحب اور بعض دیگر احباب کو ایک ایک پرچہ دیدیا، اور نماز میں شریک ہوگیا - نماز کے بعد جلسہ کے عقب میں بیٹھکر بعض دوستوں سے گفتگو کر رہا تھا کہ ایک ایسے دوست نے جو صلح و رواداری، معقول پسندی و اصابت رائے کا مجسمہ سمجھے جاتے ہیں میرے اس طرز عمل پر طعن و تشنیع شروع کردی اور بالآخر تھوڑی ردو قدح کے بعد بقیہ پرچے مجھ سے مانگ لیے ——— اور مجھے شبہہ ہے کہ بجائے تقسیم کرنے کے اُنھوں نے ضائع کردیے ہوں گے -

مولانا محمد علی صاحب نے ہمدرد کی دو اشاعتوں میں خلافت کمیٹی سے میری "روپوشی" اور اخبار زمیندار کی تقسیم کو جس طریقہ پر ہدف طنز و تعریض بنایا ہے اُس نے میرے اس خیال کو مزید تقویت دیدی ہے کہ فرقہ بندی کا بھوت ہمارے سرداروں پر اس طرح مسلط ہے کہ عرصہ تک اُن سے قوم کو کسی خیر و فلاح کی توقع نہ کرنا چاہیے -

زمیندار کا وہ پرچہ خدانخواستہ بم کا گولہ نہ تھا کہ مجلس خلافت کے محترم ارکین کی جانیں اُس کے خطرہ میں پڑجاتیں - پھر جو اخبار ہزاروں کی تعداد میں ملک کے اطراف و جوانب میں شائع ہوچکا ہو اُسکے چند پرچوں کی تقسیم و اشاعت پر اظہار ناراضی کے معنی ؟

یہ نہیں تو اُس دفتری اقتدار نے [illegible] پاکستان میں جسکے خلاف کبھی ہماری قوم نے آواز [illegible]

[illegible] اور جو محض ذاتی اغراض کی بنا پر کام کرنا [illegible] کیلیے ہر وقت کمربستہ رہتی اور [illegible]

طریقے ایجاد اور جدید آلات تیار کرتی رہتی ہے لا حول ولا قوۃ، میں بھول گیا کہ اُس مردِ دانا سے جسے دنیا مہاتما گاندھی کے نام سے پہچانتی ہے، آج نہیں بلکہ تحریک ترک موالات کے عہد شباب میں اظہار اس خطرہ کی تشویش کی تھی کہ کہیں اجنبی دفتری اقتدار کو ہٹانے کے بعد تعلیم یافتہ اہل ہند کا ایک جدید دفتری اقتدار اس ملک پر مسلط نہ ہو جائے، اور بے شبہ یہ سارے آثار اُسی کے ہیں ورنہ ممکن نہ تھا کہ جو اصحاب خلافت راشدہ کے نمونہ کی حکومت حجاز میں قائم کرنے کے متمنی ہیں وہ خاص اس ملک کے اندر اس فرنگی نمونہ کے استبداد کی تقلید کو جائز رکھتے۔

ہمارے یہ عزیز دوست جو کل تک اپنی وہابیت پر اس قدر نازاں تھے کہ اخباروں میں اس کی نمائش تک سے دریغ نہ کرتے تھے اس پر بہت بگڑتے ہیں جب ہم مقلد وہابیوں کی طرف سے بیسویں صدی کے مجتہد اعظم حضرت مولانا محمد علی صاحب اور اُنکی ذہنیات کے متعلق کبھی یہ کہدیا جاتا ہے کہ انکے اجتہادات اس مغربی تعلیم و تہذیب سے متاثر بلکہ اسی تخیل کی تخلیق ہوتے ہیں جو گھن کی طرح تمام تعلیم یافتہ ہندوستان کے دماغ میں پیوست ہو چلی ہے۔ لیکن میں اُن ہی سے پوچھتا ہوں کہ گذشتہ چند ماہ کے اُن واقعات کے علم کے بعد جو خاص مجھ پر بیتے ہیں سوائے اسکے کوئی دوسری رائے قائم کرنا ممکن ہے؟

گذشتہ اکتوبر میں مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم وغیرہ کی دعوت پر لکھنؤ میں ایک جلسہ ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندوی اُس جلسہ کے صدر تھے۔ جلسہ میں التوائے حج کے خلاف ایک تجویز منظور کی گئی۔ جلسہ کی کارروائی اور تجویز کا خلاصہ تار کے ذریعہ جن اردو و انگریزی اخبارات کو بھیجا گیا، سب نے اُسے چھاپ دیا۔ لیکن تاروں کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دینے کا فخر صرف ہمدرد و خلافت کو حاصل ہوا جو ایک طرف اگر خلافت راشدہ کے نمونہ کی حکومت قائم کرنے میں انتہائی جد و جہد کر رہے ہیں تو دوسری طرف التوائے حج کو ابن سعود کے خلاف بطور ایک سیاسی حربہ کے استعمال کرنے کے مؤید ہیں۔

چند ماہ بعد الناظر میں مہاراجہ محمود آباد کے تار بنام ملک معظم کے سلسلہ میں بعض معروضات حضرت مجتہد الزماں کی بارگاہ میں پیش کیے گئے۔ جس پرچہ میں یہ مضمون شائع ہوا اُسی سے مقدس ٹاکو والا مضمون ہمدرد میں نقل کر لیا گیا مگر جن معروضات کے مخاطب خود ایڈیٹر صاحب تھے انکے متعلق جب ایک دوسرے موقع پر انہیں قلم اٹھانا پڑا تو یہی نہیں کہ انھوں نے انکے مطالعہ سے اعراض فرمایا بلکہ اُن بے دیکھے راقم الحروف کے بیانات کی تردید فرمادی۔ اور جب ہمدرد کی

اس زیادتی کے خلاف ایک رجسٹری شدہ احتجاج نامہ روانہ کیا گیا تو اسکی اشاعت تو جدا رہی، ایڈیٹر صاحب ہمدرد نے باوجود میری درخواست کے اُسے واپس تک نہ فرمایا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ آج سے تیرہ چودہ سال بیشتر جب ہمارے مجتہد زماں اور جناب سید وزیر حسن سابق سکرٹری مسلم لیگ مسجد کانپور کے سلسلہ میں لندن تشریف لیگئے اور وہاں کے اخبارات نے انکی بعض تحریروں کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جو اب ایڈیٹر ہمدرد نے محض اختلاف رائے کی بنا پر راقم الحروف کی تحریر کے ساتھ کیا ہے تو ہمارے ان بزرگوں نے لندنی اخبارات کے خلاف زمین و آسمان سر پر اُٹھا لیا تھا۔ میرے دوست ہی غور فرمائیں اور بتائیں کہ لندنی اخبارات اور ہمدرد کے رویہ میں کوئی بھی فرق ہے؟ اور اگر لندن والوں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار جائز تھا تو کوئی وجہ ہے جسکی بنا پر ہندوستانی استبداد کی اس نمائش پر حضرت مجتہد زماں سے بازپرس نہ کی جائے۔

آپ دوسروں کو وہابیت اور حرب عقائد کے طعنے دیتے ہیں لیکن کبھی اس پر بھی غور فرمانے کی زحمت گوارا کرتے ہیں کہ ہمدرد کے مقالہ افتتاحی کے اوپر جو قرآن کریم کی آیات درج ہوتی ہیں، اُنپر کہاں تک عمل کی توفیق خود آپ کو نصیب ہے اور آپ سے زیادہ حرب عقائد اور وہابیت کے مظاہرہ میں کون مبتلا ہے؟ کیا قرآن ہی بتاتا ہے کہ ہر اُس شخص کو جو آپ سے مختلف رائے رکھتا اور اُسکے اظہار کی جرأت کرتا ہو آپ وہابی اور "روپوش" وغیرہ کے طنز آمیز لقبوں سے یاد فرمائیں؟ کیا قرآن کی تعلیم یہی ہے کہ وہی مولانا سید سلیمان ندوی جب آپ کے ساتھ بیٹھ کر تجاویز کی تیاری یا منظوری میں حصہ لیں تو آپ اُنکو اپنے جلسوں اور وفود کا صدر مقرر کریں اور اُنکی ہر کارروائی کو تدبر و فراست و دینداری و جوش ملی کی سند عطا فرمائیں اور جب اتفاق سے کسی معاملہ میں وہ آپ سے مختلف رائے رکھتے ہوں اور اُسکے اظہار کیلیے آپ کی مجلس سے الگ کسی دوسرے مجمع میں شرکت فرمائیں تو آپ اُنکی باتوں کو پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت دینا پسند نہ کریں ——— وقعت دینا درکنار اُس جلسہ کی کارروائی تک اپنے اخبار میں درج نہ کریں جو اُنکی صدارت میں منعقد ہوا تھا حالانکہ ہندو سبھا تک کے جلسوں کی کارروائی چھاپنے میں کبھی آپ کو تامل نہیں ہوتا۔

کیا قرآنی احکام سے یہی کلیہ نکلتا ہے کہ آپ باوجود اس اعتراف کے کہ مذہبی عالم نہیں، حج جیسے مذہبی مسئلہ یا ملوکیت وغیرہ کو ناجائز قرار دینے کے لیے بیباکانہ اظہار رائے فرمادیں اور علمائے مذہب کی رائے کو اپنے تنافر اور خود غلط زعم کی ٹھوکروں سے پامال کردیں۔

مولانا ظفر علی خاں اور حضرات اہل حدیث کے خلاف آپ جو کچھ الزامات عائد کرتے ہیں ممکن ہے کہ اُنکے باور کرنے کے آپ کے پاس کافی وجوہ ہوں۔ لیکن راقم الحروف کے بارے میں تو غالباً آپ کا یہ خیال نہیں کہ وہ بھی سلطان ابن سعود یا اُنکے ہوا خواہوں کا رہین منت ہے۔ خود آپ کے ساتھ اور مجلس خلافت کے ساتھ بھی آپ کو خوب معلوم ہے کہ اس عاجز کا طرز عمل کیا رہا ہے۔ آپ نے اگر نہیں تو آپ کے برادر بزرگ مولانا شوکت علی صاحب نے ابھی گذشتہ خلافت کانفرنس دہلی ہی کے موقع پر اس ناچیز کے بارے میں جو رائے ظاہر فرمائی ہے وہ ہمدرد کے کالموں میں محفوظ ہے۔ ایسی حالت میں کیا آپ اپنے تئیں حق بجانب سمجھتے ہیں کہ التواء حج کے مسئلہ میں آپ سے مخالف رائے رکھنے، ملوکیت کو جائز سمجھنے اور انتظام حجاز کی خاطر ہندوستان میں باہمی جنگ کو غیر مستحسن جاننے کی بنا پر آپ میرے ساتھ وہی طرز عمل اختیار کریں جو کل تک فرنگی محل اور بریلی والوں کا طغرائے امتیاز تھا۔ اور کیا حرب عقائد کی اس سے درخشاں تر مثال مل سکتی ہے کہ اُس شخص کو جسے کل تک اخلاص و وفاداری کی سندیں دی جا رہی تھیں، آج محض اختلاف رائے اور آپ کی معصومیت کے اعتراف سے انکار کی بنا پر آپ ہدف ملامت اور نشانۂ تعریض بنانا پسند فرماتے ہیں۔ ہندی مثل سچ ہے کہ "کڑوا کڑوا تھو میٹھا میٹھا ہپ"۔ آپ کے مقدس ڈاکو صاحب نے بھی اسپیشل خلافت کانفرنس دہلی کے موقع پر اس گنہگار کو جلسۂ عام میں خدمات قومی و دینی وغیرہ کی بنا پر سند خوشنودی عطا فرمائی تھی، مگر اُسوقت تک آپ نے اُن کی جاسوسی کا راز فاش نہ کیا تھا اور الناظر کے مضامین شایع نہ ہوئے تھے۔ اُنکے شایع ہونے کے بعد حقیقت کی مالی امداد کے ضمن میں جو تحریریں اُنکی شایع ہوئی ہیں اُن میں حسد و حمق ہی کا الزام مجھ پر نہیں لگایا گیا ہے بلکہ "دماغ کی تشخیص کرانے" کا بھی مشورہ دیا گیا ہے۔ مقدس ڈاکو صاحب جس قماش کے ہیں اُس کا حال اب سب کو معلوم ہو چکا ہے، مگر ایڈیٹر ہمدرد کو تو مغلوب الغضب ہو کر یا اختلاف رائے سے گھبرا کر اُسی سطح پر نہ آجانا چاہیے۔

مسئلۂ حجاز پر اب تک جب کبھی الناظر میں کچھ لکھا گیا تو محض اشارات پر قناعت کی گئی۔ ابن سعود کی موافقت یا مخالفت سے زیادہ مسلمانوں کے مفاد عامہ پر نظر رہی اور ہندوستان کے اندر باہمی نزاع اور افتراق بڑھانے پر ملامت کی گئی۔ لیکن اب اگر فرصت ملی تو انشاء اللہ تفصیل کے ساتھ اس ساری بحث پر اپنے ذاتی خیالات پیش کر دیے جائیں گے۔ دوستوں کو اختیار ہے کہ میری ناچیز رائے کو قبول کریں یا اپنی موجودہ روش پر قائم رہ کر اغیار کو مضحکہ اُڑانے

اور اپنا اُلّو سیدھا کرنے کا موقع دیں۔

یاد ہوگا کہ جمعیۃ العلماے ہند کی طرف سے بھی ایک وفد گذشتہ سال موتمر اسلامی میں شرکت کے لیے مکہ معظمہ گیا تھا۔ وفد کی واپسی پر جمعیۃ کے اخبار الجمعیۃ کی طرف سے مشتہر کیا گیا کہ وفد کی رپورٹ الجمعیۃ میں شایع ہوگی لہذا لوگ اسکے خریدار بن جائیں۔ مگر جہاں تک ہمیں علم ہے وفدِ جمعیۃ کی رپورٹ آج تک تو شایع نہیں ہوئی۔

الجمعیۃ میں گذشتہ سال ملوکیت وجمہوریت کی بحث پر ایک انعامی مقابلہ کا بھی اعلان کیا گیا تھا۔ اور اگر ہماری یاد خطا نہیں کرتی تو نہیں یہ بھی شایع ہوا تھا کہ ملوکیت کی تائید میں زائد مضمون موصول ہوے ہیں۔ ہم جناب مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب صدر اور جناب مولانا حافظ احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ العلماے ہند کو "اوفوا بالعہد" کے قرآنی حکم پر توجہ دلاتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ جلد سے جلد ان فروگذاشتوں کا تدارک فرمائیں۔ ورنہ اُن کی مجلس کا اخبار جو الزامات سلطان ابن سعود پر عائد کرتا رہتا ہے وہی قرار دادِ جُرم خود اُنکی مجلس پر لگائی جا سکے گی۔

اسی ضمن میں نامناسب نہ ہوگا اگر ہم الجمعیۃ کی اس روش پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیں کہ اُس نے حیدرآباد کے دار الترجمہ کی نظامت کے جھگڑے میں خواہ مخواہ دخل دیا۔ ہمیں معلوم ہے کہ ایڈیٹر الجمعیۃ کے بھائی صاحب بھی اسی دار الترجمہ کے رکن ہیں اور اس سبب سے اُنکی خانگی دلچسپی لائق گرفت نہیں ہو سکتی مگر جمعیۃ علماے ہند کے اخبار کے لیے یہ زیبا نہیں کہ دوسرے غرضمند اخباروں کی طرح وہ بھی دیسی ریاستوں کے ذرا ذرا سے اندرونی معاملات میں دخل دے اور جمعیۃ کے اخبار کو اپنے ذاتی مقاصد کا آلۂ کار بنائے۔ مجھے اُسکے نوٹ کو پڑھ کر دلی صدمہ ہوا۔ اس لیے کہ خواہ اُسکی بعض رایوں سے کتنا ہی اختلاف ہو مگر ہے وہ ایک جماعتی معاملہ۔ اور جب شخصی منافع سے اُسکا دامن آلودہ ہوگا، تو دوسروں سے کیا امید فلاح ہو سکتی ہے۔

گذشتہ جنوری میں سرکاری گزٹ میں ہندوستانی اکیڈمی کے عہدہ داران و اراکین کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ جولائی ۲۶ء میں اکیڈمی کا جو خاکہ پیش کیا گیا تھا اُس میں اراکین کی تعداد ۵۰ تھی۔ اب گھٹا کر ۳۶ کر دی گئی۔ جس میں سے ۳۰ حکومت نے نامزد کر دیے اور ۶ کا انتخاب

ان نامزد شدہ اراکین پر چھوڑ دیا گیا۔ مارچ میں گورنر صاحب کی صدارت میں اکیڈمی کا بنیادی جلسہ بھی ایک تقریب کی صورت میں ہو گیا۔ جس میں مجلس انتظامی کے نامزد شدہ ۷۔ اراکین کا بھی اعلان کر دیا گیا۔ دوسرے روز اکیڈمی کے اراکین کا پہلا جلسہ منعقد ہوا اور اُن چھ اشخاص کا انتخاب بھی ہو گیا جنکو اپنے میں ملانے کا حق انھیں عطا ہوا تھا۔ اور آیندہ کے لیے نظام عمل تیار کرنے سے پہلے اکیڈمی نے ہندی اور اُردو میں اب تک جو کچھ کام ہو چکا ہے اُسکی رپورٹ تیار کرنے کے لیے دو ذیلی مجالس بنا دیں۔

اکیڈمی کے چھتیس اراکین میں سے تقریباً بیس ایسے اصحاب ہیں جو اُردو کے شعبہ میں عملی دلچسپی لے سکیں گے اور مجلس انتظامیہ میں بھی عہدہ داروں کے علاوہ اُردو کے چار نمایندے ہیں۔ اراکین میں صوبہ کے تقریباً ہر طبقہ کے نمایندے ہیں اور اگرچہ اس قسم کے انتخاب میں اختلافِ رائے کی ہمیشہ گنجایش باقی رہتی ہے لیکن ذاتی طور پر ہم سمجھتے ہیں کہ انتخاب بحیثیتِ مجموعی بہت مناسب ہوا ہے۔ البتہ بعض اصحاب کے مشوروں سے اکیڈمی کا محروم رہنا ضرور لائق افسوس ہے۔ کارکنانِ دار المصنفین کے نام پہلی فہرست میں موجود تھے مگر اب اُن کا کوئی نمایندہ نہیں ہے حالانکہ ان خاموش ادبی خدمتگذاروں کے مقابلہ میں بعض بہت ہی کم اہمیت کے لوگ اس مجالس میں لیے گئے ہیں۔ اور مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو کو شرکت کی دعوت نہ دینا تو یقیناً بہت ہی بڑی فروگذاشت ہے۔ ہمیں اسکا بھی افسوس ہے کہ مولانا شرر مرحوم کے نام کے ساتھ خود ہم نے مولوی عبدالحق صاحب کا نام کیوں نہ پیش کیا۔ مگر درحقیقت اُسوقت تک چونکہ اکیڈمی کا طریقِ کار متعین نہیں ہوا تھا اس لیے ہمیں اندیشہ رہا کہ مولوی عبدالحق صاحب بُعدِ مسافت کی وجہ سے اس میں شرکت نہ فرما سکیں گے مگر اب جبکہ یہ طے پا گیا ہے کہ اراکین اکیڈمی کی حیثیت مجلسِ وضع آئین و قوانین کے ارکان کی سی ہوگی یعنی وہ سال میں دو مرتبہ مجتمع ہو کر تبادلۂ خیال کے بعد مجلس انتظامی کی ہدایت کے لیے چند تجاویز پیش کر دیا کرینگے تو بُعدِ مسافت مولوی صاحب کی شرکت میں حارج نہیں ہو سکتا۔

ہمارے علم میں ہندوستان کے طول و عرض میں مولوی عبدالحق صاحب سے زیادہ کوئی شخص اس کا اہل نہیں ہے اور ہم ڈاکٹر سپرو، ڈاکٹر تارا چند، اراکین مجلس انتظامی و دیگر شرکائے اکیڈمی سے باصرار تمام یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ جلد سے جلد اس فروگذاشت کی تلافی کریں۔ بے شبہ یہ قانونی دشواری ضرور سامنے آئے گی کہ اراکین کی تعداد محدود ہے، لیکن

اگر کسی دوسرے طریقہ پر اُن کی شرکت کا انتظام نہ کیا جاسکے تو ہمیں تو اسکا مشورہ دینے میں بھی عذر نہیں کہ موجودہ ارکین میں سے کوئی ایک صاحب اتنا ایثار گوارا فرمائیں کہ ملک کے سب سے زیادہ مستحق شخص کے لیے جگہ خالی کر دیں۔

شرر و شاد کے بعد اُردو کے دو اور خدمتگزاروں نے داغ مفارقت دیا۔ مضطر خیرآبادی جنکی نغمہ سنجیوں سے سارا ملک مستفیض ہوتا تھا، اُردو کے خوشگو شاعروں میں امتیاز خاص رکھتے تھے۔ داغ و امیر کے بعد قدیم رنگ کے کہنے والوں میں مضطر و ریاض سے زیادہ شاید ہی کسی کو قبول عام حاصل ہوا ہو۔ حضرت ریاض کی عمر دراز ہو کہ اب اس دَور کی روایات انھیں کی ذات سے وابستہ ہیں۔ حضرت مضطر کا دیوان غالباً چھپ تو گیا ہے مگر اب تک ہماری دسترس سے باہر رہا ہے۔ ریاض کا دیوان سنتے ہیں کہ ابھی تک یادِ وصال میں شائع ہو رہا ہے۔

حضرت مضطر کو ریاست ٹونک سے تعلق تھا، اور وہیں مدۃ العمر قیام رہا۔ وطن اور اپنے صوبہ سے دوری کے باوجود اُن کا کلام جس قدر بھلا پھولا اُس سے اُسکی خوبی اور قبولیت کی اہلیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مرحوم کے تین صاحبزادے انشاءاللہ شاعر ہیں۔ اور اگرچہ اس فن شریف میں ملوکیت کی طرح کی وراثت نہیں چلتی تاہم امید کرنا چاہیے کہ اپنے والد کے فیض صحبت سے ان اصحاب کو بھی بہرۂ وافر حاصل ہوا ہوگا۔

مولوی سجاد مرزا بیگ دہلوی جو نظام کالج حیدرآباد میں اُردو کے پروفیسر تھے فالج میں مبتلا ہو کر راہی ملک بقا ہوے۔ مرحوم کی عمر پچاس برس سے بھی کم تھی۔ اور اگرچہ اب عرصہ سے ہمیں نیاز نہیں حاصل ہوا مگر جب ہم نے اُنھیں دیکھا تو اُسوقت اُنکی صحت بھی اچھی معلوم ہوتی تھی۔

مرحوم بہت خاموش کام کرنے والوں میں تھے۔ انجمن ترقی اُردو جب قائم ہوئی اور مولانا شبلی مرحوم کے قیام حیدرآباد کی وجہ سے وہاں اُسکا دفتر کھولا گیا تو وہی شریک معتمد کی حیثیت سے اُس کا سارا دفتری کام کرتے تھے۔ اور اُسی زمانہ میں غالباً مولانا شبلی ہی کے مشورہ سے اُنھوں نے اُردو کتابوں کی وہ فہرست مرتب کرنا شروع کی جو تین سال ہوے الفہرست کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

ابتدا میں اُنھوں نے دو افسانے لکھے تھے۔ گرد لفگار اور تمنا ہے دید دونوں میں اُنکے

جو ہر زیادہ نمایاں نہ ہوے۔ انکی طبیعت میں بہت سنجیدگی تھی، اس لیے ناولوں کو وہ زیادہ عام پسند نہ بنا سکے۔ حکمت عملی، الانسان، الاستدلال اور تسہیل البلاغت سے انکی قابلیت اور مذاق کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے اور انھیں کتابوں کے باعث ملک کے علم دوست طبقہ میں وہ خاص وقعت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

مرحوم کے ورثا میں انکی بیوہ، دو کمسن لڑکے اور ایک صاحبزادی ہیں۔ حیدرآباد کی روایتی فیاضی سے امید ہے کہ ایک نمکخوار قدیم کے حقوق پر لحاظ کرکے انکے ورثا کے ساتھ ہر قسم کی مراعات ملحوظ رکھی جائیں گی۔

حضرت منشی اور مولوی سجاد مرزا بیگ کے ورثا سے الناظر کی طرف سے تعزیت اور ہمدردی قبول کریں۔

شبلی اکیڈمی یعنی دار المصنفین اعظمگڈھ خاموشی مگر مستعدی کے ساتھ علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہے، اور گیارہ سال کی قلیل مدت میں اس نے تیس سے اوپر کتابیں مختلف علوم و فنون پر شایع کی ہیں، اسکے علاوہ مولانا شبلی مرحوم کی اکثر تصانیف صحت و صفائی کے ساتھ چھپوائی ہیں، جو تمام بازاری نسخوں کے مقابلہ میں ہر حیثیت سے ممتاز ہیں۔ یہ سارا کام اب تک حیدرآباد اور بھوپال کی فیاضانہ امداد اور خود کارکنوں کی ذاتی جانفشانی و خوش انتظامی کا رہین منت رہا، قوم سے اب تک کسی قسم کی مالی اعانت کا سوال نہیں کیا گیا۔ اب جو دار المصنفین کے کتبخانہ کی توسیع کے لیے کارکنوں کو مالی امداد کی ضرورت پیش آئی ہے تو انھوں نے ارباب ہمت کو دعوت دی ہے کہ دار المصنفین کے رکن اول یا رکن امدادی بن کر ضروری سرمایہ فراہم کردیں۔ ایسے ارکان کو بیس روپیہ سالانہ ادا کرنا پڑتا ہے، جسکے بعد انھیں حق ہو جاتا ہے کہ دار المصنفین میں سال بھر جو کچھ چھپے وہ انکے پاس ہدیۃً پہونچتا رہے۔ رسالہ معارف کے علاوہ جو ماہوار شایع ہوتا ہے، ہر سال تین چار کتابیں بھی شایع ہوتی ہیں۔ علم دوست اصحاب کے لیے یہ سودا نہایت اچھا ہے کہ ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق بن سکتے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی ناظم اور مولوی مسعود علی ندوی منتظم کی دعوت پر اب تک دو سو کے قریب اصحاب یہ سعادت حاصل کر چکے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ناظرین الناظر نے بھی اس میں ضرور حصہ لیا ہوگا۔ افسوس کہ اس سے قبل ہم الناظر کی وساطت سے اس ضروری کام کی طرف توجہ نہیں دلا سکے۔ بہر حال امید ہے کہ جو اصحاب اب تک ناظم یا کسی دوسرے

سبب کی بنا پر دارالمصنفین کی اس خدمت کا موقع نہیں پا سکے وہ اب جلد سے جلد مولانا سید سلیمان صاحب کو (شبلی منزل، اعظم گڈھ) کے پتہ پر اپنے عندیہ سے مطلع فرمائیں گے۔

مولانا شرر مرحوم کی یادگار میں پنجاب کے ہونہار اور مقبول رسالہ نیرنگ خیال نے اپنے جنوری نمبر میں ایک انعامی مقابلہ کا اعلان کیا تھا، جو نیرنگ خیال کی زندگی بھر برابر جاری رہیگا۔ اُسکے شرائط ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:-

"(۱) اس انعامی مقابلہ میں صرف مختصر افسانے ہی قبول کیے جائیں گے خواہ ترجمہ ہوں خواہ طبعزاد۔

(۲) سال بھر میں جس قدر افسانے اس انعامی مقابلہ کے تحت میں شایع ہونگے اُن میں سب سے اچھے افسانے پر ایک سونے کا تمغہ انعام دیا جائے گا۔

(۳) اس طلائی میڈل کا نام شرر گولڈ میڈل ہوگا۔

(۴) صرف وہی افسانے انعامی مقابلہ میں شامل کیے جائیں گے جن پر لفظ "انعامی مقابلہ" درج ہوگا اور جو نیرنگ خیال کے آٹھ صفحات سے زائد نہ ہو۔

(۵) انعامی مقابلہ کا فیصلہ دسمبر ۱۹۲۷ء کے رسالہ میں مندرجۂ ذیل اصحاب کی کمیٹی کریگی: جناب سید امتیاز علی صاحب تاج بی اے۔ جناب محمد دین صاحب تاثیر ایم اے۔ جناب مولانا عبدالمجید سالک بی اے۔ جناب حکیم احمد شجاع صاحب بی اے (علیگ) شرر گولڈ میڈل ۴۔ جنوری ۱۹۲۸ء کو بذریعہ رجسٹری افسانہ نگار کی خدمت میں بھیجدیا جائے گا"

اسکے بعد دفتر انجمن ترقی اُردو سے اطلاع ملی کہ جناب مولوی وحیدالدین صاحب سلیم معلم اُردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ جناب مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو اور جناب مولوی سید ہاشمی فریدآبادی رکن دارالترجمہ حیدرآباد دکن نے حسب ذیل سالانہ انعامات دینے کا وعدہ کیا ہے:-

(۱) عطاے سلیم

رسالہ اُردو اورنگ آباد دکن کے سال بھر کے مضامین نثر میں جو مضمون ہر اعتبار سے بہترین اور ادب اُردو کے لیے سب سے مفید ہوگا اُسکے لکھنے والے کی خدمت میں جناب مولوی وحیدالدین سلیم کی طرف سے مبلغ دوسو روپیہ سکۂ انگریزی پیش کیا جائے گا۔

(۲) عطائے عبدالحق

رسالۂ اُردو کے سال بھر کے مضامین نثر میں دوسرے درجہ کے سب سے اچھے مضمون پر ایک سو پچیس روپے سکۂ انگریزی کا انعام جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے عطا فرمائیں گے

(۳) عطیہ ہاشمی

کے نام سے تیسرا انعام ایک سو روپیہ سکۂ انگریزی کا مولوی سید ہاشمی صاحب اُن صاحب کی نذر کریں گے جن کی نظم رسالۂ اُردو کی سال بھر کی نظموں میں سب سے اچھی اور اعلیٰ درجے کی ہوگی۔

انعامات کا آغاز سال رواں ۲۲ء سے ہوگا اور ہر سال کے آخر میں جو حضرات اہل سمجھے جائیں گے اُن کی خدمت میں رقم ارسال کر کے رسالہ میں اس کا اعلان ہوتا رہے گا۔ انعام کی اہلیت کا فیصلہ خود معطیان کی متفقہ رائے پر منحصر ہوگا۔"

الناظر کے جملہ قلمی معاونین علی الخصوص اپنے نوجوان دوستوں سے ہم سفارش کرتے ہیں کہ نیرنگ خیال اور اردو کے انعامی مقابلوں میں شریک ہوں، تاکہ مولانا شرر مرحوم کی یادگار قائم رکھنے کی کوشش میں اُن پرچوں کو پوری کامیابی ہو۔

الناظر کا یہ پرچہ کوشش کے باوجود اپریل کے بجائے اخیر مئی میں شایع ہو سکے گا۔ اب ششماہی کے ختم میں صرف پانچ ہفتے رہ گئے ہیں۔ اور اس مدت میں قطعاً محال ہے کہ اپریل، مئی اور جون کے پرچے شایع ہو سکیں۔ خصوصاً اس لیے کہ تین مہینے سے میں تنہا کام کر رہا ہوں۔ میرے مددگار مسٹر سید حسین بی اے دفعۃً یکم مارچ سے علیحدہ ہو گئے۔ اور ابھی تک کوئی مستقل انتظام نہیں ہو سکا۔ اندریں حالات سال گذشتہ کی کبھی ایک ماہی کی غیر حاضری گوارا کرنی پڑیگی، یعنی جون کے اندر کوئی پرچہ نہ شایع کیا جائیگا بلکہ انشاءاللہ ۱۵ - جولائی تک جولائی کا پرچہ شایع ہو سکیگا اور کوشش کی جائیگی کہ اسکے بعد پوری باقاعدگی سے ہر مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو پرچہ شایع ہو جایا کرے۔ جن اصحاب کی میعاد خریداری اس پرچہ کی اشاعت سے تیسری یا دوسری سہ ماہی میں ختم ہو جاتی ہے انکے نام جولائی اور اسکے بعد کے پرچے بذریعہ وی پی کے جائینگے اور باقی اصحاب کی میعاد خریداری میں تین ماہ کی توسیع کر دی جائے گی۔ امید ہے کہ الناظر کو اس میں کچھ عذر نہ ہوگا۔

ظفر الملک

۲۴ - مئی ۲۲ء

ایجنسی کی بعض کتابین

اساس التعلیم۔ مصنفہ منشی محمد عبد الحق بی اے ایل ایل بی۔ جدید تعلیم اور مغربی تمدن کی اشاعت نے اہل ملک کے خیالات مین جو ہیجان پیدا کر دیا ہی اُسکی وجہ سے یہ ضرورت عام طور پر محسوس کی جاتی ہے کہ ہندوستان مین جو طریقہ تعلیم عام طور پر رائج ہی اس مین مناسب اصلاح و ترمیم کی جائے اِس تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہی کہ بچہ کی ابتدائی تعلیم و پرداخت پر کافی توجہ نہین کیجاتی اور والدین اور معلمین عام طور پر بچہ کے طبعی رجحان اور عام فطرت انسانی کو نظر انداز کر دیتے ہین۔ یورپ و امریکہ کے تعلیمی حلقون مین بچون کی تعلیم و تربیت کے متعلق مختلف تجربات کیے گئے ہین جنمین مشہور امریکن خاتون مانٹی ساری کا طریقہ نہایت مقبول ہوا ہی۔ مصنف کتاب ہذا انھین کے تعلیمی اصول کو ہندوستانی ضروریات کے لحاظ سے مناسب تغیرات کے ساتھ ملک مین رواج دینا چاہتے ہین۔ چنانچہ اس کتاب مین پہلے تو طریقہ تعلیم پر اصولی بحث کی ہی۔ پھر مانٹی ساری کے طریقہ تعلیم کی تفصیل و شرح بیان کی ہی اور مطالب کتاب کو بخوبی ذہن نشین کرنے کے لیے مختلف اشیاے تعلیمی کی عکسی تصاویر بھی دی گئی ہین۔ قیمت عا ر

انسان۔ جس مین انسان کے اندرونی و بیرونی اعضا کا حال جدید تحقیقات کی رو سے بیان کیا گیا ہی۔ قیمت ۸ ر

اثرستان۔ نواب میرزا جعفر علی خانصاحب بی اے اثر لکھنوی کا دیوان، دَورِ حاضرہ مین لکھنؤ نے شاعری مین جو انقلاب پیدا کیا ہی اُسکے نمونے۔ مقدمۂ دیوان حضرت عزیز لکھنوی کے قلم سے نکلا ہی۔ جس مین مصنف کی سوانحعمری اور ادبی کارنامے درج ہین قیمت عصر

امثال۔ ضرب المثلون پر فلسفیانہ بحث ان کی تاریخ۔ استعمال کا موقع و محل ادب اردو مین عجیب و غریب کتاب قیمت عمر

انتخاب صحاح ستہ۔ حدیث شریف کی چھ مشہور کتابون سے ۵۵۰ حدیثین منتخب کر کے ان کا ترجمہ شایع کیا ہی اور ایک فہرست بہ لحاظ مطالب مرتب کی ہے تاکہ جس مضمون کی حدیث درکار ہو بآسانی مِل جائے آخر مین اصل عبارت حدیث بھی درج ہے اور ترجمہ و متن دونون پر یکسان اعداد شمار دیے گئے ہین قیمت عہ

التربیت الاستقلالیہ (مولفہ مولانا عبد السلام ندوی) فرانسیسی زبان کی مشہور کتاب "انیسوی صدی کا امیل" مصر کے عربی ترجمہ کی وساطت سے اردو زبان مین منتقل ہوئی ہی اور اس مین خطوط کے ذریعہ اس امر پر بحث کی گئی ہی کہ تعلیم و تربیت کے کون سے طریقے اور اصول قابل ترویج ہین۔ لائق مترجم نے مغربی طریقون کے مقابل اپنے مبسوط مقدمہ مین وہ طریقہ تعلیم بھی درج کر دیا ہے جو اسلامی طریقہ کہا جاتا ہی اور جسکی بدولت مسلمان تمام دنیا پر چھا گئے تھے۔ قیمت عا ر

آئینۂ حقیقت نما۔ اس لاجواب کتاب

ہین ہندوؤن اور مسلمانونکے گیارہ سو
سال کے تعلقات باہمی پر تاریخی واقعات
کے ذریعہ روشنی ڈالی گئی ہے اور اس بات
کو بہ دلائل وشہادت نمایان کیا گیا ہے
کہ مسلمانون نے اپنے عہد حکومت مین
ہندوؤنکے ساتھ ظلم و ناانصافی کے بجائے
بہت زیادہ محبت ومروت ملحوظ رکھی۔ اور
اسوقت جو ہندوؤنکے دلون مین مسلمانون
کی طرف سے بدگمانیان نظر آتی ہین یہ محض
غلط تاریخون کے رواج سے پیدا ہوئی
ہین۔ تاریخی غلط بیانیون اور غلط فہمیون
کے لیے انشاءاللہ یہ کتاب بمنزلہ تریاق ثابت
ہوگی قیمت جلد اول ۱۲؍

احسن الافادۃ لارباب الارادۃ۔ مولانا
حافظ شاہ علی انور قلندر نے اس رسالہ مین
قرآن وحدیث کے حوالون سے ثابت
کیا ہے کہ شوہر سے زوجہ کی بیعت جائز ہے
مگر اسکا ترک اولی ہے قیمت ۲؍

الکہف والرقیم۔ اس کتاب مین حضرت
شیخ عبدالکریم جیلی نے بسم اللہ الرحمن الرحیم
کے ایک ایک حرف ونقطہ کی تفسیر وتشریح
مین عالم عالم بیان فرمایا تھا منشی نجاح الدین
قلندر کاکوروی نے اس لاجواب کتاب
کو مع اردو ترجمہ شرح اور مقدمہ کے
شایع کیا ہے قیمت ۸؍

الدرۃ البیضاء۔ اس کتاب مین حافظ
شاہ علی انور قلندر نے تمام مسلمانون کے
فائدہ کیلئے نکاح کے معنی، فوائد، آفات،
پھر کیفیت نکاح اور دوسرے امور متعلقہ
پر کتب وسیر وفقہ سے معتبر روایات
جمع فرمائی ہین اور اسی سلسلے مین یہ بھی
تحقیق فرمایا ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا
رضی اللہ تعالی عنہا کا مہر کتنا تھا۔ اور
حساب مروجہ سے اسکی صحیح رقم
کتنی ہوتی ہے قیمت ۲؍

الدر المنظم فی مناقب غوث الاعظم
(جلد اول) مولفہ مولانا شاہ علی انور قلندر
مرحوم۔ جسمین تصوف اور صوفیون کے
متعلق معلومات کثیرہ درج کی گئی ہین اور
حضرت غوث الاعظم کے متعلق بزرگان
متقدمین کے اخبارات وبشارات درج
کیے گئے ہین اور ان بزرگون کے حالات
لکھے گئے ہین جنھون نے حضرت غوث الاعظم
کی تعریف فرمائی ہے یا جن کی خود آپنے
تعریف فرمائی ہے نیز حضرت غوث الاعظم کا
حسب ونسب بیان کیا ہے حجم ۲۷ جزو
کتابت وطباعت اعلی قیمت ۸؍
جلد دوم مین حضرت غوث الاعظم کی
ولادت سے وفات تک کے حالات
زندگی، آپ کی تحصیل علوم ظاہری وباطنی
اور اساتذۂ ظاہری وباطن کا ذکر۔ آپکے
مواعظ وتعلیمات، اور آپکی ازواج
واولاد کا بیان، اور آپکے خلفا کے
حالات لکھے گئے ہین حجم ۶۰۶ صفحہ
تقطیع کلان۔ قیمت للعہ

اسلام بجواب ترک اسلام۔ آریہ
سماج کے اعتراضات کا دندان شکن
جواب، قرآن کے الہامی ہونے کا
ثبوت قیمت ۱۲؍

باغبانی (۳ جلد) یعنے "فرمینگرس
مینول آف گارڈننگ" کا ترجمہ از مولوی
سید مصطفی بی اے اند سکرٹری ریاست
بھوپال جس مین نہایت تفصیل کے ساتھ
فن باغبانی پر علمی وعملی حیثیت سے
بحث کی گئی ہے اور منشی خورشید احمد
صاحب مہتمم باغات ریاست بھوپال
نے نہایت مفید حواشی اور ضروری
تصریحات کا اضافہ کرکے بہت کارآمد
بنادیا ہے۔ قیمت للعہ

بصائر القرآن۔ قرآن مجید کے
وہ حصے جو عرب جیسے ریگستان مین بیداری
کی روح پھونک چکے ہین ان کا ترجمہ
عام فہم اردو مین کیا گیا ہے۔ ان مین
اخلاقی، معاشرتی، تمدنی، سیاسی
تعلیمات موجود ہین۔ ہر مسلمان کا فرض ہے

کر اپنے بچون کو یہ قصے پڑھائے ۔ ۶؍

تاریخ التعلیم۔ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب پرنسپل علی گڈھ کالج جنھون نے اپنی عمر قوم کی تعلیمی خدمات کے لیے وقف کر رکھی ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ فن تعلیم کے متعلق مسلمانان ہندوستان مین کوئی دوسرا شخص ایسا نہین جو اسقدر واقفیت اور تجربہ رکھتا ہو۔ یہ کتاب اُنھین کے رشحات قلم سے نکلی ہوئی ہے جو لوگ ملک و قوم کی تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہین اسکا مطالعہ فرمائین ۸؍

تجرد اور ازدواج جسمین علمائے یورپ و امریکہ کی شہادتون سے تجرد کے نقصانات اور شادی کے فوائد بیان کیے گئے ہین اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہم کو کس طرح اور کس عمر تک شادی کر لینا چاہیے قیمت ۸؍

تاریخ اندور۔ نامور فرمان روایان ملک کے کارنامے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے آخری زمانے سے ۱۹۲۴ء تک اندور کی جدید حکومت اور فرمان روائی کے انقلابات نظر رکھنے والون کو اس تاریخ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ لائق مصنف کے سحر طراز قلم نے تاریخ کو افسانہ کی طرح پر لذت بنا دیا ہے۔ قیمت ۱۲؍

تصویر عبرت یا استھاویوی۔ نہایت درد انگیز اخلاقی نظم۔ بنگال کے خراب رسم و رواج کا خاکہ قیمت ۴؍

تاریخ زوال روما۔ نامور انگریز مورخ ایڈورڈ گبن کی مشہور تصنیف ڈیکلائن اینڈ فال آف رومن ایمپائر کے ترجمہ کی پہلی جلد قیمت ۸؍

تفسیر الفرقان فی معارف القرآن

اس نام سے خواجہ عبد الحی فاروقی معلم تفسیر جامعہ ملیہ ایک تفسیر لکھ رہے ہین جس مین قدیم رنگ کے مفسرین کی تاریخ منطقی مسائل اور فلسفیانہ بحث کے بجائے عملی معاملات پر زور دیا ہے اور قرآن کے مطالب حقیقی ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ لوگ اسلام کے اہم ترین مقاصد کو پیش نظر رکھ سکین اور حالات حاضرہ مین قرآن کی تعلیم کے مطابق عمل پیرا ہون۔ مذہب کی اصلی روح ان مین سرایت کرے اور وہ جانین کہ قومون کے عروج و زوال کے اسباب کیا ہوتے ہین اور مسلمانون کی ترقی کے لیے خدائے کریم نے کیا کیا تدبیرین بتائی ہین نیز عہد رسالت اور خلفائے راشدین کے مبارک دور مین مسلمانون کا کیا نظام تھا۔ ابتک حسب ذیل حصص شائع ہوئے ہین:-

الخلافۃ الکبریٰ۔ سورۂ بقر کی تفسیر مجلد قیمت ۲؍

بیان۔ سورۂ آل عمران کی تفسیر ۱۲؍

الصراط المستقیم۔ سورۂ انفال اور سورۂ توبہ کی تفسیر قیمت ۶؍

سبیل الرشاد۔ سورۂ حجرات کی تفسیر قیمت ۱۰؍

عبرت۔ سورۂ یوسف کی تفسیر ۸؍

البصائر۔ اس رسالہ مین خواجہ عبد الحی صاحب نے بنی اسرائیل کے وہ واقعات بیان کیے ہین جو قرآن مجید مین درج ہین کہ زمانۂ حال مین مسلمانونکے حالات بہت کچھ اسی قسم کے ہو گئے ہین قیمت ۶؍

جدید دنیائے اسلام۔ گزشتہ نصف صدی کے اندر آہستہ آہستہ اور محاربۂ یورپ کے دوران مین اور اُسکے بعد سرعت اور تیزی کے ساتھ اسلامی ممالک مین جو حرکت و بیداری کے آثار نمایان ہوئے ہین، اُنکی بنا پر امریکہ کے ماہر سیاسیات ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ نے یہ کتاب

مرتب کی ہے جسمین ممالک اسلامی کے باشندون کے حالات پر معاشرتی، مذہبی، تمدنی، سیاسی و اقتصادی پہلوؤن سے بحث کرکے انکے موجودہ رجحانات و مطامح نظر کے اسباب و علل کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کا ترجمہ مولوی جمیل الدین صاحب بی اے (علیگ) نے بڑی دیدہ ریزی و جگر کاوی سے کیا ہے۔ حجم چار سو صفحے سے زائد۔ قیمت ۴؎

سیر فلک۔ مشہور ناول ایسٹ لن کا ترجمہ از پروفیسر انعام اللہ خان ایم اے۔ یہ ضخیم ناول ۳ جلدون مین ترجمہ ہوا ہے اور دیکھنے کے لائق ہے۔ قیمت ۶؎

حضرت بلھے شاہ۔ پنجاب کے مشہور درویش اور پنجابی زبان کے مشہور شاعر کی سوانح عمری۔ جن کا کلام ہمہ اوست کے رنگ مین نگا ہوا ہے۔ قیمت ۸؍

خیالات۔ مرزا سلطان احمد صاحب کے اُن متفرق مضامین کا مجموعہ۔ جو ملک کے موقر رسائل مین شایع ہو چکے ہین۔ قیمت عہ

دلائل الخلافت۔ جس مین مشہور [illegible] تقیم لکھنو نے آیات قرآنیہ کی مدد سے خلفائے ثلثہ کی حقیقت و راشدیت کو نہایت مدلل طور پر ثابت کرکے معترضین کو دندان شکن جوابات دیے ہین۔ قیمت ۶؎

دماغی تربیت۔ مسٹر جیمس ایلن کی لاجواب کتاب "ہاؤ ٹو کلٹیویٹ دی مائنڈ" کا اردو ترجمہ۔ ایک نوجوان مسلمان کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ جو ذہن، صحت جسمانی، تربیت ذاتی، اور انتخاب پیشہ کے متعلق مفید ترین معلومات سے مالا مال ہے ۸؍

داغ جگر۔ حضرت جگر مرادآبادی کا قابل دید دیوان، جسے بزم ادب اعظم گڑھ کی طرف سے مولوی احسان احمد صاحب بی اے، ایل ایل بی، وکیل نے شایع کیا، اور شروع مین جناب جگر کی شاعری پر ایک پرلطف مقدمہ اضافہ کیا ہے۔ جو بجائے خود دیکھنے کے قابل ہے۔ قیمت عہ؍

ریاض باسط۔ یعنے مولوی سید باسط علی صاحب رئیس متھرا کا دلچسپ کلام۔ جس مین حمد و نعت کے علاوہ قصائد منقبت سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور شہدائے کربلا کے نوحے اور سلام قابل دید ہین۔ کتاب اعلی لکھائی چھپائی کا بہترین نمونہ ہے قیمت عصہ؍

روح تنقید۔ (تالیف سید غلام محی الدین قادری، زور بی اے) سید محی الدین زور نے فن تنقید پر یہ دلچسپ اور مفید کتاب لکھی ہے۔ جس مین متعاصر اصول تنقید پر مشرقی و مغربی نقطہ ہائے نظر سے بہت اچھی بحث کی گئی ہے اور نمونہ کے طور پر مثنوی سحر البیان پر تنقید بھی پیش کی گئی ہے۔ تنقیدی مضامین لکھنے والونکے لیے بہت کارآمد ہوگی عہ

رموز فطرت۔ جسمین علم طبیعیات و طبقات الارض کے ابتدائی اصول اور جغرافیہ طبعی کے بنیادی مسائل نہایت سلیس اور سادہ زبان مین بیان کیے گئے ہین قیمت عہ

زینت آسمان (تالیف پروفیسر برکت علی ایم اے و پروفیسر منہاج الدین ایم، ایس سی) ستارون کی شناخت پر اردو مین پہلی کتاب ہے۔ اِس کتاب مین ستارون کے بارہ نقشے ہین اور ہر نقشے کے ساتھ خاص خاص ستارونکے مختصر حالات بھی قلمبند کر دیے ہین تاکہ ستارون کے پہچاننے مین کوئی دقت نہ ہو۔ قیمت عہ

من چلے۔ دل جلون کے لیے ظریفانہ یادداشت۔ ہر ورق کشت زعفران ہے۔ قیمت ۸؍

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُردو کا سب سے بڑا انشا پرداز!

یہ سوال کہ دو شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، مولانا شبلی، مولانا حالی، اور مولوی نذیر احمد صاحب میں اُردو ادب کا سب سے بڑا انشا پرداز کون ہے؟ اور اُردو کی سب سے زیادہ کس نے خدمت کی ہے؟ جس قدر آسان اور دلچسپ ہے اُتنا ہی اس کا جواب مشکل، اور غیر فیصل ہوگا۔ اُردو دنیائے ادب کے یہ شموس[1] اربعہ یوں تو اپنی اشراق و تنویر سے چپہ چپہ کو روشنی پہونچا رہے ہیں۔ مگر فیصلہ طلب امر یہ ہے کہ اِن میں کوکب اعظم کون ہے، اور کس کی ادبی روشنی سے اوروں کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے، یعنی ان میں بحیثیت انشا پرداز سب سے بڑا کون ہے؟

جو لوگ زبان کے چٹخارے، محاورے، اور روزمرے پر جان دیتے ہیں، بیگمات سے لے کے ایک معمولی بازاری کی گفتگو، کتابوں کے صفحوں پر حروف کا لباس پہنے ہوئے دیکھکر خوش ہوتے ہیں، اور انشا پردازی کی

---

[1] چاروں حضرات شمس العلماء ہیں۔

عدا اسی پر ختم سمجھتے ہیں، کہ ہر کس و ناکس، شریف و رذیل، امیر و غریب، شاہ و گدا کی گفتگو انھیں الفاظ میں ادا کیجائے، جو علی العموم استعمال کئے جاتے ہیں، ڈاکٹر نذیر احمد ایل ایل ڈی کو پیش کرینگے، کہ یہ شرف انھیں کو حاصل ہے اور انکی کثیر تصانیف کے ہوتے ہوئے جو اپنے طرز میں لاجواب ہی نہیں بےمثیل ہیں، کسی کا حق نہیں کہ وہ اُردو کا سب سے بڑا انشا پرداز بنایا جائے۔

اس دعوی کے ثبوت میں، لاتعداد تصانیف کے نام، جن میں منتخب الحکایات سے لے کے ترجمہ قرآن مجید تک ہے، پیش کئے جائینگے، اور مراۃ العروس، توبۃ النصوح، رویائے صادقہ اور ابن الوقت وغیرہ وغیرہ کے ایک ایک کرکے حوالے دئے جائیں گے، عبارتیں نقل ہونگی، اور ان کی سادگی، برجستگی، شستگی، روزمرہ اور سلاست کی زور دار الفاظ میں تعریف و تحسین کیجائے گی، شوخی و بےتکلفی اور اس امر کی، کہ آپ نے عورتوں کے کیرکٹر کس خوبی سے دکھائے ہیں، عورتوں کی زبان اور خیالات کو ہو بہو کس لطافت و خوبی سے ادا کیا ہے ستائش کیجائے گی۔ ان کی مضحکات و طنزیات بزم میں لائی جائینگی کہ باعث رونق ہوں۔

مسدس حالی پر سر دھننے والے پانی پت کے اُس بزرگ کے نام کا "قرعہ" نکالیں گے جس کو دنیا الطاف حسین حالی کہتی ہے۔ انکی تصانیف کی فہرست اگرچہ اُتنی طویل نہ ہوگی جتنی ڈاکٹر صاحب کی ہے، مگر ان کی بےمثیل نکتہ سنجی و دقیقہ شناسی، سخن فہمی و سخن آفرینی، بلند پروازی و وسعت نظری کے ثبوت میں، یادگار غالب، حیات سعدی اور حیات جاوید، پیش ہونگی، اور نقادانہ طرز تحریر و محققانہ کنہہ رسی دکھانے کے لئے، سعدی و غالب کے حالات سے رونق محفل بڑھائی جائے گی مسدس مدوجزر اسلام کے ساحرانہ بند نقل کئے جائینگے اور نیچرل شاعری کی اولیت کا طرہ، دستار فضیلت و کمال میں لگاکر، اُردو کے

سب سے بڑے انشا پرداز کے تخت پر بٹھائیں گے۔

پرستاران شبلی! اور اسلامی تاریخ وایام گذشتہ ومشاہیر اسلام سے دلچسپی رکھنے والے الفاروق کے مصنف کو بزم میں لائیں گے، کہ اس محقق، وسیع نظر مصنف کی موجودگی میں، جس نے اردو سی بے حقیقت زبان کو جس میں کسی علمی خیال کے ادا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی، اپنی فلسفیانہ تحریر، محققانہ طرز استدلال عالمانہ ومورخانہ تحقیق اور بنظیر انشا پردازی سے معراج کمال پر پہونچایا کہ آج اردو دنیا کی مہذب ترین زبانوں کے سامنے الفاروق والمامون، النعمان والغزالی، سیرۃ النبی وشعر العجم کے ہوتے ہوئے نظر نیچی نہیں کرسکتی، یورپ کے بڑے بڑے مستشرقین نے شبلی کے بہم پہونچائے ہوئے معلومات سے استفادہ کیا، اپنی کتابوں اور مضمونوں کا ماخذ بنایا، پھر ایسی تصانیف کے مصنف کے سوا کس کا حق ہے، جس کو اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز کہا جائے؟ انکی زبردست انشا پردازی، وسیع النظری، نکتہ فہمی ودقیقہ سنجی اور فلسفیانہ طرز استدلال کے ثبوت میں، الفاروق والمامون، الکلام والغزالی، سیرۃ النبی وشعر العجم کی ضخیم جلدیں پیش کیجائیں گی، صفحے کے صفحے مولانا کے زور قلم کا اعلیٰ نمونہ دکھانے کیلیے نقل ہونگے۔

مگر ان حضرات کے معتقدین وپرستار یا تو سوال کی حقیقت کو نہیں پہونچے، یا اس شخص سے ناواقف ہیں، جو ان تینوں اصحاب پر بحیثیت انشا پردازی فوقیت رکھتا ہے، اور جو خالص انشا پرداز ہے، اور سب سے بڑا انشا پرداز، جس کی تحریر کا ایک ایک لفظ ادب وانشا کی جان ہے، جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ "اردوئے معلیٰ کا ہیرو ہے"، جس کی انشا پردازی اتنی اعلیٰ وارفع ہے کہ اس کے علو ورفعت کا اندازہ ہم سے لوگوں کے لیے مشکل ہے۔

انسان اپنے معتقدات میں ایسا سخت ہوتا ہے کہ مشکل سے اُسمیں تبدیلی گوارا کرتا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہونگے، جو ظفر الملک صاحب کے اعلان کے پہلے ان چاروں بزرگوں کی نسبت خاص خاص رائے رکھتے رہے، اور اب اُسی کی پیروی کرتے ہوئے، اپنی اصابتِ رائے کی داد لینے کے واسطے، زمین و آسمان کے قلابے ملائیں گے، بہت کم لوگ ہوں گے جو جناب ظفر الملک صاحب کے اعلان کے بعد غور و فکر کر کے کسی نتیجہ پر پہونچے ہوں، اور ان بزرگ ہستیوں کے مقابلہ میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتے ہوئے، مرجحات و خصوصیات جو انکو دوسروں سے ممتاز کرتی اور باعث تفوق ہیں، بیان کر سکیں۔

ممکن ہے میری نسبت بھی یہ کہا جائے کہ میری بھی اس کے قبل کوئی رائے تھی، جس کے اظہار کے لئے ذیل کے صفحات رنگ رہا ہوں، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، میں چاروں بزرگوں کی نسبت کوئی رائے نہیں رکھتا تھا اور نہ مجھکو کسی سے عقیدت اور نہ کسی کا طرفدار، یوں ہر شخص کو صاحب کمال مانتا تھا اور اپنے اپنے رنگ و طرز، اور اپنی جگہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتا تھا۔

مولانا ظفر الملک صاحب علوی کے اعلان کو دیکھکر ارادہ کیا، میں بھی کچھ لکھوں، جہانتک مجھکو مل سکیں، ان اصحاب کی تصانیف مطالعہ کیں، غور و فکر سے پڑھا، عمیق نظروں سے مطالب و معانی پر نگاہ ڈالی، اور انکی انشاپردازی کا باہم مقابلہ کیا، آخر کو بعد غور و خوض بسیار اس رائے پر پہونچا، جس کے اظہار کے لئے یہ صفحات اختیار کئے ہیں۔

میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ لوگ اس سوال کی حقیقت کو نہیں پہونچے، اس سے حاشا و کلاّ کسی کی کم فہمی، یا اپنی سخن فہمی ظاہر کرنا مقصد نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ لوگ حدود مقرر کئے ہوئے بغیر ہر اُس خوبی کو جو ممدوح

ہیں پائی جائے پیش کردیتے ہیں، حالانکہ سوال کے حدود سے تعلق رکھنے والے امتیاز ہرگز باعث تفوق نہیں ہو سکتے، مثلاً یہ دریافت کیا جائے کہ تاریخ اسلام کے مولانا شبلی زیادہ محقق ہیں کہ مولانا شرر، اور مولانا شرر کو اس لئے ترجیح دیجائے کہ وہ ناول اچھے لکھ لیتے ہیں۔

سوال کا تجزیہ کیا جائے۔ تو دو حصوں پر منقسم ہوگا۔

(الف) انہیں ادب اُردو کا سب سے بڑا انشا پرداز کون ہے؟۔

(ب) اردو کی سب سے زیادہ کسنے خدمت کی؟۔

میں علٰحدہ علٰحدہ ان دونوں حصوں پر روشنی ڈالوں گا لیکن ان حدود کے باہر قدم میں نہ رکھوں گا، مثلاً کسی میں تاریخی یا عدم تحقیق کا نقص ہو، مگر انشا پردازانہ خوبیوں کا، مالک ہو، تو میرے لئے یہ نقص چنداں قابل اعتنا نہیں، یعنی میں مقابلہ صرف انشا پردازی میں محدود رکھونگا، جو سوال سے تعلق رکھتا ہے

قبل اس کے کہ حصہ الف سے بحث کی جائے، یہ بتا دینا مناسب ہی نہیں ضروری ہے، کہ انشاپردازی کس کو کہتے ہیں، انشا پردازی کی تعریف کیا ہے؟ یوں تعریف کیجائے تو طول طویل ہوگی، اور ہم اپنے مقصد سے دور جا پڑینگے، انشا پردازی کی سب سے زیادہ آسان عام فہم، اور مختصر تعریف یہ ہوسکتی ہے کہ کسی حال یا خیال کو ایسے الفاظ و عبارت میں بیان کرنا کہ پڑھنے یا سننے والے پر وہی عالم وہی سماں وہی کیفیت اور وہی حالت طاری ہو جائے۔ اور جذبات یا تاثرات جو اصل شی سے پیدا ہو سکتی ہیں، پیدا ہوں، بلکہ کلام میں اتنا اثر ہو کہ اصل حال کے دیکھنے اور خیال کے دل پر گذرنے میں وہ لطف و مزہ نہ حاصل ہو جو اس کے بیان میں ہو، جذبات انسانی مثلاً سرور و غم، غصہ و رحم، شجاعت و بزدلی

نخوت وغرور کی تصویر الفاظ میں اس طرح کھینچے کہ مجسمہ پیش کر دے۔ خیالات کو محسوسات کر دکھائے۔ آنکھوں سے دکھا دے۔ کسی چیز کا حال لکھے، تو ایسی عبارت میں کہ سامنے لاکے کھڑا کر دے۔ رزم کا نقشہ کھینچے، تو صفحہ قرطاس کو خونیں بنا کے آنکھوں کو مارنے اور مرنے، حملہ و دفاع کے مناظر اور کشتوں کے پشتے دکھا دے۔ جنگ کی کیفیت اس طرح بیان کرے کہ الفاظ سے تلوار کی چمک آنے لگے، بزم کا چربہ اُتارے تو یوں، کہ سرور و انبساط کو مجسم بنا دے۔ عیش و راحت کی تجسیم و تشخیص کر کے سامنے لے آئے، ہر لفظ و جملہ مسرت و خوشی کا عالم ہو، اور ہر ترکیب و بندش بہجت انگیز ہو۔

اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ لغات کے الفاظ ختم کر ڈالے جائیں، غیر مانوس کلام سے کان مانوس کئے جائیں، عربی و فارسی کے ثقیل اور بڑے بڑے لفظ اضافت در اضافت کے ساتھ لائے جائیں، جس سے مضمون دقیق و پیچیدہ ہوکر عام فہم نہ رہ جائے۔ بلکہ انشا پردازی کا سب سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ انشا پرداز عام فہم، صاف و سلیس، محاورے و روزمرے میں تاریخ و فلسفے کے مسائل اس حسن و خوبی سے ادا کرے کہ دلوں پر گراں نہ گذرے خشک مضامین کلام کی شگفتگی و شوخی سے ایسا کر دے کہ علوم و فنون کے مسائل فسانے معلوم ہوں، جاہل سے جاہل، ان پڑھ سے ان پڑھ اپنی عقل اور سمجھ کے موافق سمجھ لے۔

ظاہر ہے کہ انشا پردازی میں معاشرتی و مذہبی اصلاح داخل نہیں، اور نہ تاریخ و تنقید میں منحصر ہے۔ شمس العلماء مولانا محمد حسین صاحب آزاد دہلوی کا لٹریچر بحیثیت انشا پردازی وقعت و عزت رکھتا ہے۔ بخلاف مولانا نذیر احمد و شبلی و حالیؔ کہ ان لوگوں کا لٹریچر خاص حیثیت و موضوع اور علم و فن کے لحاظ سے قابل داد ہے،

مولانا نذیر احمد کی تمام کتابیں، معاشرتی و مذہبی اصلاح سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس قابل ہیں کہ اُردو کی بہترین تصنیفات میں شمار کی جائیں، علامہ شبلی کی تمام تر تصنیفات تاریخ و فلسفہ تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں، اور پڑھنے والا ان کی فلسفیانہ تحقیق و مورخانہ تدقیق کی داد دیگا، مولانا حالی کا لٹریچر نقادانہ و سخن سنجانہ ہے اور اسی حیثیت سے لائق تحسین، مگر علامہ آزاد ان تمام قیود سے بالاتر ہیں، انکی انشا پردازی فی نفسہ اتنی وقیع و رفیع ہے کہ انکی تصانیف تاریخ و فلسفہ تاریخ کے معیار سے کوئی وقعت نہ رکھتی ہوں تو بھی محض انشا پردازی کے لحاظ سے اس لائق ہونگی کہ اُردو ادب نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، واقعۃً علامہ آزاد کی انشا پردازی اتنی بلند ہے کہ آجتک دنیائے اُردو نے ایسی ترقی نظیر نہیں پیدا کیا ہے۔ علامۂ مرحوم، اپنے طرز خاص کے موجد اور ساتھ ہی اس کے "خاتم" تھے کہ اب تک اُنکی کوئی برابری نہیں کر سکا ہے اور آئندہ کے لئے اُمید ہے بلکہ وہم سے ماورا، یہ بات خیال کرنی چاہیئے کہ کوئی آزاد سا ہو سکے۔ انکی انشا پردازی کی بنا پر ایک مشہور موقعہ پر کہا گیا ہے "کہ آزاد اُردوئے معلی کا ہیرو ہے"

اُنکی بےمثل انشا پردازی کو تعریف و توصیف کی حاجت نہیں، نہ کسی کے قلم میں اتنا زور ہے کہ اس کی خوبیاں دکھا سکے، نہ کسی کے ہاتھوں میں طاقت ہے کہ اس کے معنوی حسن کو اُبھار سکے۔

سلاست و روانی، بیساختگی و برجستگی اور سادگی و بے تکلفی انکی انشا پردازی کے خاص محاسن ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملے، معمولی الفاظ، سلیس فقرے، شستہ ترکیب ہوتی ہے، مگر اس کے ساتھ، بیان کی جدت، مضمون آفرینی و بلند خیالی، ملکے وہ کام کرتی ہے جو جادو سے نہیں ہوتا۔ انسان مسحور ہوتا ہے، لیکن انکی تحریر، اور سادہ تحریر اس سے کہیں زیادہ موثر ہوتی ہے۔ اثر کی

یہ حالت ہے کہ پڑھنے والے کا دماغ معطل ہو جاتا ہے۔ دماغ کا کام ہر بات میں غور و فکر کرنا ہے مگر انکا طرز بیان، اس قدر دلکش و دلفریب، محیر و مبہوت کن ہوتا ہے کہ دماغ بیکار رہو جاتا ہے۔ ممکن نہیں آپ کسی موضوع پر آزاد کی تحریر پڑھیں اور اُن کے ہم خیال نہ ہوں۔

پھر اُنکی زبردست انشا پردازی کے کمال کا حال یہ ہے کہ کسی علم و فن، کسی موضوع و صنف سے مخصوص نہیں، دنیا میں بہت سے ایسے انشا پرداز ہیں جو اخبار کے لئے صرف سیاسی مضامین لکھ سکتے ہیں، بہت سے تاریخ ہی پر زور قلم دکہا سکتے ہیں، بعض بزمیہ مضامین سپرد خامہ کرتے ہیں۔ بہت سے صرف رزم ہی پر قلم اُٹھاتے ہیں، اکثر، خوشی و مسرت، بہجت و سرور کے مناظر خوب دکہاتے ہیں، بعضے غم والم کی تصویر کھینچتے ہیں اور کچھ لوگ ظریفانہ مضامین لکھتے ہیں۔ کہ وہی قلم اُس مخصوص موضوع و طرز کے علاوہ دوسرے مضامین میں اتنا عاری ہو جاتا ہے کہ چند سطریں لکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بالفرض لکھی بھی گیئں، تو کیسی کہ انشا پردازی کا ابجد خوان اس سے کہیں بہتر لکھ سکتا ہے۔ لیکن پروفیسر آزاد کو خداداد قدرت حاصل ہے کہ بزم کا نقشہ دکھاتے ہیں تو راحتِ حیات کو مجسم کر کے سامنے لے آتے ہیں۔ رزم کی تصویر دکہاتے ہیں تو تلواروں کی چمک الفاظ میں آنے لگتی ہے۔ مسرت و انبساط کے مناظر دکہاتے ہیں، تو سرور مجسم آنکھوں کے سامنے لے آتے ہیں، کہ پڑھنے والے کے چہرے پر رونق اور آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔ واقعات غم والم بیان کرتے ہیں تو مخاطب کے نظام عصبی میں اختلال پیدا ہو جاتا ہے چہرہ بے رونق اندوا اور حرکت قلب بہت دہیمی ہو جاتی ہے۔ انکا قلم جس طرح مسائل علمیہ، فلسفہ، تاریخ اور تحقیق السنہ میں زور دکہا سکتا ہے، ویسے ہی لطائف و ظرائف میں۔ واقعات کے بیان میں جسطرح

قلم روان ہوتا ہے، ویسا ہی قصص پر، بلکہ انکی انشا پردازی کا مسلّمہ کمال یہ ہے کہ واقعات بھی اپنے طرز خاص میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ فسانہ کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ انشا پردازی وادب کا مسلّمہ مسئلہ ہے کہ کسی علمی موضوع دفن پر اس کے اصطلاحات اور بڑے بڑے دقیق جملے، مشکل الفاظ میں لکھنا مشکل نہیں، بلکہ انشا پردازی کی معراج کمال یہ ہے کہ کیسا ہی مضمون ہو، تاریخی ہو کہ معاشرتی، سیاسی ہو کہ تمدنی فلسفیانہ ہو کہ نقادانہ، ایسی زبان دعبارت میں لکھا جائے کہ طبیعت پر گراں نہو وہی روزمرے ومحاورے میں، سلیس عبارت میں، شستہ ترکیب ہو اور بیساختہ جملے، برجستہ الفاظ ہوں اور پسندیدہ استعارے، یہ معلوم ہو کہ قلم سے الفاظ خود بخود نکل رہے ہیں۔

علامہ آزاد دہلوی کی تمام تصنیفیں ایسی ہی ہیں، تاریخی ہیں کہ ادبی۔ آپ جس قدر آب حیات سے لطف اندوز ہوں گے اُتنا ہی بلکہ اُس سے زائد، دربار اکبری سے آپ کو جو خوبی سخندان فارس میں نظر آئے گی وہی قند پارسی میں "نصیحت کے کرن پھول" سے جتنا محظوظ ہوں گے، اُتنا نیرنگ خیال سے مسرور، سفرنامہ سے آپ اُتنا ہی خوش ہونگے جتنا مکتوبات آزاد سے۔

آزاد کی جن خصوصیات پر نظر پڑتی ہے، وہ تحقیق السنہ، بے تکلفی وسادگی اور آزاد کا انداز بیاں جس سے انکی ہر تحریر مرصع وزرنگار معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً برج بھاشا پر عربی دفارسی اثرات دکھلانا ہیں، ایک عام انشا پرداز، تحقیق وتدقیق کرکے، پیچیدہ عبارت میں بیان کریگا، مگر تکلف وتصنع سے آزاد یوں لکھتا ہے:۔

"جب دو صاحب زبان قومیں باہم ملتی ہیں، تو ایک کے رنگ روپ کا دوسرے پر ضرور سایہ پڑتا ہے اگرچہ اُس کے اثر، گفتگو، لباس، خوراک نشست برخاست، مختلف رسوم پر بھی ہوتے ہیں، لیکن چونکہ مجھے اس مقام پر زبان سے غرض ہے

اس لیے اس میں گفتگو کرتا ہوں ظاہر ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم میں آتی ہے تو اپنے ساتھ ملک کی صدہا چیزیں ایسی لاتی ہے کہ جو یہاں نہیں تھیں، اشیاء مذکورہ کبھی ضروری اور کبھی ایسی باعث آرام ہوتی ہیں کہ انھیں استعمال میں لینا ضروریات زندگی سے نظر آتا ہے اس لئے یہ لوگ انھیں غنیمت سمجھکر لیتے ہیں اور بخوشی کام میں لاتے ہیں، ان اشیاء میں سے بہتیری چیزیں تو اپنے نام اپنے ساتھ لاتی ہیں، اور بہتیری نئی ترکیب سے یا ادل بدل کر یہاں نیا نام پاتی ہیں اور یہ پہلا اثر دوسری زبان کا ہے، اس کے علاوہ جب یہ دونو ایک جگہ رہ سہکر شیر وشکر ہوتی ہیں تو ایک زبان میں دوسری زبان کے لفظ بھی گھل مل جاتے ہیں۔

جب مہمان و میزبان ایک دوسرے کی زبان سمجھنے لگتے ہیں تو ایک خوشنما اور مفید تبدیلی کے لئے رستہ پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ اگرچہ طبع انسانی کے اتحاد سے سب کے خیالات متفق یا قریب قریب ہوں، مگر انداز بیان سب کا جدا جدا ہے اور طبیعت ہمیشہ نئے انداز کو پسند کرتی ہے، اس لئے ادائے مطلب میں ایک دوسرے کے انداز بیان سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں، پھر نئی نئی تشبیہیں، لطیف استعارے لیکر اپنی پرانی تشبیہوں و مستعمل استعاروں کا رنگ بدلتے ہیں، اور جس قدر زبان میں طاقت ہے، ایک دوسرے کے خیالات اور نئی طرز کو لیکر اپنی زبان میں نیا مزہ پیدا کرتے ہیں۔

یہ انقلاب حقیقت میں وقت بوقت ہر ایک زبان پر گزرتا ہے، چنانچہ قوم عرب نے جو ایک زمانہ میں روم یونان اور ہسپانیہ وغیرہ سے خلط ملط ہوئی تھی، ہزاروں لفظ علمی اور غیر علمی وہاں سے لئے، اسی طرح فارسی زبان عربی و ترکی وغیرہ الفاظ سے مالا مال نظر آتی ہے، انگریزی کے باب میں مجھے کہنا زیبا نہیں، کیونکہ اب روشن ضمیر انگریزی خوان بہت ہیں، اور وہ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں،

مگر اتنا کہنا کافی ہے کہ جس طرح ایک مہذب سلطنت کو تمام ضروریات سلطنت کے کارخانے اور ملکی سامان ہونے چاہئیں۔ اسی طرح سب قسم کے الفاظ اور تمام ادائے خیالات کے انداز انگریزی زبان میں موجود ہیں۔

اب مجھے اپنی زبان میں گفتگو کرنی چاہیے، لیکن پھر یاد دلانا واجب ہے کہ اُردو کہاں سے نکلی ہے اور کیونکر نکلی ہے؟ اُردو زبان اول لین دین نشست برخاست کی ضرورتوں کے لئے پیدا ہوگئی، ہندوؤں کے ساتھ ہندی مسلمان جو اکثر ایرانیوں یا ترکستانیوں کی اولاد تھے، ہندوستان کو وطن اور اس زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے یہ بھی ظاہر ہے کہ جس طرح زمین بے روئیدگی کے نہیں رہ سکتی، اسی طرح کوئی زبان، بے شاعری کے نہیں رہ سکتی، محمد شاہی دور تھا، اور عیش و عشرت کی بہار تھی، ان شرفا کو خیال آیا ہوگا کہ جس طرح ہمارے بزرگ اپنی فارس کی انشا پردازی میں گلزار دکھلاتے تھے، اب ہماری یہی زبان ہے ہم بھی اس میں کچھ رنگ دکھائیں۔ چنانچہ وہی فارسی کے خاکے اُردو میں اُتار کر غزل خوانیاں شروع کر دیں اور قصیدے کہنے لگے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ قوت بیان یا لفظوں کی تراش یا ترکیبوں کی خوبصورتی یا تشبیہ اور استعاروں کی رنگینی، غرض اول جو کچھ نصیب ہوا شعرائے اُردو کی بدولت ہوا، اور یہی سبب ہے کہ جو کچھ سامان ایک ملکی اور ٹکسالی زبان کے لئے درکار ہوتے ہیں، اُس سے یہ زبان مفلس رہی، کیونکہ اُس عہد میں، علوم و فنون، تاریخ، فلسفہ، ریاضی وغیرہ کا چرچا عام ہوتا تو اس کے لئے بھی الفاظ ہو جاتے، جن جن باتوں کا چرچا تھا، اُن ہی سامانوں کے الفاظ اور خیالات پیدا ہوئے، ہاں یہ کہنا ضرور چاہیئے کہ جو کچھ ہوا تھا اپنے رنگ پر خوب ہوا تھا"۔ (آبحیات (۲۵ - ۲۶)

لوگ کہتے ہیں کہ علامہ آزاد تحقیق کے میدان کے مرد نہ تھے آئیں اور دیکھیں کہ اس سے زیادہ تحقیق اور

کیا ہو سکتی ہے، ملاحظہ ہو، الفاظ کی کیسی چھان بین کی ہے کہ داد نہ دینا ظلم ہے، اب ہمیں یہ مطلب پر آنا چاہیے کہ بھاشا نے اردو کے کیسٹر ے پہنچنے کے لئے فارسی سے کیا کیا لیا؟

"(۱) اُن چیزوں کے نام لئے جو عرب اور فارس سے آئیں اور اپنے نام اپنے ساتھ لائیں مثلاً۔ لباس میں فرغل، لبادہ، کرتہ، قبا، چوغا، آستیں، گریبان، پائجامہ، ازار، عمامہ، رومال، شال، دوشالہ، تکیہ، گاؤتکیہ، برقع، پوستیں وغیرہ کھانے کے ذیل میں دسترخوان، چپاتی، شیرمال، باقرخانی، پلاؤ، زردہ، مزعفر، قلیہ، قورمہ، معجون، فرنی، یاقوتی، حریرہ، ہریسہ، لوز، مربے، اچار، فالودہ، گلاب، بیدمشک، خوان، طبق، رکابی، تشتری، کفگیر، چمچہ، سینی، کشتی چائے جوش وغیرہ متفرقات میں، حمام، کیسہ، سابون، شیشہ، شمع، شمعدان، فانوس، گلگیر، تنور، رفیدہ، مشک، نماز، روزہ، عید، شب برات، قاضی، ساقی، حقہ، نیچہ، چلم، تفنگ، تختہ نرد، گنجفہ اور اُنکی اصطلاحیں یہ سب چیزیں، اپنے نام ساتھ لیکر آئیں، بہت سی چیزیں آئیں کہ بھاشا میں ان کے نام نہیں، سنسکرت کی کتابوں میں ہوں گے البتہ۔ بادام۔ پستے۔ شہتوت۔ بیدانہ۔ خوبانی۔ زنجیر۔ سیب۔ بہی۔ ناشپاتی۔ انار وغیرہ۔

(۲) بہت سے عربی فارسی کے لفظ کثرت استعمال سے اس طرح جگہ پکڑ بیٹھے ہیں کہ اب ان کی جگہ کوئی سنسکرت یا قدیمی بھاشا کا لفظ ڈھونڈھ کر لانا پڑتا ہے مگر اس میں یا تو مطلب اصلی فوت ہو جاتا ہے، یا زبان ایسی مشکل ہو جاتی ہے کہ عوام تو کیا خواص ہنود کی سمجھ میں نہیں آتی۔ مثلاً دلال، فراش، مزدور، وکیل، جلاد، صراف، مسخرا، نصیحت،

لحاف، توشک چادر، صورت، شکل، چہرہ، طبیعت، مزاج، برف، فاختہ، قمری، کبوتر، بلبل، طوطا، پر، دوات، قلم، سیاہی، جلاب، رقعہ، عینک، صندوق، کرسی، تخت، لگام، رکاب، زین، تنگ، پوزی، نعل، کوتل، عقیدہ، دغا، جہاز، مستول، بادبان، تہمت، درہ، پردہ، دالان، تہ خانہ، ملاح، تازہ، غلط، صحیح، رسد، سرباری، کاریگر، ترازو، شطرنج کے باب میں تعجب ہے خاص ہند کا ایجاد ہے مگر عرب اور فارس سے جو پھر کر آئی تو سب اجزا کے نام اور اپنی اصطلاحیں بدل آئی"۔ (آبحیات ص۲۳)

یوں تو علامہ آزاد کی تمام کتابیں تحقیق و تدقیق بلند پردازی و جدت پسندی سے پر ہیں، مگر آبحیات، سخندان فارس اور دربار اکبری، وغیرہ اس لحاظ سے خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یہ قابل تسلیم ہے کہ تاریخ میں انکی تحقیق بہت سطحی ہے، اور جو بات مولانا شبلی میں ہے وہ نہیں اور حق یہ ہے کہ اردو میں انکا سا مورخ نہیں گذرا، لیکن جیسا کہ اس کے قبل عرض کر چکا ہوں، ہم کو بحث انشا پردازی سے ہے اور اس لحاظ سے خلاقین اردو میں کوئی انکے آگے سر اونچا نہیں کرسکتا، یہ بھی غلط ہے کہ آزاد کی تمام تحقیق قابل اعتنا نہیں، بلکہ انکی تحقیق السنہ اس درجہ کی ہے، کہ کوئی مصنف اس کا دعوی انکے روبرو نہیں کرسکتا، مذکورہ بالا اقتباس سے اس کا ثبوت ملتا ہے، سچ ہے کہ آزاد نے آبحیات لکھکر اردو پر بہت بڑا احسان کیا، کہ اردو کی ایسی مکمل تاریخ موجود ہے، آبحیات فقط چند شاعروں کا تذکرہ نہیں ہے، بلکہ اردو کی ایک مکمل تاریخ اور مسائل السنہ کا نایاب مجموعہ، بہت سے شاعروں کے تذکرے لکھے گئے، آجتک کوئی اتنا کامیاب تذکرہ لکھنے پر کامیاب نہیں ہوا، جن لوگوں نے آزاد کی تصانیف پڑھی ہیں، وہ اس لطف خاص سے باخبر ہونگے، کہ آزاد اپنی ساحرانہ انشا پردازی سے ہم کو برائی العین جو کتا ہے دکھا دیتا ہے، آپ نے اگر آبحیات دیکھا ہے، تو ضرور ابتک آنکھوں کے

سامنے میر و سودا، جرأت و انشا، قتیل و مصحفی، ناسخ و آتش، ذوق و غالب کے جلسے پھر ریاں ہو نگے۔

آزاد نے پیچیدہ سے پیچیدہ مشکل سے مشکل مسائل بیان کیے ہیں، مگر سب اپنے انداز خاص میں، شعر و شاعری کا بیان جس لطیف پیرایہ میں کیا ہے، کہا جاسکتا ہے، کہ اس کا جواب نہیں، ہزارہا لوگوں نے شعر و شاعری پر بحث کی، لیکن نہ اتنی پُر لطف،

ملاحظہ فرمائیے، اتنا دقیق مسئلہ اور یہ کوثر کی دُھلی ہوئی زبان، سبحان اللہ!

وہ فلاسفہ یونان کہتے ہیں کہ شعر خیالی باتیں ہیں، جنکو واقفیت اور اصلیت سے تعلق نہیں، قدرتی موجودات یا اُس کے واقعات کو دیکھکر جو خیالات شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے مطلب کے موقع پر موزوں کردیتا ہے، اس خیال کو سچ کی پابندی نہیں ہوتی، جب صبح کا نور ظہور دیکھتا ہے، تو کبھی کہتا ہے دیگ مشرق سے دودھ اُبلنے لگا، کبھی کہتا ہے، دریائے سیماب موج مارنے لگا، کوئی مشرق سے کافور اُڑا آتا ہے، صبح تباشیر بکھیرتی آتی ہے، یا مثلاً سورج نکلا اور کرن ابھی اُس میں نہیں پیدا ہوئی وہ کہتا ہے، سنہری گیند ہوا میں اُچھالی ہے، صبح طلائی تھال سر پہ دھرے آتی ہے کبھی مرغان سحر کا غل، اور عالم نور کا جلوہ، آفتاب کی چمک دمک اور شعاعوں کا خیال کرکے صبح کی دھوم دھام دکھاتا ہے، اور کہتا ہے، بادشاہ مشرق سبز خنگ فلک پر سوار تاج مرصع رکھے، کرن کا نیزہ لیے مشرق سے نمودار ہوا، شام کو شفق کی بہار دیکھتا ہے تو کہتا ہے، مغرب کی چھپر کھٹ میں آفتاب نے آرام کیا، اور زنگاری چادر تانکر سو رہا، کبھی کہتا ہے، جام فلک خون سے چھلک رہا ہے، نہیں مغرب کے ایوان میں آگ لگ گئی، تاروں بھری رات میں چاند دیکھتا ہے تو کہتا ہے، لاجوردی چادر میں تارے ٹنکے ہوئے ہیں، دریائے نیل میں نور کا جہاز چلا جاتا ہے، اور روپے کی مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں، غرض ایسی ایسی باتیں ہیں کہ نہایت لطف دیتی ہیں مگر اصلیت سے انہیں کچھ بھی غرض نہیں ہے۔

باوجود اس کے صنعت گاہ عالم میں نظم ایک عجیب صنعت صنائع الٰہی سے ہے، اسے دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے کہ اول ایک مضمون کو ایک سطر میں لکھتے ہیں، اور نثر میں پڑھتے ہیں پھر اسی مضمون کو فقط لفظوں کے پس و پیش کے ساتھ لکھ کر دیکھتے ہیں تو کچھ اور ہی عالم ہو جاتا ہے، بلکہ اس میں چند کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں،

(۱) وہ وصف خاص ہے کہ جسے سب موزونیت کہتے ہیں،

(۲) کلام میں زور زیادہ ہو جاتا ہے، اور مضمون میں ایسی تیزی آجاتی ہے کہ اثر کا نشتر دل پر کھٹکتا ہے،

(۳) سیدھی سادی بات میں ایسا لطف پیدا ہو جاتا ہے کہ سب پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں، اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب خوشی یا غم، غصہ یا کسی قسم کے ذوق و شوق کا خیال دل میں جوش مارتا ہے، اور وہ قوت بیان سے ٹکر کھاتا ہے، تو زبان سے خود بخود موزوں کلام نکلتا ہے، جیسے پتھر اور لوہے کے ٹکرانے سے آگ نکلتی ہے،

اسی واسطے شاعر وہی ہے جس کی طبیعت میں یہ صفت خدا داد ہو، قدرتی شاعر اگرچہ ارادہ کر کے شعر کہنے کو خاص وقت میں بیٹھتا ہے، مگر حقیقت میں اس کا دل اور خیالات ہر وقت اپنے کام میں لگے رہتے ہیں، قدرت کے کارخانے میں جو چیز اس کے حواس میں محسوس ہوتی ہے، اور اس سے جو کچھ اثر اس کی طبیعت اٹھاتی ہے، وہ ہر شخص کو نصیب نہیں، خواہ لطف و شگفتگی ہو، خواہ آزردگی یا بیزاری، یہ ضرور ہے کہ جو کیفیت وہ آپ اٹھاتا ہے اس کے لئے ڈھونڈھتا رہتا ہے کہ کیسے لفظ ہوں اور کس طرح انھیں ترکیب دوں، تاکہ جو کیفیت اس کے دیکھنے سے میرے دل پر طاری ہے، وہی کیفیت سننے والوں کے دل پر چھا جائے اور وہ بات کھول کر اثر کر جائے۔ (آبحیات ص ۶۲-۶۳)

آزاد نے آبحیات کے شعراء کو پانچ دور پر تقسیم کیا ہے، ہر دور کے شروع میں تمہید لکھی ہے، اسکو دیکھیئے، اُردو کے انشا پردازوں کو ایسے لطیف تشبیہ و استعارے نہ ملے ہونگے، عبارت کے جملوں کو اس در وبست سے ترتیب نہ دیا ہوگا، ترکیبوں کی بندش اس حسن وخوبی سے نہ کی ہوگی، میں تھوڑا تھوڑا سب میں سے اقتباس کرتا ہوں، پہلے دور کی تمہید میں تحریر فرماتے ہیں:-

"نظم اُردو کے عالم کا پہلا نوروز ہے، نفس ناطقہ کی روح یعنی شاعری عالم وجود میں آئی تھی، مگر بچوں کی نیند سوتی تھی، ولی نے آکر ایسی میٹھی میٹھی آواز سے غزل خوانی شروع کی ہے کہ اُس بچے نے ایک انگڑائی لیکر کروٹ لی، اور اثر اُسکا دفعۃً حرارت برقی کی طرح دل میں دوڑ گیا، گھر گھر شاعری کا چرچا ہے، جس امیر اور جس لطیف کو دیکھو شعر کی سوچ میں غرق بیٹھا ہے، ان بزرگوں کی باتیں تو انکے شعروں سے سُن ہی سکتے ہو، مگر حیران ہوں کہ صورت دکھاؤں تو کیونکر، اول تو حرفوں میں تصویر کھینچنی مشکل اُس پر میں زبان کا پابند، اس رنگ کے الفاظ کہاں سے لاؤں جو ایسے لوگوں کی جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویر کھینچ دکھاؤں کہ ادب کی آنکھ اُنکی متانت پر نظر نہیں اٹھا سکتی، اور محبت کی آنکھ اُنکی پیاری حالت پر سے نگاہ نہیں ہٹا سکتی، دیکھو جلسہ مشاعرہ کا اُمرا و شرفا سے آراستہ ہے، معقول معقول بڈھے اور جوان برابر لمبے لمبے جامے، موٹی موٹی پگڑیاں باندھے بیٹھے ہیں، کوئی کٹارہ بھی باندھے ہے، کوئی سیف لگائے ہے، بعض وہ کہن سال ہیں کہ جنکے بڑھاپے کو سفید داڑھی نے نورانی کیا ہے، بعض ایسے ہیں کہ عالم جوانی میں اتنا تاؤ داڑھی کو رخصت کیا تھا، اب کیونکر رکھیں کہ وضعداری کی باتوں کو توڑتا ہے، اس پر خوش مزاجی کا یہ عالم ہے کہ اونکے بڑھاپے کی زندہ دلی سے آج نوجوانوں کی جوانی پانی پانی ہوتی ہے، ان شوخیوں سے انھیں اور کچھ مطلب نہیں [illegible] آپ ہنسیں اور اوروں کو خوش کریں۔"

(آبحیات صفحہ [illegible])

دوسرے دور کی تمہید یوں لکھی ہے :۔

"دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس فصل میں زبان کے حسن قدرتی کے لئے موسم بہار ہے یہ وہ وقت ہے کہ مضامین کے پھول گلشن فصاحت میں اپنے قدرتی جوبن دکھا رہے ہیں، حسن قدرتی کیا شے ہے، ایک لطف خدا داد ہے جس میں بناؤ سنگار کا نام بھی آجائے تو تکلف کا داغ سمجھ کر سات سات پانی سے دھوئیں، انکا گلزار نیچر کی گلکاری ہے صنعت کی دستکاری یہاں آکر قلم لگائے تو ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں اسمیں تو کلام نہیں کہ یہ باکمال بھی ایک ہی شہد کی مکھی ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ دریائے بحث میں ڈوبے ہوئے ہیں، مگر اس خوبی کا وصف کسی زبان سے ادا نہیں ہوتا کہ جو کچھ دل میں ہوتا ہے، جوں کا توں ادا کرتے ہیں، خیالی رنگوں کے طوطا مینا نہیں بناتے، ہاں طوطی و بلبل کی طرح صاف زبان اور قدرتی الحان لائے ہیں انھوں نے اپنے نغموں میں گٹکری، اپج، بلٹی، تان کسی گویے سے لیکر نہیں ڈالی، تم دیکھنا! بے تکلف بولی اور سیدھی سادی باتوں سے جو کچھ دل میں آئیگا۔ ایسا بیساختہ کہدینگے، کہ سامنے تصویر کھڑی کر دیں گے، اور جبتک سننے والے سنینگے، کلیجے پکڑ کر رہجائینگے اس کا سبب کیا ہے، وہی بیساختہ پن، جس کے سادہ پن پر ہزار بانکپن قربان ہوتے ہیں ع ہے حسن وہی جس میں بے ساختہ پن نکلے۔"

(آبحیات صنہ)

تیسرے دور کی تمہید میں اس طرح موتی پروئے ہیں :۔

"اس مشاعرہ میں اُن صاحب کمالوں کی آمد آمد ہے، جنکے پانداز میں فصاحت آنکھیں بچھاتی ہے، اور بلاغت قدموں میں لوٹی جاتی ہے، زبان مذکورہ جو ابتدا میں کچا سونا تھی، ان بزرگوں نے اُسے اکثر کھوٹ وں سے پاک صاف کیا، اور ایسا بنا دیا جس سے ہزاروں عمر قدسی کلام، اور آرائشوں کے سامان حسینوں کے

زیور، بلکہ بادشاہوں کے تاج و افسر تیار ہوئے ہیں، اگرچہ بہت سے مرصع کار مینا نگار پیچھے آئے مگر اس فخر کا نولکھا ہار انہیں بزرگوں کے گلے میں رہا، جب یہ باکمال چمن کلام میں آئے، تو اپنے بزرگوں کی چمن بندی کی سیر کی، فصاحت کے پھول کو دیکھا، کہ قدرتی بہار میں حسن خداداد کا جوبن دکھا رہا ہے، چونکہ انہیں بھی ناموری کا تمغا لینا تھا، اس لئے بڑوں سے بڑھکر قدم مارنے چاہے، یہ گرد و پیش کے میدانوں میں بہت دوڑے، سب پھول کام میں آئے ہوئے تھے، جب سامنے کچھ نہ پایا، تو ناچار اپنی عمارتوں کو اونچا اٹھایا، تم دیکھنا! وہ بلندی کے مضمون نہ لائیں گے، آسمان سے تارے اتارین گے۔ قدردانوں سے نقد داد نہ لین گے، پرستش لیں گے، لیکن نہ وہ پرستش کہ سامری کی طرح عارضی ہو، ان کے کمال کا دامن قیامت سے بند باپاؤ گے، یہ اپنی صنعت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے مگر ایسا، جیسے گلاب کے پھول پر شبنم، یا تصویر پر آئینہ، انکا تکلف بھی اصلی لطافت پر کچھ لطف زیادہ کریگا، اس کی خوبی کا پردہ نہ ہوگا، تم میر صاحب اور خواجہ درد کو دیکھو گے کہ اثر میں ڈوبے ہونگے، سودا کا کلام باوجود بلندی مضمون، و تشبیہ [illegible] کے تیر کا عکس ہوگا" (صفحہ ۱۱۱)

چوتھے دور کی تمہید کے باغ میں یوں گل کھلائے ہیں:۔

"قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں، دیکھنا اہل مشاعرہ آن پہونچے یہ کچھ اور لوگ ہیں، انکا آنا غضب کا آنا ہے، ایسے زندہ دل اور شوخ طبع ہونگے، کہ جنکی شوخی اور طراری طبع بارشانت سے ذرا نہ دبیگی، اتنا ہنسیں اور ہنسائیں گے کہ منہ تھک جائینگے، مگر نہ ترقی کے قدم آگے بڑھا سکینگے، نہ اگلی عمارتوں کو بلند اٹھائیں گے، انہیں کوٹھوں پر کود تے پھاندتے پھرینگے، ایک مکان کو دوسرے مکان سے سجائیں گے، اور ہر [illegible] بدل بدل کر [illegible] انہیں پھول عطر میں بسائینگے،

کبھی ہار بنائیں گے، کبھی طرّے سجائیں گے، کبھی انھیں پھولوں کی گیندیں بنا لائیں گے اور وہ گلبازی کرینگے، کہ ہولی کے جلسے گرد ہو جائینگے، ان خوش نصیبوں کو زمانہ بھی اچھا ملیگا، ایسے قدردان ہاتھ آئیں گے کہ ایک ایک پھول انکا چمن زعفران کے مول بکیگا۔

اس دور میں میاں رنگیں سب سے نئے گلدستے بناکر لائے اور اہل جلسہ کے سامنے سجائے یعنی ریختہ میں ریختی نکالی" صفحہ ۲۱۴

پانچویں دور کی تمہید یوں باندھی ہے:۔

"دیکھنا! وہ لالٹینیں جگمگانے لگیں، اٹھو اٹھو استقبال کرکے لاؤ۔ اس مشاعرہ میں وہ بزرگ آتے ہیں جن کے دیدار ہماری آنکھوں کا سرمہ ہوئے، اس میں دو قسم کے باکمال نظر آئیں گے ایک وہ جنھوں نے اپنے بزرگوں کی پیروی کو دین آئین سمجھا، یہ انکے باغوں میں پھریں گے، پرانی شاخیں زرد پتّے کاٹیں چھانٹیں گے اور نئے رنگ نئے ڈھنگ کے گلدستے بناکر گلدانوں سے طاق و ایوان سجائیں گے، دوسرے وہ عالی دماغ جو فکر کے دخان سے ایجاد کی ہوائیں اڑائینگے، اور برج آتشبازی کی طرح اس سے رتبۂ عالی پائیں گے۔ انھوں نے اس ہوا سے بڑے بڑے کام لیے، مگر غضب یہ کیا، کہ گرد و پیش جو وسعت بے انتہا پڑی تھی، اس میں سے کسی جانب میں متوجہ نہ ہوئے، بالا خانوں میں سے بالا بالا اڑ گئے"

(آبحیات صفحہ ۳۱۷ مجتبائی پریس)۔

آزاد انشاپردازی کا خدا ہے، مطالب کو الفاظ کی جن صورتوں میں چاہتا ہے، ظاہر کرتا ہے، عبارت کی درستی و چستی میں بندش، برجستگی جتنا ضرورت سمجھتا ہے، خرچ کرتا ہے، سلاست و صفائی میں حد کرتا ہے، استعارے و تشبیہ کے رنگ دیتا ہے [illegible] اور

بیکار کرنے کے لئے، آنکھوں کو مجسم کرکے دکھانے کے واسطے، جلوہ نشیں کرتا ہے،" "واقعات اس کے قلم کے غلام ہیں، قلم جہاں چاہتا ہے، ہاتھ باندھے بندھائے قصوں کو کھینچے لاتا ہے، کبھی طوفاں کی آندھیاں چلاتا ہے، کبھی نسیم کی ہلکی لہروں کو فضائے صفحات میں تیرنے کو بلا لیتا ہے"

دربارِ اکبری جو بقول خواجہ حسن نظامی صاحب "تاریخ کی کتاب بھی ہے اور ادب وانشا کا چمن بھی"، اس میں آزاد نے صرف عامیانہ طریقہ سے اکبر کی سوانحعمری نہیں لکھی ہے، بلکہ اکبر کے زمانہ کا مفصل حال لکھا ہے "اس زمانہ کی تاریخ کو صرف شاہی کارناموں تک محدود نہیں کیا، بلکہ اس زمانہ کے رسم و رواج، طرزِ بود و ماند، ملک کی عام حالت رعایا کی فرفہ الحالی، اور دیگر خیالات کا نقشہ کھینچکر پڑھنے والے کو یہ یقین دلایا ہے کہ وہ اس زمانہ میں زندگی بسر کر رہا ہے" اور اپنی آنکھوں سے تمام حالات کا مشاہدہ کر رہا ہے"[1]

اکبر کے دربار کا نقشہ کھینچ کے دکھایا ہے، میدان رزم کے معرکے اور بزم کے جلسے اپنے انداز خاص میں لکھے ہیں، دیکھئے اردو میں ایسی نادر، بےمثل کتاب موجود ہونے پر تعجب ہوتا ہے، حیرت تو یہ ہے، اردو بیچاری جس کا سرمایہ ناز ابھی تک غالب کے رقعات "اردوئے معلّٰی" ہو، ایسی ترقی کر جائے، ایک دم سے ایسے بلند مقام پر پہونچ جائے، کہ اس سے زیادہ رفعت نہیں، جس کے آگے سب پستی ہے، یعنی جس انداز میں دربار اکبری لکھی ہے یہ امر بالکل طے شدہ ہے کہ آزاد ہی اردو کے انشا پردازوں میں سب سے پہلے شخص ہیں، جنھوں نے نثر کو نظم کا ہم پایہ بنا دیا، اور "الفضل للمتقدم" کا شرف انھیں کو حاصل ہے، کہ انشا پردازی میں اتنی قوت پیدا کی کہ ہر قسم کے مطالب ادا ہو سکیں۔

---

[1] الناظر بابت اکتوبر و نومبر ۱۹۱۴ء۔

انکی انشاپردازی میں یہ قوت خاص ہے، کہ ہر قسم ورنگ، ہر نوع اور ڈھنگ کے مطالب اُسی حسن وخوبی کے ساتھ جیسا کہ حق ہے ادا کرتے ہیں۔ اُردو کے بہت کم انشاپرداز یہ دعویٰ کر سکتے ہیں، کہ اپنے مافی الضمیر کو سلاست وروانی کے ساتھ ادا کر سکیں مورخوں اور سوانح نگاروں نے بادشاہوں کے تخت نشینی وتاج پوشی کے جشن دکھانے میں زور قلم خرچ کیا ہوگا، اور صفحے کے صفحے رنگے ہونگے، مگر آزاد کی اس بے تکلف وتصنع عبارت سے زیادہ اثر پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہوئے ہونگے، سچ تو یہ ہے کہ مورخ زیادہ سے زیادہ یہی لکھیگا، کہ سنہ فلاں میں عنان حکومت ہاتھ میں لی، مگر ایک انشاپرداز اپنے ممدوح کو یوں تخت نشیں کرتا ہے،

"بموجب اتفاق رائے جمعہ کے دن ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ نماز کے بعد تیموری تاج نے اکبری اقبال کے رنگ میں جلوہ دکھایا، اسوقت اس کی عمر شمسی حساب سے ۱۳ برس نو مہینے کی اور قمری حساب سے ۱۴ برس کئی مہینے کی تھی، بموجب آئین چنگیزی وتیموری کے تمام رسمیں جشن شاہانہ کی ادا ہوئیں۔ بہار نے پھول برسائے، آسمان نے تارے اُتارے۔ اقبال نے چترشکر سر پر سایہ کیا، اُمرار کے منصب بڑھے، خلعت انعام جاگیریں تقسیم ہوئیں، فرمان جاری کیے۔ (دربار اکبری صفحہ ۱۲)

ہمیوں بقال اور فوج شاہی میں جو جنگ ہوئی اسکو یوں شروع کیا ہے:

"لڑائی شروع ہوئی، پہلے توپ وتفنگ کے گولوں نے لڑائی کے پیغام پہنچائے نیزوں کی زبانیں جنبش میں آئیں، تھوڑی ہی دیر میں لشکر شاہی کا ہراول اور داہنا ہاتھ آگے بڑھا اور اس زور سے ٹکر ماری کہ اپنے سامنے کے حریفوں کو اُلٹ کر پھینک دیا"۔

مہرالنساء یعنی نورجہاں کا واقعہ اتنا دلچسپ ہے، کہ ایک صائب الرائے اہل قلم[1] کا اس کے متعلق خیال ہے:۔ کہ پروفیسر آزاد نے جس خوبصورتی سے اسکو

[1] [illegible]

دکھایا ہے انشا پردازی کو آج تک اس سے بہتر الفاظ نہ مل سکے"۔ وہ واقعہ یہ ہے:-

"دنیا کے معاملات سخت نازک ہیں، کوئی بات ایسی نہیں جس کے فوائد کے ساتھ نقصان کا کھٹکا نہ لگا ہو۔ اسی آمد و رفت میں سلیم (جہانگیر) کا دل زین خان کوکہ کی بیٹی پر آیا اور ایسا آیا کہ قابو ہی میں نہ رہا۔ غنیمت ہوا کہ ابھی شادی نہ ہوئی تھی، اکبر نے فوراً شادی کر دی، لیکن قابل عبرت وہ معاملہ ہے جو کہن سال بزرگوں سے سنا ہے۔ یعنی یہی مینا بازار لگا ہوا تھا، بیگمات پڑی پھرتی تھیں جیسے باغ میں قمریاں یا ہریاول میں ہرنیاں، جہانگیر ان دنوں نوجوان لڑکا تھا، بازار میں پھرتا ہوا چمن میں آنکلا ہاتھ میں کبوتر کا جوڑا تھا۔ سامنے کوئی پھول کھلا ہوا نظر آیا کہ عالم کے سرور میں بہت بھایا۔ چاہا کہ توڑے۔ دونوں ہاتھ رکے ہوئے تھے، وہیں ٹھہر گیا۔ سامنے سے ایک لڑکی آئی۔ شہزادہ نے کہا کہ بوا ذرا ہمارے کبوتر لے لو۔ ہم وہ پھول توڑ لیں۔ لڑکی نے دونو کبوتر لے لئے۔ شہزادہ نے کیاری میں جا کر چند پھول توڑے۔ پھر کر آیا تو دیکھا لڑکی کے ہاتھ میں ایک کبوتر ہے۔ پوچھا دوسرا کبوتر کیا ہوا؟ عرض کی صاحب عالم! وہ تو اُڑ گیا، پوچھا، ہیں! کیونکر اُڑ گیا؟ اس نے ہاتھ بڑھا کر دوسری مٹھی بھی کھول دی کہ حضور یوں اُڑ گیا! اگرچہ دوسرا کبوتر بھی ہاتھ سے گیا، مگر شہزادے کا دل اس انداز پر لوٹ گیا، پوچھا، تمھارا نام کیا ہے؟ عرض کی، مہرنسا خانم، پوچھا تمھارے باپ کا کیا نام ہے؟ عرض کی مرزا غیاث، حضور کا ناظم بیوتات ہے، کہا، اور امرا کی لڑکیاں محل میں آیا کرتی ہیں، تم ہمارے ہاں نہیں آتیں؟ عرض کی میری اماں جان تو آتی ہیں، مجھے نہیں لاتیں، ہمارے ہاں لڑکیاں گھر سے باہر نہیں نکلا کرتیں، آج بھی بڑی منتوں سے یہاں لائی ہیں، کہا تم ضرور آیا کرو، ہمارے ہاں بڑی احتیاط سے پردہ رہتا ہے، کوئی غیر نہیں آتا۔"

وہ سلام کر کے رخصت ہوئی۔ جہانگیر باہر آگیا، مگر دونوں کو خیال رہا۔

تقدیر کی بات ہے کہ پھر جو مرزا غیاث کی بی بی بیگم کے سلام کو محل میں جانے لگی، تو بیٹی کے کہنے سے اُسے بھی ساتھ لیا، بیگم نے دیکھا، بچپن کی عمر، اُس میں ادب قاعدے کا لحاظ، سلیقہ اور تمیز اُس کی بہت بھلی معلوم ہوئی، باتیں چیتیں پیاری لگیں، بیگم نے بھی کہا کہ اِسے تم ضرور لایا کرو، آہستہ آہستہ آمد و رفت زیادہ ہوئی، شہزادے کا یہ عالم کہ جب وہ ماں کے پاس آئے تو وہاں موجود، وہ دادی کے سلام کو جائے تو یہ وہاں حاضر، کسی نہ کسی بہانے سے خواہ مخواہ اُس سے بولتا، بات چیت کرتا تو اُس کا طور ہی کچھ اور، نگاہوں کو دیکھو تو انداز ہی کچھ اور، غرض بیگم تاڑ گئی اور خلوت میں بادشاہ سے عرض کی، اکبر نے کہا مرزا غیاث کی بی بی کو سمجھا دو چند روز لڑکی کو یہاں نہ لائے، اور مرزا غیاث سے کہا کہ لڑکی کی شادی کر دو،

جب خان خاناں ٹھٹھ کی مہم پر تھا تو طہماسپ قلی بیگ ایک بہادر نوجوان شریف زادہ ایران سے آیا تھا، اور مہم مذکور میں کارنمایاں کر کے اُس کے مصاحبوں میں داخل ہو گیا تھا، وہ شریف نواز شرافت پرست اُسے ساتھ لایا تھا اور حضور میں اُس کی خدمتیں عرض کر کے دربار میں داخل کیا تھا، اُس نے شجاعت اور دلاوری کے دربار سے شیر افگن خاں کا خطاب حاصل کیا تھا، بادشاہ نے اُس کے ساتھ نسبت ٹھہرا دی، اور جلد ہی شادی کر دی، یہی شادی اُس جوان نامراد کی بربادی تھی، تدبیر میں کوتاہی نہیں ہوئی، تقدیر سے کس کا زور چل سکتا ہے، انجام اُس کا یہ ہوا کہ جو نہ ہونا تھا، سو ہوا، شیر افگن خاں موت کا شکار ہو کر جوانمرگ دنیا سے گیا، مہرالنسا بیوہ ہوئی چند روز کے بعد جہانگیری محلوں میں آ کر نور جہاں بیگم ہو گئی، افسوس نہ جہانگیر رہے نہ نور جہاں رہیں، ناموں پر دھبا رہ گیا + صفحہ ۱۵۶ -

رزم کی تصویر اس طرح کھینچی ہے، یہ کہہ سکتے ہیں، کہ کسی انشا پرداز نے ایسی تصویر نہ کھینچی ہوگی، یوں دکھانے کہ خون کے دریا بہا دئے ہوں، کشتوں کے

پشتے لگا دئے ہوں، مگر ایسا واقعی نقشہ، میدان رزم کا کسی نے نہ کھینچ دکھایا ہوگا، کتنے لطیف استعارے اور باکیفت تشبیہیں ہیں، پھر یہ محاورہ و روزمرہ ":-

سیستانی رستم نے جب حریف کی آمد آمد سنی تو جاسوس دوڑائے، لیکن بادشاہ کے آنے یا کمک منگانے کا کچھ خیال نہ کیا، فوج کو تیاری کا حکم سنایا اور امرا کو جمع کر کے مجلس مشورت آراستہ کی، میدان جنگ کے پہلو تقسیم کئے، پہلے یہی خبر آئی تھی، کہ ہیموں پیچھے آتا ہے، شادی خان سپہ سالاری کرتا ہوا فوج کو لاتا ہے، دفعتہً پرچہ لگا، کہ ہیموں خود ہی ساتھ آیا ہے، پانی پت سے ایک پڑاؤ آگے بڑھ کر گھرونڈہ پر مورچے باندھے ہیں، خان زماں کا آگے بڑھنے کا ارادہ تھا۔ مگر تھم گیا، اور شہر سے ہٹ کر مقابلے پر لشکر جمایا، چاروں پہلو امرا پر تقسیم کر کے فوجوں کا قلعہ باندھا، بیچ میں آپ اقبال کا نشان علم کیا، ایک بڑا سا چتر تیار کیا، اُسے اپنے سر پر لگایا، اور سپہ سالاری کی شان بڑھا کر قلب میں جا کھڑا ہوا، لڑائی شروع ہوئی، اور میدان کارزار گرم ہوا، طرفین کے بہادر بڑھ بڑھ کر تلواریں مارنے لگے، خان زمانی جان نثار بے جگر ہو کر حملے کرتے تھے، اور تلوار کی آنچ پر اپنی جان دے دے مارتے تھے، مگر باوجود اس کے کامیاب نہ ہو سکتے تھے، دھاوا کرتے تھے اور بکھر جاتے تھے، کیونکہ کم تھے، لیکن سیستانی شیر کا رعب سب کے دلوں پر چھایا ہوا تھا، کسی طرح باز نہ آتے تھے، لڑتے تھے، مرتے تھے، اور شیروں کی طرح بپھر بپھر کر جا پڑتے تھے،

ہیموں ہوائی[1] ہاتھی پر سوار، قلب لشکر کو سنبھالے کھڑا تھا، اور فوج کو لڑا رہا تھا، آخر کامیابی کا انداز دیکھ کر اُس نے ہاتھی ہول دئے، کالے پہاڑوں نے اپنی جگہ سے جنبش کی اور کالی گھٹا کی طرح آئے، اکبری نمک خوار خاطر میں نہ لائے، بھاگے مگر ہوش و حواس سے، کالے پانی کے سیلاب کو رستہ دیا اور لڑتے بھڑتے،

[1] ہیمو کے ہاتھی کا نام ہوائی تھا، منہ

ہٹتے چلے گئے، لڑائی کے وقت لشکر کا رُخ اور دریا کا بہاؤ ایک حکم رکھتا ہے کہ جدھر کو پھر گیا، پھر گیا، غنیم کے ہاتھیوں کی صف بادشاہی فوج کے ایک پہلو کو ریلتی ہوئی نکل گئی، خان زماں اپنی جگہ کھڑا تھا، اور سپہ سالاری کی دوربین سے نظر دوڑا رہا تھا، اُس نے دیکھا، کہ سیاہ آندھی جو سامنے سے اُٹھی، برابر کو نکل گئی، اب ہیموں قلب لشکر کو لئے کھڑا ہے، یکبارگی فوج کو للکار کر حملہ کیا، حریف ہاتھیوں کے حلقے میں تھا، اور گرد بہادر افغانوں کا غول تھا، اُس نے پھر بھی، حلقے ہی کو ریلا، ترک تیروں کی بوچھار کرتے ہوئے بڑھے، اُدھر سے ہاتھی تلواریں سونڈوں میں ہلاتے اور زنجیریں جھلاتے آگے آئے ۔ اس وقت علی قلی خاں آگے بیرم خانی جوان جانفشانی کر رہے تھے، جن میں حسین قلی خاں اس کا بھانجا سپہ سالار تھا، اور شاہ قلی محرم وغیرہ مصاحب سردار تھے، سچ یہ ہے کہ بڑا سا کھا گیا اور ہاتھیوں کے حملے کو حوصلے اور ہمت سے روکا، وہ سینہ سپر ہو کر آگے بڑھے، اور جب دیکھا کہ گھوڑے ہاتھیوں سے بدکتے ہیں تو کود پڑے اور تلواریں کھینچکر صفوں میں گھس گئے، اُنھوں نے تیروں کی بوچھاڑ سے سیاہ دیوزادوں کے منہ پھیر دئے اور کالے پہاڑوں کو خاک تو وہ سا بنا دیا عجب گھمسان کا رن پڑا ۔ ہیموں کی بہادری قابل تعریف ہے، وہ ترازو باٹ کا اُٹھانے والا دال چپاتی کا کھانے والا ہودے کے بیچ میں ننگے سر کھڑا تھا، فوج کا دل بڑھاتا تھا اور فتح کا منتر جو کسی گیانی گنوان یا پنڈت بدیا وان نے بتایا تھا، جپے جاتا تھا فتح شکست خدا کے اختیار ہے، سپاہ کا ستھراؤ ہوگیا، شادی خاں افغان اس کے سرداروں کی ناک تھا کٹ کر خاک پر گر پڑا، فوج اناج کے دانوں کی طرح کھنڈ گئی، پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری، ہاتھی پر سوار چاروں طرف پھرتا تھا، سرداروں کے نام لے لے کر پکارتا تھا کہ سمیٹ کر پھر جمع کرلے اتنے میں ایک قضا کا تیر اس کی جھنگی آنکھ میں ایسا لگا کہ باہر نکل گیا، اُس نے اپنے ہاتھ سے

تیر کھینچکر نکالا، اور آنکھ پر رومال باندھ لیا۔ مگر زخم سے ایسا بیقرار اور بے حواس ہوا
کہ ہودے میں گر پڑا، یہ دیکھکر اس کے ہوا خواہوں کے جی چھوٹ گئے، سب
تتر بتر ہو گئے، اکبر کے اقبال اور خان زمان کی تلوار پر اس مہم کا فتح نامہ
لکھا گیا۔ (۲۰۲ - ۲۰۳)۔

خان زماں کی شجاعت و بہادری اس طرح دکھائی:-

خان زماں لکھنؤ کے مقام میں تھا، کہ حسن خاں ۲۰ ہزار آدمی سے آیا، اور خان زماں
کے پاس کل تین چار ہزار فوج، افغان دریائے سروہی سے اتر آئے، بہادر خاں
کی فوج نے گھاٹ پر روکا، خان زماں کھانا کھاتا تھا، خبر آئی کہ غنیم آن پہونچا،
یہ ہنسکر کہتے ہیں کہ ایک بازی شطرنج تو کھیل لو، مزے سے بیٹھے ہیں اور
چالیں چل رہے ہیں، پھر خبردار نے خبر دی کہ غنیم نے ہماری فوج کو ہٹا دیا،
آواز دی، ہتھیار لانا، بیٹھے بیٹھے ہتھیار سجے، جب خیمے ڈیرے لٹنے لگے اور لشکر میں
بھاگڑ پڑی، تب بہادر خاں سے کہا کہ اب تم جاؤ، وہ آگے گیا، دیکھے تو دشمن
دست و گریبان ہے جاتے ہی چھری کٹاری ہو گیا، پھر آپ تھوڑے سے رفیق کہ
رکاب میں تھے، لیکر چلا، نقارہ پر چوٹ مار کر جو گھوڑے اٹھائے تو اس کڑک دمک
سے پہنچا کہ غنیم کے قدم اکھڑ گئے اور ہوش اڑ گئے، ان کے انبوہ کو گٹھڑی کر کے
پھینک دیا، افغان اس طرح بھاگے جاتے تھے جیسے گلہ ہائے گوسپند، سات کوس
تک فرش کرتا چلا گیا کشتے کے پڑے تھے، اور زخمی لوٹتے تھے، شبدلیا اور دل سنگار
اس لڑائی کے ہاتھیوں میں ہاتھ آئے تھے" صفحہ ۲۱۴۔

۹۷۹ھ میں بداؤں میں آگ لگنے کا سمان ان الفاظ میں کھینچا ہے:-

"اس سال بداؤں میں بڑی آگ لگی، اور اتنے بندے خدا کے جل گئے کہ
گنے نہ گئے سبکو چھکڑوں میں بھر کر دریا میں ڈال دیا، ہندو مسلمان کچھ معلوم نہ ہو

سے نہ تھے موت کی آنچ تھی، ہائے جان بڑی پیاری چیز ہے، مرد عورت فصیل پر چڑھے اور باہر کود پڑے، جو بچ گئے، وہ جلے بھنے، لنگڑے لولے رہے، اپنی آنکھوں سے دیکھا، پانی آگ پر تیل کا کام کرتا تھا، شعلے دھڑ دھڑ کرتے تھے، اور دور تک آواز سنائی دیتی تھی، آگ نہ تھی، خدا کا قہر تھا بہتوں کو خاک کر کے پامال کر دیا، بہتوں کو گوشمالی دیدی، چند روز پہلے ایک مجذوب میاں دوآب کے علاقہ سے آیا تھا میں نے اُسے گھر میں اُتارا، باتیں کرتے کرتے ایک دن کہنے لگا، کہ یہاں سے نکل جا، میں نے کہا کیوں؟ بولا کہ یہاں خدائی کا تماشا نظر آئیگا، خراباتی تھا، مجھے یقین نہ آیا، (صفحہ ۴۳۲)۔

غربت و فلاکت، مصیبت اور آفت کے مناظر اس سے زیادہ بہتر طریقے سے دکھانا یقیناً ناممکن ہے؟۔

وہ اس حالت کی تصویر سے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں کہ باپ دربار سے رخصت ہو کر حج کو چلا گیا، گجرات پٹن پر ڈیرے ہیں، ابھی سورج جھلکتا ہے، شام قریب ہے۔ خیال یہ کہ اب خانخاناں آتا ہے، خبر آئی کہ وہ تو مارا گیا، اس کے مرتے ہی فوج میں تلاطم مچ گیا، پل کے پل میں گھر بار افغانوں نے لوٹ لیا، کوئی گٹھری لئے جاتا ہے، کوئی صندوقچہ، کسی نے سند گھسیٹ لی کوئی بچھونا لے چلا، اس بیکس مردے کے کپڑے تک اُتار لئے، لاش بے جان کو کفن کون دے؟ کہ اپنی ہی جان کا ہوش نہیں، وہ تین برس کی جان (مرزا عبدالرحیم خانخاناں) کیا کرتا ہوگا؟ سہم کر رہ جاتا ہوگا، ماں کی گود میں دبک جاتا ہوگا، ڈرتا ہوگا، انا کے پاس چھپ جاتا ہوگا، افسوس وہ بیچاریاں کہاں چھپا لیں کہ آپ ہی چھپنے کو جگہ نہیں، الٰہی تیری پناہ عجب وقت ہوگا، شام غریباں اسی کو کہتے ہیں، رات قیامت کی رات گذری ہوگی، دن ہوا

تورودِ محشر" (صفحہ ۵۶ مرزا عبدالرحیم خانخاں) ۔

نئی روشنی کا خاکہ کس ظرافت آمیز سنجیدگی میں اُڑایا ہے، رئیس کی تشریح کرتے ہوئے، تحریر فرماتے ہیں: ۔

ہمارے شاہاں وقت تو اس سے ("رئیس") اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ ایک شخص نے ہم حبش یا کابل پر جاکر کبھی کسی سڑک یا عمارت کا ٹھیکہ لیکر کبھی نہر کی نوکری کرکے بہت سا روپیہ کما لیا ہو، وہ اپنے گھر بیٹھا ہے، بگی پر چڑھ کر ہوا کھاتا ہے، جب شہزادہ عالم ولایت سے آتے ہیں، یا کوئی لاٹ صاحب جاتے ہیں مع صاحب کمشنر ایک گنج بناتے ہیں اس میں سب سے زیادہ چندہ دیتا ہے، یہ سرکار میں رئیس ہے، اور اسے دربار میں کرسی ملنے کا بھی حکم ہے، صاحب ڈپٹی کمشنر نے ایک موری کھی نکالی کہ جس میں تمام شہر کی کثافت نکل جائے، اس نے اس میں پہلے سے زیادہ چندہ دیا، بس یہ بڑا صاحب ہمت رئیس ہے، اسے خان بہادر یا رائے بہادر کا خطاب بھی ملنا چاہیے، اور میونسپل ممبر بھی ہو اور آنریری مجسٹریٹ بھی اگر کوئی تحصیلدار یا سررشتہ دار رجتا ہے کہ خداوندا اس میں اہل خاندان اور اہل ریاست کی دل شکنی ہوگی، صاحب کہتے ہیں: دل یہ ہمت والا لوگ ہے یہ رئیس ہے، اگر وہ رئیس ہونا چاہتے ہیں تو ہمت دکھائیں ہم اسے ستارۂ ہند بنائیں گے، تب وہ دیکھیں گے، نئے رئیس کا یہ عالم ہے کہ جب گھر سے نکلتے ہیں، تو چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہ ہمیں کون کون سلام کرتا ہے اور سب کیوں نہیں کرتے، خصوصاً جن لوگوں کو خاندانی سمجھتے ہیں، اُنھیں زیادہ تر دباتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ہماری ریاست جبھی ثابت ہوگی، جب یہ جھک کر سلام کریں گے اب مجسٹریٹی، شہر کا انتظام اُنکے ہاتھ میں ہے سبکو جھکنا واجب پڑا نہ جھکیں تو رہیں کہاں، مگر ان کی شیخیں، اور نمودوں اور

بار بار کے دباؤ کھانے سے فقط خاندانی ہی تنگ نہیں بلکہ اہل محلہ تنگ ہیں، جنھوں نے اصل خاندانیوں کے بزرگوں کو دیکھا ہے، وہ اُنھیں یاد کر کے روتے ہیں، اور جو بھول گئے تھے، اُنکے دلوں میں محبت کے مٹے ہوئے حرف روشن ہو جاتے ہیں، اہل نظر نے ایسے رئیسوں کا انگریزی رئیس اور انگریزی اشراف نام رکھا ہے،

آجکل رئیس کا لفظ کبھی کبھی اپنے جلسوں میں بھی ہمارے کانوں تک پہنچتا ہے، یہ کیفیت بھی سننے کے قابل ہے۔ مثلاً دو بزرگ سفید پوش ایک جلسہ میں آئے، ایک میر صاحب۔ ایک مرزا صاحب، آیئے تشریف رکھئے، میر صاحب اہل جلسہ سے کہتے ہیں جناب آپ نے ہمارے مرزا صاحب سے ملاقات کی، حضرت مجھے تعارف نہیں! جناب آپ دہلی کے رئیس ہیں، مرزا صاحب ایک طرف دیکھکر کہتے ہیں، قبلہ! ہمارے میر صاحب سے آپکی ملاقات ابتک نہیں ہوئی؟ جناب بندہ تو محروم ہے! "آپ لکھنؤ کے رئیس ہیں" اب لکھنؤ میں جاکر پوچھئے میر صاحب کہاں رہتے ہیں، کچھ ہوں تو پتا لگے، ماں ٹینی باپ کلنگ، بچے دیکھو رنگ برنگ، لاحول ولا قوۃ، مرزا صاحب کو دہلی میں ڈھونڈیے، تو "باپ دُھنیا ماں پُدینا، بٹیا مرزا دینا" نئی روشنی اصلیت کا اندھیر جو چاہے بن جائے، (صفحہ ۵۷۲)۔

محبت کی کتنی بلیغ تعریف کی ہے!۔

محبت تم جانتے ہو؟ کیا شئی ہے؟ ایک اتفاقی پسند ہے، تمھیں ایک شئی بھلی لگتی ہے، دوسرے کو بھلی نہیں لگتی، کیا تم چاہتے ہو کہ جو چیز تمھیں بھاتی ہے وہی سبکو بھائے یہ بات کیونکر چل سکیگی۔

ادا کرنے کی صلاحیت پیدا کی ہے، اسی طرح، آجکل کی شاعری بھی آزاد ہی کی کاوشوں کی مرہون منت ہے مصنف "افادات مہدی" نے ان چاروں کا باہم مقابلہ کرتے ہوئے کیا ہی، مناسب اور واقعی بات کہی ہے، کہ نذیر احمد بلا مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے شبلی سے تاریخ لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہجائیں گے، حالی بھی جہانتک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں، لیکن آقائے اُردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جنکو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں،

مولانا شبلی خود فرماتے ہیں،

آزاد کی کتاب آئی، جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں تاہم ادھر اُدھر کی گپیں ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے،

حالی بھی آزاد کی اُستادی کا لوہا مانتے تھے، چنانچہ لکھتے ہیں:-

"نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے، یعنی لٹریچر کے رقبہ کا طول و عرض بڑھ گیا، لیکن اسکا ارتفاع جہاں تھا وہیں رہا، یعنی اخلاقی سطح بہت اونچی نہیں ہوئی، لیکن آزاد کی پاکیزہ خیالی اور خوش بیانی نے یہ کمی پوری کر دی،

"نیرنگ خیال کی بہت کچھ داد دی ہے کیونکہ آزاد کے قلم نے پہلے پہل جذبات انسان کی تجسیم و تشخیص کی، اور معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی ہیں اور فضائل انسانی کے فطری خواص ایسے موثر اور دلکش پیرایہ میں بیان کئے ہیں جن سے اُردو لٹریچر اب تک خالی تھا، (افادات مہدی صفحہ ۳۰۹)۔

اب رہجاتا ہے اُردو کی خدمت کا سوال، اس میں بھی شمس العلما مولانا آزاد کسی سے پیچھے نہیں ہیں، بلکہ، جو خدمات آپ نے اُردو کی، کی ہیں، یقیناً کسی نے

نہیں کی، اُردو کی خدمت یہ نہیں ہے کہ اس میں تصانیف کی طویل فہرست کا مالک ہو، بلکہ اُردو کی خدمت اور سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اُردو کو عام فہم بنایا جائے، اور لوگوں کی طبیعتوں میں اس کا ذوق پیدا کیا جائے،

آزاد نے تعلیم ہی میں زندگی بسر کی، اور انکی خدمت کا نتیجہ ہے، کہ پنجاب میں اُردو اس قدر رائج ہے، پنجاب کے باشندے جنکو اُردو دانی کا دعویٰ ہے، تسلیم کرتے ہیں کہ ہم کو جگت اُستاد آزاد نے اُردو سکھائی، اور اُنھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اُردو نے پنجاب میں رواج پایا،

اس کا سبب دریافت کیا جائے گا؟ وجہ یہی ہے کہ آزاد کی تصنیف کی ہوئی کتابیں سر رشتہ تعلیم میں داخل کورس ہیں، اور لاکھوں کی تعداد میں لڑکے پڑھتے، اور ایسی چاٹ لگجاتی ہے، کہ مادری زبان پر ترجیح دیتے ہیں،

آزاد نے اُردو کے عام فہم بنانے کی جتنی کوشش کی، کسی خادم اُردو نے نہ کی ہوگی، انکی تصانیف میں یہ خداداد صفت ہے، کہ بچے بوڑھے جوان سب پسند کرتے ہیں، اور جاہل، کم لیاقت، اور پڑھے لکھے اپنے اپنے مذاق کے مطابق پاتے ہیں، کسی کو یہ شکایت کرتے ہوئے نہ پاؤ گے کہ انکی اُردو سمجھ میں نہیں آتی۔

محمد منظور۔ فاضل الہ آبادی

تصانیف مولانا محمد حسین آزاد مرحوم

آب حیات۔ مشاہیر شعرائے اردو کا تذکرہ جو پچاس سال سے دنیائے اردو سے خراج تحسین وصول کر رہا ہے قیمت سے

دربار اکبری ۔ عہد اکبری کے دلچسپ حالات، تاریخ مین فسانہ کا مزہ ملتا ہے ۔ قیمت صہ/

سخندان فارس ۔ فارسی زبان کی تاریخ۔ علم الالسنہ مین اردو کی پہلی مستند کتاب ۔ قیمت سے/

نگارستان فارس ۔ فارسی کے مشاہیر شعرا کے حالات جو آزاد کے مسوّدات سے مرتب کیے گئے ہین۔ قیمت سے/

نیرنگ خیال (۲ حصے) کنایہ و رمز کے پیرایہ مین دقیق حکیمانہ خیالات، آزاد کی الہامی نثر کا بہترین نمونہ۔ قیمت عہ/

دیوان ذوق ۔ آزاد نے اپنے استاد کا دیوان ترتیب دیا اور ایسا مقدمہ لکھا کہ ذوق کو زندہ جاوید بنا دیا۔ قیمت ۶/

نصیحت کا کرنپھول ۔ تعلیم نسوان کی تائید مین یہ دلچسپ مکالمہ لکھکر آزاد بھی خلاقی تحریک مین شریک ہو گئے قیمت ۸/

سیر ایران ۔ سیاحت ایران کے بعد حالات سفر پر مولانا آزاد نے ایک عام تقریر کی تھی۔ قیمت عہ/

مجموعہ مکتوبات آزاد ۔ آزاد کے دلچسپ خطوط جو آزاد کے طبعی حالات کا آئینہ ہین۔ قیمت عہ/

ڈرامہ اکبر ۔ اردو کا پہلا نثر ڈرامہ جسمین جہانگیر و نور جہان کی داستان معاشقہ بیان ہوئی ہے۔ قیمت عہ/

مجموعہ نظم آزاد ۔ آزاد مشہور شاعر تھے اور نظم جدید کو جد اس مجموعہ کو ان کی ایجاد کا نمونہ سمجھنا چاہیے۔ قیمت ۸/

جانورستان ۔ پرندون، درندون، اور چرندون کے پالنے اور سکھانیکے طریقے علامہ فیضی کی تحقیق آزاد کی زبان سے قیمت ۱۰/

تذکرۂ علما ہندوستان کے بعض علما کے حالات جو ابتدائے عہد مین تعلیم کے علمبردار کہے جاسکتے ہین قیمت ۵/

بیاض آزاد ۔ آزاد نے جن اشعار کو پسند و انتخاب کے بعد اپنی بیاض مین لکھا اندازہ کرنا چاہیے کہ وہ کیسے ہونگے۔ عہ/

فلسفۂ الٰہیات ۔ وہ حکیمانہ جذبات جو آزاد نے عربی فارسی اور سنسکرت سے اخذ کرکے عالم بیخودی مین قلمبند کر دیے عہ/

قند پارسی ۔ سیاحت ایران کے بعد جدید فارسی سے اہل ہند کو روشناس کرنیکے لیے یہ رسالہ لکھا گیا قیمت ۱۰/

آموزگار پارسی ۔ جدید فارسی سے اہل ہند کو واقف کرنیکے لیے یہ رسالہ ترتیب دیا گیا۔ قیمت ۱۲/

لغت آزاد ۔ جدید فارسی کی لغت ۔ قیمت عہ/

ملنے کا پتہ:۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانۂ آزاد ۴ جلد عہ
- سیر کہسار ۶
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلیٰ بطرز ناول صہ
- کامنی عہ
- بچھڑی دلہن ۶

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین ۸
- حاجی بغلول ۸
- پیاری دنیا ۸
- کایا پلٹ ۸
- میٹھی چھری ۶
- طرحدار لونڈی عہ
- طلسمی فانوس

منشی جوالا پرشاد برق

- مرزا لعلی ۱۲
- مار آستین ۱۲
- بنگالی دلہن ۱۲
- معشوقۂ فرنگ ۱۲
- پرتاب ۱۲
- روہنی ۱۰

پریم چند

- پریم بتیسی
- بازار حسن

مولینا عبدالحلیم شرر

- جنید بغدادی عہ
- خواجہ معین الدین چشتی ۶
- تذکرہ مشاہیر عالم
- مخدرات
- قیس و لبنیٰ
- مقدس نازنین
- ایام عرب
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور ۱۰
- الفانسو ۱۲
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین عہ
- نیکی کا پھل عہ
- جویائے حق
- بابک خرمی
- طاہرہ
- شوقین ملکہ
- یوسف و نجمہ
- گذشتہ لکھنؤ
- شاعرانہ و عاشقانہ مضامین
- آغاز و ختم سال
- سیر رجال
- تاریخی و جغرافی مضامین
- مینا بازار

حکیم محمد علیخان مرحوم

- رام پیاری کامل
- عبرت کامل
- حسن سرور کامل
- اختر و حسینہ
- دیول دیوی
- جعفر و عباسہ

شوق قدوائی مرحوم

- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- نیرنگ جمال ۴
- گنجینہ ۱۲
- میکفرن اور لوسی ۲

خواجہ عبدالرؤف عشرت

- زبان دانی ۶
- اصلاح زبان اردو ۶
- قواعد میر ۶
- اصول اردو ۶
- جان اردو ۶
- شاعری کی پہلی کتاب
- 〃 دوسری کتاب
- 〃 تیسری کتاب
- لغات اردو

منشی محمد احسن وحشی

- محبوس گنشت عہ
- جام زہر

مولینا حکیم عبدالحی مرحوم

- یادایام
- تذکرہ گل رعنا

حکیم احمد حسین الہ آبادی

- تاریخ ابن خلدون جلد اول
- 〃 〃 دوم
- 〃 〃 سوم
- 〃 〃 چہارم
- 〃 〃 پنجم
- 〃 〃 ششم
- 〃 〃 ہفتم
- 〃 〃 ہشتم
- 〃 〃 نہم
- 〃 〃 دہم
- 〃 〃 یازدہم
- سلطان صلاح الدین عہ
- نور الدین محمود عہ

مولوی محمد حلیم انصاری

- الاسلام والنصرانیہ ۱۲
- فتح اندلس
- ابو مسلم خراسانی
- تاریخ عرب

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی

- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف
- تذکرۃ الشعراء میر حسن

حافظ اسلم جیراجپوری

- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنو امیہ
- خلافت بنو عباس
- عباسیۂ بغداد
- علوم عرب

قاضی محمد سلیمان منصورپوری

- رحمۃ للعالمین
- سفرنامۂ حجاز

مولوی خلیل الرحمن

- اخبار الاندلس جلد
- تاریخ مولدین
- مختصر تاریخ اسلامی
- عذرا

مولوی محمد انشاء اللہ

- سیرۃ الرسول
- تاریخ آل عثمان
- حالات عراق عرب و ایران
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخ مراکش و مغرب الاقصیٰ

منشی سعید احمد مارہروی

- آثار اکبری
- حیات خسرو
- امرائے ہنود

[...]ماتما بدھ کی مختصر سوانحعمری اور ان کی مذہبی تعلیم نہایت دلکش انداز میں لکھی گئی ہے۔ قیمت صرف .. .. ۔ .. ۴ر

ملنے کا پتہ - الناظر کتابخانہ، لکھنو

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز
- وکرم اروسی

خواجہ عباد اللہ اختر
- صدیق اکبر
- حضرت زید
- مشاہیر اسلام
- بغداد
- دمشق
- دیوان حافظ مع شرح

مفتی انوار الحق ایم اے
- تاریخ ابوالبشر
- تذکرۃ الحبیب
- حقائق اسلام

میر ولی اللہ بی اے
- بندگی
- کاس الکرام
- لسان الغیب جلد اول
- " دوم
- " سوم
- " چہارم

سید انیس مسعود بی اے
- نصاب اردو
- جاپان کا تعلیمی نظم
- انتخاب زرین

مولانا حسرت موہانی
- شرح دیوان غالب
- کمل دیوان حسرت

سید سجاد حیدر بی اے
- خیالستان
- ثالث بالخیر
- زہرا
- جلال الدین خوارزم شاہ

مسٹر ظفر عمر بی اے
- حوروں کا کلب
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری
- مستقبل اسلام

پروفیسر فیروز الدین مراد
- تحفہ سائنس
- بادل کے بچے
- خونناب عشق

حکیم احمد شجاع بی اے
- باپ کا گناہ
- حسن کی قیمت

منشی عبد المجید سالک بی اے
- راہ و رسم منزل ہا
- چمپا و دیگر افسانے
- چترا ٹیگور

منشی احمد علی بی اے
- تاریخ تمدن
- شباب لکھنو

مولوی عبد الماجد بی اے
- فلسفہ جذبات
- مکالمات برکلے
- پیام امن
- تصوف اسلام
- فلسفیانہ مضامین
- زود پشیمان

منشی محمد لطیف بی اے
- اکبر
- اورنگ زیب
- رنجیت سنگھ
- لارڈ کلایو

پروفیسر نواب علی ایم اے
- معارج الدین
- تذکرۃ المصطفے
- صحف سماوی
- شمع سخن

پروفیسر الیاس برنی ایم اے
- جذبات فطرت چار حصے
- معارف ملت
- مناظر قدرت
- علم المعیشت

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن
- سیرۃ عائشہ
- حیات امام مالک
- خلافت عثمانیہ اور اسلام
- خلافت اور ہندوستان

مولوی عبد السلام ندوی
- اسوہ صحابہ ۲ جلد
- سیرۃ عمر بن عبد العزیز
- انقلاب الامم
- تاریخ الحرمین الشریفین
- شعرائے اسلام
- فطرت نسوانی
- شعر الہند ۲ جلد

مولوی عبد الباری ندوی
- مبادی علم انسانی
- برکلے کا فلسفہ

مولوی سعید انصاری
- سیر الصحابہ جلد اول
- سیر انصار ۲ جلد
- سیر الصحابیات

مولوی عبد الرزاق ندوی
- اسوہ حسنہ
- کتاب الوسیلہ
- ٹرکی اور یورپ

خواجہ حسن نظامی
- قرآن آسان قاعدہ
- میلاد نامہ
- محرم نامہ
- فاطمی عورت اسلام
- ذکر غوث پاک
- کرشن جیون
- شامی جہاد
- سیپارہ دل
- کرٹو موت
- چٹکیاں اور گدگدیاں
- اتالیق خطوط نویسی
- روزنامچہ
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت
- اولاد کی شادی
- جگ بیتی کہانیاں
- آپ بیتی
- بچوں کی کہانیاں
- سیر دہلی
- سفرنامہ ممالک اسلامیہ
- غدر دہلی کے افسانے
- یزید نامہ
- طمانچہ بر رخسار یزید
- اردو دعائیں
- تسکین احساس
- روزنامچہ ہند
- اسلام کا انجام
- تسخیر مہر و قہر

مولوی ...
- الزہرا
- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی
- نوحہ زندگی
- در شہوار
- منازل ...
- سر ...
- بنت ...
- قطرات ...
- جوہر ...
- عروس ...
- یاسمین
- تیغ ...
- ماہ عجم
- محمد ...
- مودود ...

نیاز ...
- گیتا ...
- گہوارہ ...
- نگار ...
- صحابہ ...
- تاریخ ...

یاس ...
- چراغ ...
- نقش ...

تاریخ اندور یعنی مرہٹوں کے استقلال مسلمانوں کی شجاعت اور انگریزوں کی حکمت کا آئینہ از خافی خان

ملنے کا پتہ ۔ ۱۱۰۲ ... بک ایجنسی ... لکھنؤ